علم الانسان ما لم یعلم

کتب خانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

شعبہ ۰۵۱
شمارہ ۵۷۹
عدد داخلہ ۱۶۴۵۲

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
DELHI

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ الہ آباد

سالانہ چندہ آٹھ روپیہ

هندستاني — جنوري سنه ۱۹۳۱ ع
ایڈیٹر : اصغر حسین -

مجلس مدیران

۱ — ڈاکٹر تارا چند ایم ، اے - ڈی، فل - صدر -
۲ — پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی و فارسی یونیورسٹی الہ‌آباد -
۳ — مولوي سید مسعود حسن رضوي ادیب ایم - اے صدر شعبۂ فارسي و اردو یونیورسٹي لکھنؤ -
۴ — منشی دیا نراین نگم بي - اے -
۵ — مولوی اصغر حسین - سکریٹري

فہرست مضامین

صفحہ

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ہندستانی

ہندوستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۱ } جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع { حصہ ۱

۱۴۴۵۲

اُردو اِملا

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، ایم - اے - ، پی ایچ - ڈی -

ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور اُن قاعدوں کی بنیاد صحیح اصول پر ہو - اگر قاعدے معین نہ ہوں تو زبان کی یکرنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا اور اُردو اِس وقت اِسی قسم کے خطرے میں ہے - عربی ، فارسی ، انگریزی ، غرض کہ ہر شائستہ زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں ، ہر لکھنے والا اُن کی پوری پوری پابندی کرتا ہے .. مگر اُردو والے اپنے تئیں ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں - اِملا کی خرابی یا بےضابطگی کی صورتیں جب کسی متمدن قوم کو پیش آئیں تو اُس کے زباںدانوں نے فوراً خرابی کی اصلاح کی - ترقی کرنے والی قومیں اِس زمانے میں بھی اپنی زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں - عام طور پر اصلاح کی ضرورت اِس لیے پڑتی ہے کہ ایک لکھنے والا اپنی رائے کو دخل دے کر ایک غلط راہ اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے بغیر تحقیق کیے ہوے اُسکی غلطی کی پیروی کرنے لگتے ہیں - جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی وہ کتابوں اور اخباروں میں راہ پا گئی -

عوام کے لیے یہ ایک بڑی سند ہو گئي کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسي اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے - بڑي مشکل یہ ہے کہ اُن لوگوں کي تعداد بہت کم ہوتي ہے جو صحت اور اصول پر نظر رکھتے ہوں - بڑا گروہ مقلدوں یا عادت کے بندوں کا ہوتا ہے ' اور تدارک یا اصلاح کي ذمہ داري اہل تحقیق پر عائد ہوتي ہے - پس ایسي خرابیوں کا انسداد یوں ہي ہو سکتا ہے کہ علمی انجمنیں اپنے فرض کا احساس کر کے نہ صرف قاعدے بنائیں بلکہ ہر ممکن ذریعے سے اُنہیں عمل میں لانے کي کوشش کریں -

اِس وقت صرف چند ضروري مسئلے پیش کیے جاتے ہیں :—

(۱) مختفي ہ یا الف ؟

جہاں تک تلفظ سے بحث ہے اُردو لفظوں میں مختفي ہ کا وجود نہیں ہے بلکہ مختفي ہ فارسی کي چیز ہے ' اردو ہندی لفظوں میں نہیں آسکتي ' لفظ کي ابتدا یا بیچ میں کبھي نہیں آتي ' آخر ہی میں آسکتي ہے - اُردو اور ہندی کي طرح فارسي کی بھي یہ ایک خصوصیت ہے کہ لفظ کا آخر حرف ساکن ہوتا ہے البتہ بعضے فارسی لفظ ایسے ہیں کہ پراني فارسی زبان میں اُن کے آخر میں ایک کَ تھا جو کـ سے گـ ہوا اور پھر گرگیا - اگر اُس کَ یا گَ سے پہلے الف تھا تو وہ بغیر کسی دقت کے قائم رہا ' جیسے پرانے لفظ اژدھاک سے اژدھا رہ گیا - دقت اُن لفظوں کي کتابت میں آپڑي جن کے آخر میں کـ تھا اور اُس سے پہلے زبر اِس لیے کہ اخیر حرف پر حرکت رہ گئي اور عام قاعدے کے بموجب اُس اخیر حرف کو ساکن ہونا چاہیے تھا - مثال کے طور پر صرف ایک لفظ کو لیجئے :—

''بندہ'' - پراني فارسي زبان میں ''بندک'' اور ''بَندَگ'' تھا -

بعد کو (یعنی اسلامی دور سے شاید کچھ پہلے ہی) گ کر گیا* تو "بَلَدَ" رہ گیا اور کتابت میں "بندَ" اور "بَلَد" میں کوئی فرق نہ رہا - پہلوی تحریر میں تو پرانی کتابت (یعنی "بندک") جاری رہی مگر جب عربی حرف اختیار کیے گئے تو فکر ہوئی کہ اخیر حرف کی حرکت کو جو تلفظ میں آتی ہے تحریر میں کیوں کر ظاہر کریں - تدبیر یہ ٹھہری کہ ایک ہ اخیر میں لکھیے اور اُسے زبر کی طرح پڑھیے ، ہ کی آواز اُس میں نام کو نہ ہو - اِسی لیے اُس کا نام "مختفی" پڑا اور اُس کے مقابلے میں اصلی ہ کو "ملفوظ" کہنے لگے - یاد رہے کہ یہ سب کچھ فارسی ہی میں ہوا - عربی میں اِن دونوں اصطلاحوں کا کہیں ذکر نہیں آتا -

فارسی لغت کی اکثر کتابوں میں ہر موقع پر اشارہ کردیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کے آخر میں جو ہ ہے وہ "مختفی" ہے یا "ملفوظ" - فارسی میں بھی املا کے متعلق بہت احتیاط برتی جاتی ہے اور کبھی کوئی وہ لفظ جس کے آخر میں الف ہے ہ سے نہیں لکھا جاتا - سوا اِس کے کہ قافیے کی ضرورت سے "آشکارا" کو "آشکارہ" اور "خارا" کو "خارہ" لکھ دیا - آج سے بیس پچیس برس پہلے تک اُردو والے بھی اِس کا بہت خیال رکھتے تھے -

ایک بات اور بھی اِس سلسلے میں بیان کرنے کے لائق ہے - وہ یہ کہ فارسی والوں نے جب عربی کے بہت سارے لفظ اپنی زبان میں لیے

---

* یہی گ "بندگان" اور "بندگی" میں اور اس قبیل کے بہت سے فارسی لفظوں (جیسے "زندگان" – "مردگان" – "زندگی" – "شرمندگی" وغیرہ) میں اپنی اصلی حالت پر رہا - آگے والے حرف نے اُسے گرنے سے روک لیا

اسی گ کو عربوں نے ج کردیا جو بہت سے معرب لفظوں میں دکھائی دیتا ہے جیسے برذج ، بنفسج ، بابونج ، زنج ، شاهترج ، کوسج وغیرہ میں - جو لفظ عربوں نے جاهلیت کے عہد میں ایرانیوں سے سریانیوں کے توسط سے لیے اُن کے آخر میں گ کے بجاے ک تھا ، پس اُن معرب لفظوں میں ج کی جگہہ ق پایا جاتا ہے جیسے خورنق ، خندق وغیرہ میں -

تو اُن میں سے کسی کسی میں تصرف بھی کیا - اُنھیں میں سے ایک تصرف یہاں بیان کیا جاتا ھے - عربوں کے ھاں ایک حرف ھے جو بعضے اسموں کے آخر میں آتا ھے - شکل اُس کی ہ کی ھے مگر اُسے معمولاً ت پڑھتے ھیں - اِسی لیے اُس پر دو نقطے لگا دیتے ھیں : (ۃ) - جب اِس گول ۃ والا کوئی لفظ کسی جملے کے آخر میں آ پڑتا ھے اور آواز ۃ پر ٹوٹتی ھے تو اُس کا تلفظ ملفوظ ہ کا سا ھوتا ھے اور اُس سے پہلے زبر بھی ھوتا ھے - اکثر اِس ہ کا تلفظ گہرا نہیں ھوتا ' کس واسطے کہ آواز کا زور اُس پر ختم ھوتا ھے اور اِس وجہ سے دھیما پڑ جاتا ھے - ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ چیز اُن کی مختفی ہ سے بہت ملتی جلتی ھے ' اکثر صورتوں میں اُسے مختفی ہ کی طرح بولنا شروع کردیا - اور کہیں کہیں اُس کو ت قرار دے کر اِسی طرح بولنے اور لکھنے لگے - عزۃ ' خدمۃ ' حجۃ وغیرہ ' کو عزت ' خدمت ' حجت ' بنادیا اور درجۃ ' مدرسۃ وغیرہ کو درجہ ' مدرسہ - کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچوں میں ڈھال دیا جیسے اجازہ اور اجازت ' ارادہ اور ارادت ' اِفاقہ اور افاقت وغیرہ - اِن لفظوں میں جہاں‌جہاں ۃ سے ہ ھوگئی وہ ہ مختفی ھی قرار پاگئی - یہہ عربی لفظ فارسی سے اُردو میں آئے تو یہاں بھی اِن کا تلفظ وھی رھا جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا -

اِس طرح اُردو میں مختفی ہ فارسی اور عربی لفظوں کے ساتھہ مخصوص ھے مگر اِس ہ کی اصلیت کو لوگوں نے بھلا دیا اور خود اپنی تحریر کے لیے کوئی ھنجار قائم نہ کیا - نتیجہ یہہ ھوا کہ بد مذاقی پھیلی اور ٹھیٹ اُردو لفظوں میں بھی لوگ مختفی ہ لکھنے لگے * - ھندی کے دیوناگری خط میں تو ایک आ ھے - اور اُس کا نمائندہ اُردو میں سوا

---

* اگر فارسی کے بعضے مصنفوں نے ھندی لفظوں کو مختفی ہ سے لکھا تو یہ تفریس تھی - اُردو والے کسی طرح اُس کی سند نہیں پکڑ سکتے -

الف کے اور کوئي حرف ھو ھي نہیں سکتا ـ ھندي لفظ تو ایک طرف رھے ـ طرہ یہ کہ وہ عربي فارسي لفظ بھي جن کے آخر میں الف ھے ہ سے لکھے جانے لگے ـ یہ املا سراسر غلط ھے ـ قاعدہ اِس کا یوں ھے :—

ا ـ ھندي لفظ ھو تو الف سے لکھا جاۓ (سوا بعض مقاموں کے ناموں کے جیسے آگرہ ، پٹنہ ، کلکتہ ، کس واسطے کہ یہ نام ھمیشہ سے اِسي طرح لکھے جاتے ھیں) مقاموں کے ناموں کے سوا جتنے لفظ ھیں اُن کو الف ھي سے لکھنا چاھیے ، جیسے :—

اِکا (اِسے "یکہ" لکھنا تو یوں بھي غلط ھے کہ تلفظ کے سراسر خلاف ھے ـ فارسي میں یہہ لفظ گاڑي کے معنوں میں موجود بھي نہیں ـ ھمارے اردو لفظ "ایک" سے بنا ھے نہ کہ فارسي لفظ "یک" سے ـ اِسي طرح "موم بتي کا اِکا" ـ "تاش کا اِکا" ـ زیور جسے عورتیں صرف ایک ھي بازو پر باندھتي ھیں اور اُس میں ایک ھي بڑا نگینہ ھوتا ھے ـ جس میں زیادہ نگینے ھوتے ھیں اُسے "نو نگا" کہتے ھیں) ، اکیلا ، آنولا ، باجا ، باجرا ، بادلا (ایک قسم کا نفیس کپڑا) ، باڑا ("امام باڑا" وغیرہ مرکبوں میں بھي آتا ھے) ، بتوا ، بتوارا ، بچپنا ، بچکانا ، بچھڑا ، بچھونا ، بچھیڑا ، بلبلا ، بلجارا ، بھانجا ، بھتیجا ، بھروسا ، بھیڑیا ، تانگا ، پانوڑا ، پتا (نشان کے معنوں میں) ، پَتّا ، پِتّا ، پِتا (باپ) ، پُتلا ، پتیلا ، پتاخا ، پتارا ، پٹّھا ، پچتاوا ، پڑاقا ، پسینا ، تارا (جسے فارسي میں "ستارہ" کہتے ھیں) ، تایا (چچا ، جو باپ سے عمر میں بڑا ھو) ، چارا (گھاس وغیرہ) ، چبوترا ، چرائتا ، چرچا ، چرسا ، چکارا ، چِلّا ، چھالا ، چَھلّا ، چِھلّا ، داسا ، دُپٹا ، دُبلا (دو

پلک والا۔ ایک مصنوعی نگ جسے بلور کے دو ٹکڑوں کو ملا کر بناتے ہیں)، دُخَما (یعنی دو خم والا نیچہ)، دگلا، دھکا، دھوکا، ڈوریا، ترخما (یعنی تیرھہ خم والا نیچہ)، راجا، سہونا، کتھا، کوئلا، کھلونا، لڑاکا، مہینا، میلا، ناتا (رشتہ داری)۔ یاد رهے کہ مذکر صفتیں بهی الف هی سے صحیح هیں، جیسے چلبلا، دبنگا، نچلا وغیرہ۔

اِسی طرح وہ لفظ بهی جو یورپ کی زبانوں سے آئے هیں، جیسے بِلّا (تمغا وغیرہ کے معنوں میں)، ڈراما، فرما، کمرا، مارکا (نشان) وغیرہ اور یہی حال اُن لفظوں کا هے جو فارسی یا عربی سے نکلے تو هیں مگر خود اُن زبانوں میں اُن کا وجود اِس هیئت میں نہیں هے؛ جیسے بدلا، بے فکرا، تو دیوالا، کبابیا (کباب والا)، برفیا (برف والا)، خاصا ("اچھا خاصا" پورا کے معنوں میں)، بعضا (= بعض)، مسالا، منیدا (دیـ "مالیدہ")، دسیٹا وغیرہ۔

[خاصا (جمع۔ خاصے اور مونث خاصی) اور بعضا (بعضے، بعضی) میں آخر کے الف یا ے کو ہ سے ظاهر کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ جن معنوں میں "خاصہ" فارسی میں استعمال هوتا هے، اگر اُنهیں معنوں میں استعمال هو تو البتہ اُس کو ہ سے لکھنا ٹھیک هوگا۔ مسالا هر معنے میں سَ اور الف سے لکھنا چاهیے۔ (۱) "گرم مسالا"۔ (۲) "مسالا" (گوٹا کناری وغیرہ)۔ (۳) "مسالا" (کسی چیز کے اجزا یا ضروریات اور لوازمات وغیرہ)۔ "مصالح" لکھنا یوں غلط هے کہ یہہ "مصلحت" کی جمع هے۔ همارے لفظ کو اِن معنوں سے اصلا تعلق نہیں۔ مزید بر آں

یہہ کہ تلفظ بھي مختلف ہے - یہی حال "مصالحہ" کا ہے - "مصالحہ" کے معنے ہیں "لڑنے والے فریقوں کے درمیان صلح" - ملیدا کا تلفظ بھي فارسي "مالیدہ" سے بدل گیا ہے اور اُس نے ایک خاص مفہوم اختیار کر لیا ہے پس اِسے بھی اُسي طرح لکھنا چاهیے جس طرح هم بولتے هیں - دستپنا اور فارسي "دست پناہ" میں بھي معنے اور تلفظ دونوں بدلے هوے هیں - "دست پناہ" فارسي میں "چمتے" کے معنوں میں نہیں بولا جاتا بلکہ اُس کے معنے هیں "دستانہ" -]

اُن لفظوں کے آخر میں بھي الف هي لکھنا چاهیے جو ایک اُردو اور ایک فارسي یا عربي جز سے بنے هیں: جیسے "تڑہ خما" (یعنی وہ چیز جس میں تیرہ خم هو) ؛ "تماشا" "چھماشا" "پچرنگا" "سترنگا" وغیرہ -

اِس سے یہ ایک کلیہ هاتھہ آیا کہ جب کسي اور زبان کا لفظ اُردو میں دوسرے معنے اور اُسي کے ساتھہ دوسرا تلفظ اختیار کر لے تو اُس کا املا ٹھیٹ اُردو لفظوں کي طرح هونا چاهیے -

۲ - جو لفظ خود فارسي هي میں الف سے لکھے جاتے هیں وہ هرگز ہ سے نہ لکھے جائیں - اِن لفظوں کي تفصیل یہ ہے :—

(الف) وہ جامد اسم یا صفتیں جن کے آخر میں الف ہے اور حرف اصلي کي حیثیت رکھتا ہے : جیسے اژدها، آسیا (چکي)، آشکارا، آشنا، بوریا، چلیپا، پارسا، خارا (ایک قسم کا پتھر)، دارا، درا (گھنٹا، "بانگ درا")، دلاسا، دوبالا، دوتا، سیما ("دیو سیما" یعني دیو کي سي

شکل والا)، سارا (" خالص "، جیسے " عذب سارا " میں)، شوربا (شور + با - با کے معنے ہیں پکائی ہوئی چیز - یہ لاحقہ کھانوں کے بہت سے ناموں میں آتا ہے -)، شیوا (" فصیح " کے معنوں میں جیسے " شیوا زبان " مگر ڈھنگ اور حرکات و سکنات کے معنوں میں جو لفظ ہے وہ ہ سے لکھا جاتا ہے " شیوہ ")، ناشتا، قرنا، گلدنا -

(ب) فارسی فعلوں سے بنے ہوئے اسم فاعل اور صفت مشبہ وغیرہ، جیسے بویا، بینا، نا بینا، دانا، زیبا، پذیرا، جویا، گویا، جہان آرا، جان فرسا، جان فزا، دل کشا، صبر آزما، ہوش ربا وغیرہ -

(ج) بعض لفظ جن کے آخر سے کوئی حرف گر کر الف رہ گیا ہو: جیسے پا (پاے)، خدا (خداے)، نا (ناے) وغیرہ، یا جیسے آوا (" آواز " کا مخفف)، أفتا (" افتان " کا مخفف) وغیرہ -

(د) وہ لفظ جو ہا زیادہ کر کے جمع بنے ہوں، جیسے صدہا، ہزارہا، دلہا وغیرہ -

(ہ) بعض لفظ یا نام جن کے آخر میں پیار یا حقارت یا ندا کے لیے الف بڑھا دیا گیا ہو: جیسے بازاریا (یعنی بازاری)، بشیرا، رکنا، طالبا، حافظا، سعدیا وغیرہ -

[یاد رکھنے کی بات ہے کہ " شفیعا " ایک قسم کا خط ہے جسے مُلا شفیعا نے ایجاد کیا تھا اِس لیے " خط شفیعا " مشہور ہوا - اُسے " شفیعہ " یا " شفیہ " لکھنا غلط ہے -]

۳ - ترکی لفظ جو فارسی اُردو میں مستعمل ہیں اور جن کا املا الف ہی سے ہونا چاہیے :—

آلتمغا، تمغا، طغرا - اِس لیے " تمغۂ شرافت " اور

"طغرۂ سلطانی" غلط ہوگا - صحیح "تمغاے شرافت" اور "طغراے سلطانی" ہے -

۴ - عربی کے جو لفظ خود عربی ہی میں الف سے لکھے جاتے ہیں اُن کو ہ سے لکھنا صحیح نہیں - وہ الف ہی سے لکھے جائیں - اِن لفظوں کی تفصیل یہہ ہے :—

(الف) وہ اسم جو افتعال یا استفعال کے وزن پر مصدر ہیں اور اُن کے آخر میں الف کے بعد ایک ہمزہ ہے - یہہ ہمزہ اُردو میں گر جاتا ہے اور الف رہ جاتا ہے ; جیسے :—

ابتدا ، اجتبا ، ارتضا ، ارتقا ، اصطفا ، اقتدا ، اکتفا ، التوا ، امتلا ، انتہا ، استثنا ، استدعا ، استسقا ، استعفا ، استغنا ، استفتا ، استقرا ، استقصا ، استلجا ، استیلا وغیرہ -

(ب) یہہ لفظ جن میں سے بعضے اسم جامد ہیں اور بعضے صفت - اِن کو بھی ہ سے لکھنا غلط ہے :—

حلوا ، سقّا ، شہلا ("نرگس شہلا") ، غرّا ("شاعر غرّا") ، بیضا ("ید بیضا") ، مُحابا ، مُدارا ، مُداوا وغیرہ -

(ج) بعض مذکر نام الف پر ختم ہوتے ہیں - اِن میں سے بعض کے آخر میں ایک ہمزہ بھی تھا سو وہ اُردو میں گر چکا ، اور بعضوں کے آخر میں ہمزہ تھا ہی نہیں صرف الف تھا - ہ اِن میں سے کسی میں نہ تھی :—

برخیا ، زکریا ، عادیا ، مسیحا وغیرہ -

(د) بعضے مونث ناموں کی حالت بھی یہی ہے :—

زہرا (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نام)* ، سارا ، حوا وغیرہ -

---

* "زہرہ" اِس سے مختلف ہے - ایک سیارے کا نام زُہرہ ہے - کبھی لڑکیوں کا نام اِس مناسبت سے بھی رکھا جاتا ہے -

(ہ) بعض جمعیں : جیسے بقایا ' برایا ' ثنایا ' رعایا ' عطایا
وصایا ' ہدایا وغیرہ ۔

(و) بعض متعلق فعل جن کی تنوین فارسی اور اردو میں
گرگئی ہے : جیسے اصلا ' ظاہرا ۔

(ز) اِن لفظوں کے آخر میں الف مقصورہ تھا ' جسے عربی کے
قاعدے سے یوں (ی) لکھتے ہیں ' مگر فارسی اور اُردو
میں اُس کے لیے ایک معمولی الف لکھتے ہیں ۔ ہ سے
اِن لفظوں کو لکھنا سراسر غلط ہے :—

تماشا ' تقاضا ' ماجرا ' مدعا ' معمّا ' مربا ' مقوا ' ملتا '
دعوا ' تقوا ' مصفّا ' مطلا ' معرا وغیرہ

[بعض لوگ عربی املا کی پیروی میں " دعوا " اور " تقوا "
یا " مربا " اور " ملتا " کو الف مقصورہ کے ساتھ لکھتے
ہیں جو جائز ہے ۔ مگر اُردو میں سیدھے سادھے الف کو
ترجیح ہونا چاہیے ۔

فائدہ ۔ بعضے عربی یا فارسی لفظ ایسے ہیں کہ اُنکے آخر میں ہ آتی ہے مگر جب اُن کی جمع بناتے ہیں تو اُس مختفی ہ کو الف سے بدلنا ضروری ہوجاتا ہے : یعنی اُن تمام مونث اسموں اور بعضے مذکر اسموں کی جمع میں ہ کو الف سے بدل کر جمع کی علامت لگاتے ہیں : جیسے " بیوہ " سے " بیوائیں " ' " بیواؤں " ؛ " دایہ " سے " دایائیں " ' " دایاؤں " ' " قحبہ " سے " قحبائیں " ' " قحباؤں " ' " قابلہ " ' سے " قابلائیں " " قابلاؤں " وغیرہ اور " خلیفہ " سے " خلیفاؤں " ' " علّامہ " سے " علّاماؤں " ۔*

---

* تفصیلی بحث کے لیے دیکھو رسالہ اُردو اورنگ آباد بابت ۱۹۲۳ء ، صفحہ ۲۴۱ - ۲۴۲ -

[بعض لوگ "بیووں"، "دایوں" وغیرہ بولتے اور لکھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں -]

اِن تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اُردو کا خاص حرف الف ہے اور ہر موقع پر ہمیں اُسی کو کام میں لانا چاہیے سوا چند فارسی اور عربی لفظوں کے جن کا املا ہ سے ہے (اور اُس ہ کی آواز الف کی سی ہے) - اب جن عربی یا فارسی لفظوں کے آخر میں ہ ہے اُن کو بھی ہم بعض حالتوں میں ہ کی جگہہ الف سے لکھتے ہیں - اِن میں سے ایک حالت تو اوپر بیان ہو چکی - دو تین حالتیں اور بھی ہیں :—

(۱) جب قافیے میں مختفی ہ ، الف کے مقابل ہو تو اُس مختفی ہ کو لکھنے میں الف سے بدل دینا چاہیے ؛ جیسے

تغافلہاے بے جا کا گلا کیا -

(۲) ایسے لفظوں میں جو اُردو میں کھل مل گئے ہیں اور اُن کی غیریت محسوس نہیں ہوتی ، ہ کی جگہہ الف لکھنا جائز ہے ، جیسے "مزہ" کی جگہ "مزا" -

(۳) ایسے الفاظ جن میں اُردو والوں نے کوئی تصرف کر لیا ہو ؛ جیسے "دوماھہ" سے "دُماھا" - "دُخما" (یعنی دوخم والا) وغیرہ -

(۲) مختفی ہ یا ے؟

(الف) مختفی ہ پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کی جمع میں تو لوگ باقاعدہ ، آواز کے مطابق ، لکھتے بھی ے ہی ہیں - جیسے "دو بچے کھیل رہے تھے" - مگر جب وہی لفظ واحد منحرف حالت میں ہوتے ہیں اور تلفظ اُن کا وہی ہوتا ہے جو جمع قائم کی حالت میں ہوتا ہے تب بھی

اکثر لوگ اُن کو ہ سے لکھتے ہیں - یہ کسی طرح درست نہیں - اُنہیں لکھنا بھی ویسے ہی چاہیے جیسے وہ بولے جاتے ہیں : یعنی یوں :—

'' وہ چھٹے درجے میں پڑھتا ہے '' - '' میں مدرسے جاتا ہوں '' - '' اُس بچے نے اِس معمے کو حل کرلیا '' - '' شیر کے پنجے میں بڑی طاقت ہوتی ہے '' - '' اِس واقعے سے سب کو عبرت ہوئی '' -*

(ب) پانچ کے بعد کے عدد کو لوگ عام طور پر '' چھہ '' مختفی ہ کے ساتھ لکھتے ہیں ، حالانکہ اس لفظ کا فصیح تلفظ '' چھ '' ہے - پس کوئی وجہ نہیں کہ اِسی طرح نہ لکھا جائے -

(ج) '' کیوں کر '' کی جگہ اگلے وقتوں میں '' کیونکے '' بولتے تھے اور ے کے ساتھ لکھتے تھے - ایک دوسرا لفظ ہے '' کیونکہ '' (یعنی '' کیوں کہ '' جس میں '' کہ '' کاف بیانیہ ہے) - لوگوں نے '' کہ '' اور '' کے '' کے معنوں میں فرق نہ کرکے '' کیونکے '' کو '' کیونکہ '' بنا دیا اور پرانے استادوں میر، سودا، درد، وغیرہ کے دیوانوں میں '' اصلاح '' فرما دی - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہہ اصلاح نہیں، تصحیف ہے - '' کیونکر '' کے معنے میں '' کیونکے '' اب تحریری زبان سے تو گویا خارج ہو گیا ہے لیکن بعض شہروں کے لوگ بول چال میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں - پس نہ صرف پرانے اساتذہ کے کلام میں بلکہ بول چال کی بنا پر اِس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اِس لفظ سے کہیں نہ کہیں

---

* دیکھو ایضاً صفحہ ۲۰۳ - ۲۰۴ -

دُچار ہوں گے - اِس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر
"کر" کا قائم مقام ہو تو "کے" اور نہیں تو "کہ" لکھا
جاوے؛ جیسے
نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بد عہدی—(غالب)

(۳) نونِ غُنّہ -

بعضے لفظ، جن میں نون غنہ ہے، کئی طرح سے لکھے جاتے ہیں -
اُن میں سے صرف اُسی طرز کو اختیار کرنا چاہیے جو تلفظ میں سب سے
زیادہ قریب ہو - "کُنْوا" - "کُنواں"، "کُواں" تین طرح سے لکھتے
ہیں - اِن تینوں میں بہتر "کُنْوا" ہے (اور "کُنوے"، "کنووں")
اِسی طرح "دھنْوا" (اور "دھنوے" - "دھنووں") - "گانْو" (جمع :
"گانْوؤں") - "چھانْو" - "آنو" - "دانو" (جمع : "دانؤوں")، "پانو"
(جمع : "پانْوؤں") -
اِس طرح پر "کنواں" - "دھنواں" - "کواں" -
"دھواں"، "پاوں"، "گاوں"، "داوں"، "چھاوں" وغیرہ صورتیں
ترک ہو جائیں گی -*
البتہ : "دھلواں"، "گتھواں"، "چڑھواں" اور ترتیبی گنتیاں
جیسے "پانچواں" - "ساتواں" - "آتھواں" - "نواں" - "دسواں"
وغیرہ اور "پانچویں" - "پانچویں" (مونث) وغیرہ درست ہیں -
گنتی کے لفظوں میں (۱۱ سے ۱۸ تک) اخیر کا حرف ہ ہے - بعضے
لوگ اُن کے آخر میں اں لکھہ دیتے ہیں - اس لیے کہ بعض خطوں میں

---

* بعض لوگوں کو اس پر اصرار ہے کہ "کنواں" وغیرہ لکھنا چاہیے - اِس لیے کہ اِس
لفظ کے پہلے اور دوسرے دونوں بول غنہ رکھتے ہیں - لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے -
غنہ پہلے هي بول میں ہے اور دوسرا پہلے سے گونہ متاثر ہوگیا ہے -

کھاراں'' ، ''باراں'' وغیرہ بولتے ھیں - اور جو لوگ ''کھارا'' ''بارا''
لتے ھیں وہ کبھی کبھی اُسی طرح لکھہ بھی جاتے ھیں مگر یہ درست
ہیں؛ کس واسطے کہ اِن لفظوں میں ؔ ہ اصلی اور ملفوظ ھے - پس اِن
لتھوں کو ہ کے ساتھہ لکھنا چاھیے - یعنی ''گیارہ'' - ''بارہ'' - اب جس
جی چاھے وہ ''کیارا'' یا ''گیاراں'' بول لے - یہ وھی بات ھے کہ
'ھوا'' کو بعض جگہ ''وا'' بولتے ھیں مگر اِس طرح لکھہ نہیں
سکتے -

بعض لوگ ''دونوں'' کو ''دونو'' بغیر ''ں'' کے لکھتے ھیں - یہ
غلط ھے - صحیح ھے ''دونوں'' جیسے ''تینوں'' - ''چاروں'' -
'پانچوں'' - ''چھھوں'' - ''ساتوں'' وغیرہ -

جمع منادا کے ساتھہ کبھی کبھی لوگ ایک ''ں'' بھی لکھہ دیتے
ھیں یعنی ''اے لڑکوں!'' - یہہ درست نہیں؛ بغیر نون کے لکھنا
چاھیے؛ جیسے ''اے لڑکو!'' - ''صاحبو!'' -

جھوٹ کہتا نہیں، میں، سچ جانو،
کافر عشق ھوں، مسلمانو! — (قلق لکھنوی)

(۴) ھمزہ (ء) -

(الف) اِس بات کو نہ بھولنا چاھیے کہ ھمزہ ' الف کا قائم مقام ھے -
پس جب دو حرف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو
اُن کے بیچ میں ھمزہ آسکتا ھے ' نہیں تو نہیں - اِس لیے
''آءو'' ، ''جاءو'' ، ''گیت گاءو'' - ''دو لڑکے آءے'' ، -
''آپ آءے''؛ ''میں آءوں، تو کیا لاءوں؟''؛ ''میں چاھتا
ھوں کہ آرام سے سوءوں'' وغیرہ میں ھمزہ لکھا جاءے؛ مگر
''بناو سنگار'' ، ''بھاو تاو'' ، ''نبھاو'' ، ''گھاو'' ''کڑھاو''

میں ہمزہ کا کچھہ کام نہیں - اِسی طرح ''گاے''، ''چاے''، ''راے''، ''ھاے'' میں بھي ہمزہ نہ چاھیے اور یہي حال 'دیو'' اور ''سیو'' اور ''ریو و ریا'' وغیرہ کا ھے - اِن لفظوں میں الف ے الف و یا ے و مل کر ایک آواز دیتے ھیں اِس لیے اُن کے بیچ میں ہمزہ کی گنجائش نہیں -

(ب) ''لیے'' (دونوں معنوں میں) ''اُس نے دو سو روپئے دیے اور دو گھوڑے ''لیے'' - ''اُس نے اپنے لیے چار جوڑ موزے لیے اور اپنے بھائی کے لیے ایک ھي جوڑ'' - ''سیکڑوں دیے جل رھے ھیں - دیوالی کی بہار ھے'' -

اوپر کے جملوں میں دیے اور لیے کي بہت سی مثالیں آگئیں - ہمزہ کہیں نہیں آنا چاھیے - ''چاھیے''، ''دیجیے''، ''لیجیے'' وغیرہ میں بھي ہمزہ نہیں بلکہ یے ھے - اِسی طرح ''تھالیوں''، ''ڈالیوں'' وغیرہ میں - ہمزہ اُسي وقت آئے گا جب اُس سے پہلے زبر ھو - اگر اُس سے پہلے زیر ھوگا تو یے آئے گی یعنی ''گئے'' میں ہمزہ ھے مگر ''کیے'' میں یے -

(ج) جہاں ہمزہ لکھنا ضروری ھے وھاں لوگ اکثر کاھلی کے مارے اُسے چھوڑ جاتے ھیں : جیسے

''بچھڑوں'' کو ''بچھروں'' بلکہ کبھي ''بچھوں''- ''لکھنئو'' کو ''لکھنو'' - ''ھندوؤں'' کو ''ھندووں'' یا ''ھندوں'' - یہ درست نہیں -

(٥) ں ب اور ن ب -

جب کسي لفظ میں نون غنہ کے بعد ھي ب ھو تو یہ دونوں حرف

مل کر م کي آواز دیتے هیں : جیسے آنب سے آم (جس کي تصغیر "انبیا" کا تلفظ "امبیا" بلکه "امیا" هوتا هے) ' نیب سے نیم ' سیلنب سے سیم - ان لفظوں کو م هي سے لکھنا چاهئے - فارسي عربي لفظوں زنبور - تنبورہ - شنبہ - گنبد - جنب میں جو ساکن ن هے وہ تلفظ میں م هو جاتا هے مگر لکھا ن هي جاتا هے - البته جب "گنبذ" سے اُردو والوں نے "گُمز" بنایا اور اُس کي تصغیر "گُمزی"* - ان دونوں لفظوں کو م هي سے لکھنا پڑا - پس قاعدہ یهه نکلا که فارسي عربي کا لفظ هو تو املا میں اُنهیں زبانوں کي پیروي کي جاوے نهیں تو م لکھا جاوے -

(٦) ذ یا ز ؟

فارسي اور اُردو لفظوں میں ذ اور ز کے لکھنے کے متعلق هم ملک میں بڑا اختلاف هے - سب سے پہلے مولوي نذیر احمد دهلوي ایک خط میں، جو انهوں نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا،* یه خیال کیا که ذ عربي کے مخصوص حرفوں میں هے - اس لیے فارسي لفظوں ز سے لکھنا چاهیے نه که ذ سے - ادیبوں اور شاعروں کے گروہ میں یه مسئله مدتوں زیر بحث رها اور اب بھي کبھي یه بحث چھڑ جاتي هے۔†

---

* یه خط "موعظهٔ حسنه" میں درج هے -

† سنه ١٩٠٥ع اور سنه ١٩٠٦ع میں رساله "ذخیرۃ الملک" دهلي میں مسلسل بحث هوتي رهي - سنه ١٩٠٧ع میں رسالهٔ "عالم گیر" هردوئي کے ایک ... غالباً یه سلسله ختم هوا اور گونه بے لطفي کے ساتھه - پھر "ذخیرۃ الملک" کے تمام ... کو جو اس بحث سے متعلق تھے جناب وصل بلگرامی نے کہ وهي اس بحث کے ... ذمه دار تھے - رساله "مرقع" لکھنئو بابت اپریل و مئي سنه ١٩٢٨ع میں اغلاط ... دوبارہ شائع کیا - باوجود ایسي تفصیلي بحث کے فارسي میں ذ کے هونے یا نه هونے ... تشنه هي رها -

واقعہ یہہ ھے کہ ذ عربي کے ساتھہ مخصوص نہیں ھے اور حقیقت میں ث بھي مخصوص نہیں - یوناني اور قدیم ایراني زبانوں میں اِن دونوں حرفوں کي آوازوں کا وجود تھا - چنانچہ عربي زبان میں جو لفظ یوناني یا فارسي سے لئے گئے ھیں اُن میں یہ دونوں حرف ملتے ھیں۔* یہہ سمجھنا صحیح نہیں کہ "اُستاد" کي د پر عربوں نے تصرف کر کے ایک نقطہ لگا دیا - اصلیت یوں ھے کہ اُنھوں نے ایرانیوں سے "اُستاذ" ھي سنا اور اُسي طرح بولنے اور لکھنے لگے - خود ایرانیوں کي زبان میں بعد کو ذ ' د ھوگئي - اِس لیے کہ اِسلامي زمانے میں بلکہ شاید اُس سے کچھہ پہلے ھي ث اور ذ کي آوازیں زبان سے جاتي رھیں - ھر ذ ' د ھو گئي مگر اِنے گِنے لفظوں میں ذ کا تلفظ ز سے بدل گیا - لیکن اُن لفظوں کو لوگ پراني عادت کے مطابق ذ ھي سے لکھتے رھے جیسے "آذر" - "گذشتن" - "پذیرفتن" - "نذرو" - "کاغذ" - ایک "گنبذ" ایسا لفظ ھے جو دونوں طرح سے بولا اور لکھا جاتا ھے یعني "گنبذ" اور "گنبد" - ھندوستان میں لوگوں نے اِس لفظ کي اِسي دوسري صورت سے "گمز" بنا لیا اور اُس کي تصغیر "گمزي" ھوئي - ایران کے بعض مقامات میں "تذرو" کي جگہ "تدرو"† اور "کاغذ" کي جگہ "کاغد" بھي سنا جاتا ھے - خلاصہ یہ ھے کہ اِن فارسي لفظوں میں اگر آواز کا لحاظ کیجیے تو ز ھے اور قدیم زبان اور کتابت کو مانیے تو ذ -

اُردو میں "گزر" اور "گزار" اور اُس کے مشتقات کو زیادہ تر ز ھي سے لکھتے ھیں اور یہہ کچھہ بے جا نہیں مگر ذ بھي اِن لفظوں میں صحیح اور جائز ھے "آذر" اور "کاغذ" کو ھمیشہ اور "پذیرا" وغیرہ کو اکثر ذ سے لکھتے ھیں اِن کو یوں ھي رھنے دینا چاھیے - اِن

* کسي آئندہ موقع پر تفصیل کے ساتھہ اِس مسئلے پر بحث کي جائےگي -
† "تدو" بغیر ر کے -

فارسی لفظوں کے علاوہ جن لفظوں میں ذ آتي ھے وہ عربي سے آئے ھیں - اب چاھے وہ تھیٹ عربی ھوں یا کسي اور زبان سے عربی میں مستعار - ایسے لفظوں میں عربي اِملا کي پیروي لازم ھے گو کہ آواز کے لحاظ سے اُردو میں ایک اکیلي ز ھي ذ ، ض اور ظ کي قائم مقام ھے -

چند عربی اور فارسی لفظوں کا غلط اِملا رواج پا گیا ھے ؛ البتہ محتاط لوگ اُس سے پرھیز کرتے ھیں - اُن لفظوں میں سے یہہ مثالیں زیادہ اھم ھیں :—

(۱) "بحر زخّار" کو بعض کم سواد لوگ "بحر ذخار" لکھتے ھیں - غالباً اِس دھوکے میں کہ "زخّار"، "ذخیرہ" سے بنا ھوگا - اصلیت یوں ھے کہ "زخار" کو "ذخیرہ" سے اصلا تعلق نہیں بلکہ "زخار" کے معنے ھیں "بہت اُمنڈتا ھوا (سمندر)" یا چڑھا ھوا (دریا) " -

(۲) "ذکي" اور "زکی" اپنی اپنی جگہ پر دونوں صحیح ھیں - مگر لوگ "زکی" کے محل پر بھی "ذکي" لکھا کرتے ھیں - یعني "زکی الدین" یا "محمد زکی" کسی کا نام ھو تو اُس کو ز ھي سے لکھنا چاھیے - اس لیے کہ "زکی" کے معنے ھیں "پاک" اور "ذکی" کے معنے "تیز فہم" بھی ھیں اور "قابل ملامت" بھي -

(۳) "زکریا" کو بعض لوگ غلطی سے ذ سے لکھتے ھیں بلکہ بعضے تو یہ ستم کرتے ھیں کہ "ملازم" میں بھی ذ لکھہ دیتے ھیں -

(۴) "آزوقہ" - عربي لفظ نہیں ھے فارسي ھے اور اُس کا املا ز سے صحیح ھے - غلطي سے لوگ ذ سے لکھہ دیتے ھیں اور یہہ غلطی فارسي کتابوں میں بھي دیکھنے میں آئی ھے -

(۵) "آزر" (حضرت ابراهیم کے چچا کا نام) ز سے ہے اِسے فارسي لفظ "آذر" سے کوئي تعلق نہیں ۔

(٦) " ذات " ۔ عربی لفظ ہے ' جس کے معنے ھیں " نفس " یا " نفس نفیس " یا " شخص " ۔ " نژاد " یا " قوم " وغیرہ کے معنے نہیں ھیں ۔ اِن معنوں میں جو لفظ اُردو میں بولا جاتا ہے وہ حقیقت میں سنسکرت کے لفظ " جات " سے نکلا ہے ۔ ھندي میں تَ کا کسرہ اِس وجہ سے گر گیا کہ کسی لفظ کا آخر حرف متحرک نہیں ھو سکتا ۔ اُردو والوں نے ج کو زَ کی آواز سے بدل دیا ۔ چاھیے تھا کہ اِس لفظ کو زَ سے لکھتے ۔ لیکن عربی لفظ " ذات " کے دھوکے میں اِس کو بھی ذَ ھی سے لکھنے لگے ۔ اِس غلط طریقے کو یقیناً ترک کرنا چاھیے اور جہاں " نژاد " " قوم " وغیرہ کے معنے ھوں وھاں زَ ھی سے لکھنا چاھیے جیسے " زات پات " ۔ " زات جماعت " " زات رات " ۔ " وہ زات کا برھمن ہے " ۔ " اُس کی زات کھري ہے " ۔

(۷) عربي کا ایک لفظ " ذرہ " ہے (جس کي رَ پر تشدید ہے) ۔ اس کے معنے ھیں "کسي چیز کا بہت چھوٹا ٹکڑا" ۔ اُردو میں یہہ لفظ بولا جاتا ہے اور اِنھیں معنوں میں بولا جاتا ہے ۔ مگر اِس کے علاوہ ایک اور لفظ بھی ہے جو صرف صفت یا متعلق فعل کے طور پر استعمال ھوتا ہے اور جس کے معنے ھیں " تھوڑا " ۔ اِس کی رَ پر تشدید نہیں اور تیسرا حرف ا ہے ہ نہیں ؟ مگر بعض لوگوں کو اصرار ہے کہ چوں کہ اِس لفظ کے پیدا ھونے کا باعث

عربی لفظ "ذرہ" ہوا ہے اِس لیے اِسے بھی ذ ہی سے لکھنا چاہیے - یہ نہیں دیکھتے کہ تلفظ میں ایک چھوڑ دو دو تصرف ہوے - معنوں میں فرق ہو گیا - یوں کہنا چاہئے کہ اُردو نے یہ ایک بالکل نیا لفظ پیدا کیا - پھر کوئی وجہ نہیں کہ ز سے نہ لکھا جاے - ادیبوں اور شاعروں کے رایوں میں اختلاف ہے - کچھہ لوگ کہتے ہیں ذ سے لکھو، کچھہ لوگوں کا قول ہے کہ اِس کا املا ز ہی سے صحیح ہے اور ذ سے غلط - اصولاً ز کو ترجیح ہے - اِس لیے کہ اب عربی لفظ "ذرہ" سے اِسے نہ تلفظ کی رو سے کچھہ واسطہ رہا اور نہ معنے کی جہت سے - بلکہ "زرا" ٹھیٹ اُردو لفظ ہو گیا -

(۷) ص یا س ؟

فارسی والوں نے اپنی زبان کے بعض لفظوں کو عربی حرفوں سے لکھنا شروع کر دیا - اس لیے کہ ہم آواز لفظوں کا ایک دوسرے سے امتیاز ہو سکے -

"صد" ، سو کے معنے میں ، حقیقت میں س سے ہے ؟ مگر اِس کا رواج ایسا متواتر ہے کہ اب غلطی کی اصلاح کچھہ ناممکن سی ہو گئی ہے -

"شصت" (ساٹھہ) دونوں طرح سے لکھا جاتا ہے - اِس لیے اگر اُردو میں کبھی اِس فارسی لفظ کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو شست لکھنا بہتر ہوگا -

"مسالا" کی بحث اوپر آچکی ہے (دیکھو الف اور مختفی ہ کا بیان)-

(۸) ط یا ت ؟

فارسی اور ترکی کے بعض لفظ کسی نہ کسی وجہ سے ت کے بجاے کبھی ط سے بھی لکھے جاتے ہیں - جیسے "طپش" - "طپیدن" -

"طشت" ـ "طوطی" ـ محتاط لوگ ت هی سے لکھتے هیں اور هم کو بهی املا اختیار کرنا چاهیے یعنی "تپش"۔" تشت" ـ "تشتری" ـ "توتا" ـ "توپ" ـ "تماچا" ـ "تیار" کو "طیار" بهی لکھتے هیں ـ هم کو "تیار" اختیار کرنا چاهیے ' سوا اِس کے که یهه لفظ "اُڑنے والا" کے معنوں میں استعمال هوا هو ـ

(۹) کچهه اور لفظ ـ

بہت سے لفظ ایسے هیں که وہ صحیح لکھے جاتے هیں لیکن اُن کا غلط املا بهی ایک حد تک رائج هو گیا هے ـ اُن میں سے چند خاص توجه کے قابل هیں :—

صحیح املا	معنی	غلط املا
اژدحام	هجوم ـ بهیڑ	اژدهام ـ اژدهام ـ اژدحام
اسراف	فضول خرچی	اصراف
تباشیر	بنس‌لوچن	طباشیر
تریاق	زهر کا مارگ	طریاق
تلاطم	سمندر یا دریا کا تهپیڑے مارنا	طلاطم
توتیا	..	طوطیا
دوات	روشنائی کا برتن	داوات
عوض	بدلا	عیوض
مرهم	زخم کی دوا	مرحم ـ ملهم
مُسرف	فضول خرچ آدمی	مصرف
مع	ساتهه ـ سمیت	معه

قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تعلقات

از پروفیسر محمد حبیب (آکسن)

ہمارے زمانۂ وسطیٰ کی بادشاہی ایک خالص دنیاوی سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی - شاہی اقتدار کی بنیاد میں اسلامی قانون نہیں، بلکہ ایرانی روایات کار فرما تھیں - شاہان و سلاطین دہلی اصولاً نہایت احتیاط سے اپنے فرائض مذہبی اور اپنے ذاتی عقیدے میں تفریق و امتیاز رکھتے تھے - جہاں تک کہ قانون عامہ کا تعلق ہے، اُنہوں نے شریعت کا نفاذ بہ جبر روا نہیں رکھا - وہ صرف امیرالمؤمنین نہ تھے بلکہ مثل بادشاہوں کے اپنی تمام رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ رکھتے تھے - یہ چیز ہے جو غائر توجہ کی مستحق ہے اور جو ایک طرف زمانۂ وسطیٰ کے عجیب و غریب قومی احساس، اور سیاسیات کے مکمل دنیاوی ہو جانے کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری طرف سلطنت دہلی (اور صرف سلطنت دہلی) کی تمام رعایا میں حقیقی رواداری کی وسعت پذیری کو نمایاں کرتی ہے -

سلاطین دہلی اور ہندوؤں کے مابین، ان کے ممالک محروسہ میں رشتۂ اتحاد، عقیدہ و مذہب نہ تھا - بلکہ صرف بادشاہ و رعایا کا تعلق تھا جسے طرفین اپنے اپنے مقام پر اچھی طرح سمجھتے تھے - بادشاہ کو اپنی ہندو رعایا کی روحانی نجات سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ اس کی کوئی اخلاقی ذمہ‌داری محسوس کرتا تھا، یہ سوال اس کے فیصلے کے لئے نہ تھا - جب تک وہ (ہندو رعایا) اس کی واجبی فرماں برداری کا حق ادا کرتی رہتی، وہ بالکل مطمئن ہوتا تھا -

ہندو، ہر چند کہ بادشاہ کے سیاسی معاملات میں اعانت کے لئے تیار رہتے تھے لیکن اپنے معتقدات میں کسی قسم کی مداخلت روا نہ رکھتے تھے ترکی حملوں کا سیلاب، جب اپنا فاتحانہ دور ختم کر چکا تو حکومت کی امتیازی پالیسی تمام رعایائے مملکت کے لئے "رواداری" تسلیم کر لی گئی ۔ سلطنت دہلی کے تمام طول و عرض میں ہندوؤں کی عبادتگاہیں دوامی امن کی حالت میں چھوڑ دی گئیں ۔ اقدام مظالم کے وہ تین یا چار حوالے، جن کی طرف ہمارے مؤرخین اشارہ کرتے ہیں، بجائے "رسم عام" کے ثبوت کے، اس کے عدم ثبوت پر شاہد ہیں کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کو گھوڑوں پر سوار ہونے اور تیر و شمشیر چلانے کی اجازت نہ تھی اور جلوس نکالنے، بھان اور پوجا پاٹ کرنے کی عام ممانعت تھی مگر یہ داستانیں، اصل ماخذوں* کے غلط مطالعہ کے باعث تیار ہوئی ہیں ۔

* مثلاً ضیاءالدین برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے " علاؤالدین خلجی کے طرز عمل سے "ہندو" کی حالت اتنی پست ہو گئی تھی کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکتا تھا نہ زیادہ لباس پہن سکتا تھا اور نہ ایرانی کمان سے تیر چلا سکتا تھا" برنی کے بیان کے غائر نظر سے پڑھنے والے کو اطمینان ہو جائیگا کہ اس کا مطلب تمام ہندوؤں سے نہیں بلکہ ایک خاص طبقے کے ہندوؤں سے ہے جن کے خلاف علاؤالدین نے یہ طرز عمل اختیار کرنا چاہا تھا اور جن کو برنی "مقدم"، "کھوت" اور "بلاہر" بتاتا ہے - مقدم کے معنی پہلے آدمی کے ہیں، کھوت غالباً فارسی لفظ "خط" کی خرابی ہے - خط یا دستاویز کا مطلب اس آدمی سے ہے جس نے محکمۂ محاصل میں یہ اقرار نامہ داخل کیا ہو کہ وہ اس مقام یا موضع کے محاصل اراضی کا ذمہ دار ہوگا - لفظ "بلاہر" کا ٹھیک مفہوم معلوم کرنا مشکل ہے لیکن اس میں مطلق شک کی گنجائش نہیں کہ برنی "ہندو" سے گاؤں کا مکھیا مراد لیتا ہے - علاؤالدین نے گاؤں کے مکھیاؤں کے خلاف دو باتیں کیں اول یہ کہ اس نے حقوق کھوتی (یعنی لگان کی اس دستوری کو جو انہیں تحصیل لگان کے صلہ میں ملا کرتی تھی) موقوف کر دیا اور تحصیل لگان کا انتظام محکمۂ محاصل یا دیوان کے نمایندوں (نوابوں) کے ذریعہ کر دیا - دوسری یہ کہ اس نے ہدایت کی کہ تمام اراضی کا لگان، اس کی حیثیت کے اعتبار سے لیا جائے اور یہ کہ طاقتور کا بار کمزور پر ہرگز نہ ڈالا جائے -

بہ ظاہر اس منصفانہ قانون نے مکھیاؤں کو سخت صدمہ پہونچا دیا لگان وصول کرنے والے کی حیثیت سے، وہ اس وقت تک اراضی کا، جس کی وہ خود کاشت کرتے تھے، کوئی

ملک نائک نامی ایک ہندو جنرل ' علاؤالدین کی فوج کے مہمہ پر کمان کرتا تھا اور چتور کا رانا پانچ ہزار آدمیوں کے ساتھ اس کے ہراول کی رہنمائی کرتا تھا یہہ اور اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں تو کیا ایک ایسی جماعت کے لوگ ' جنہیں گھوڑوں پر سوار ہونے اور سلحہ لگانے کی ممانعت رہی ہو ' یہ حیثیت حاصل کر سکتے تھے ؟

میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس قسم کی رائے زنی پسند نہیں کرتا کہ تمام مملکت میں جو رواداری ہندو مذہب کے لیے منظور کی گئی تھی وہ بادشاہ کی آزاد مرضی کا نتیجہ یا یہ کہ اس کی مسلمان رعایا کا متعصب طبقہ بھی اسے پسند کرتا تھا وہ تو زیادہ تر مجبوریوں اور سخت سیاسی ضرورتوں کا تقاضا تھا - اُس زمانہ کا ہندو مذہب ' مسلح و منّظم تھا اس کے ساتھ رواداری اس لیے برتنی جاتی تھی کہ رواداری کرنی ہی چاہیے تھی اور اس کے سوا کوئی اور دوسری راہ نہ تھی -

---

معاوضہ نہیں دیتے تھے بلکہ اس کے عوض وہ اپنے ہمسایوں کو اصل مطالبے سے زائد ادا کرنے کے لئے مجبور کیا کرتے تھے -

اگر ہم تاریخ فرشتہ پر اعتماد کریں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین نے مویشی رکھنے کی زیادہ سے زیادہ تعداد معین کر دی تھی - ایک گاؤں والا ' چار بیل - (گائے یا بھینس) اور بیس بکریاں (یا بھیڑیں) رکھہ سکتا تھا تاکہ چراگاہیں ' گاؤں کے قابو یافتہ اور سر برآوردہ لوگوں کے بیجا استعمال سے محفوظ رہ سکیں - علاؤالدین شکایت کیا کرتا تھا کہ اس کی تخت نشینی کے وقت یہ مکھیے باہم جنگ کیا کرتے تھے اور محکمہ محاصل کے نمایندے جب ان کے یہاں جاتے تو وہ ان کو قید کر لیتے اور طرح طرح سے ستایا کرتے تھے آج اس قانون نے ' جو علاؤالدین کے سپاہیوں کے نیزوں سے تمام ہندوستان میں بہ جبر رائج کرایا گیا ' مکھیاؤں کو محتاجی کی حد تک پہونچا دیا - وہ اپنے گاؤں پر مالکانہ حقوق کے مدعی ہو چلے تھے لیکن علاؤالدین نے انہیں کاشتکار کی حیثیت میں لا کر پست کر دیا - برنی یہہ نہیں کہتا کہ ان کو یہہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں یا ریشمی لباس نہ پہنیں بلکہ اس کے بیان کے موافق ' وہ اس درجہ غریب و محتاج ہو گئے تھے کہ آئندہ سے ان حظوظ کی انہیں مقدرت ہی نہیں رہ گئی تھی - بد قسمتی سے اس فقرے نے بڑی غلط فہمی پیدا کردی لیکن اُس پڑھنے والے کو کوئی دشواری نہیں پیدا ہوسکتی ' جو حسب بیان برنی علاؤالدین خلجی کی دیگر اصلاحات کے ساتھہ اِس کا بھی مطالعہ کرتا ہو -

گو مکھیاؤں میں اکثریت ہنود ہی کی تھی لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان میں بہت مسلمان بھی تھے - علاؤالدین کا منشاے عمل ان سب کے خلاف تھا -

(فارسی متن صفحات ۲۹۶ - ۲۸۲)

سنه ۱۲۹۱ ع میں سلطان جلال الدین خلجی نے رنتھنبور کا محاصرہ کرنا چاہا لیکن اُسے نا قابل تسخیر پاکر اُس نے فوج کو پسپائی کا حکم دے دیا - جس وقت شاہی بزم مشاورت میں اس پر بحث شروع ہوئی تو اس کے بھتیجے ملک احمد حبیب نے اس حکم کی سختی سے مخالفت کی اس نے اعتراضاً کہا "اگر شہنشاہ رنتھنبور کو بغیر فتح کیے واپس ہوئے تو لوگوں (کے دلوں) سے آپ کا احترام کم ہو جائے گا - حضور والا سلطان محمود اور سلطان سنجر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کیوں نہیں فرماتے ؟ وہ جو دین اسلام کے ستون تھے اور جنہوں نے دنیا فتح کرکے رکھدی - آپ ان کی مہمات وفتوحات (کی مثالوں) سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے" سلطان نے ہنس کر جواب دیا "صاحبزادے ! محمود اور سنجر کے اسلحہ بردار اور پیادے تک مجھ سے ہزار درجہ بہتر اور معزز تھے میں ' کہ عارضی بادشاہت کے ایک فریب نریں مغالطے کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا ' اِن کاموں کی انجام دہی کا خواب تک کیوں کر دیکھہ سکتا ہوں جنھیں اُن بڑے بڑے فرماں رواؤں اور فاتحوں نے تکمیل کو پہونچا دیا ؟ میں کیا اور میری بادشاہی کی شان و طاقت کیا ' جو میں اُن کاموں کے لیے کوشش کروں جنھیں محمود اور سنجر نے کر دکھایا ہے ؟ بیوقوف ! تو دیکھتا نہیں کہ ہندو روزانہ میرے محل کے سامنے سے سنکھہ بجاتے اور ڈھول پیٹتے ہوئے جمنا کے کنارے اپنے بتوں کو پوجنے کے لیے گزرتے ہیں' وہ میری آنکھوں کے سامنے اپنی کفر کی رسمیں مناتے ہیں' میری اور میرے شاہی اقتدار کی تحقیر کرتے ہیں - میں اگر ایک حقیقی مسلم بادشاہ ہوتا تو کیا میں اُن کو پان کھانے دیتا اس طرح صاف کپڑے پہننے دیتا ' اور ان کو بے جگری کے ساتھہ مسلمانوں کے درمیان ' شیخی مارنے دیتا ؟ شرم ہے میرے لیے اور میری بادشاہی کے لیے ! میرا نام ہر جمعہ کے خطبے میں پڑھا جاتا ہے ' جھوٹے خطیب

مجھے حامئي دين کہہ کر پکارتے هيں - ليکن ميرے دين کے دشمن هيں که ميري دارالخلافه ميں اور ميري آنکھوں کے سامنے ' عيش و عشرت اور شان و شوکت سے زندگي بسر کر رهے هيں اور اپني دولت و خوش حالي کے باعث ' مسلمانوں سے گستاخانه طور پر اظہار تفاخر کرتے هيں - وه کھلے بندوں ڈهول بجا کر اپنے بتوں کو پوجتے هيں اور اپني کافرانه رسوم کو انجام ديتے هيں - شرم هے ميرے ليے ! ميں اُن کو اُن کے عيش و عشرت اور فخر و غرور ميں چھوڑے هوئے هوں اور اُن چند ٹنکوں پر قناعت کيے هوے هوں جو وه خيرات کے طور پر مجھے دے ديتے هيں -"*

يه تهي ايک مجبور و ناتواں تعصب کي آخري گريه و زاري ؟ جلال الدين ' جس کا عام احساس اس کي دينيات سے بلند تر واقع هوا تها - دهلي واپس آيا ليکن هندوؤں کے خلاف اُس نے کوئي کارروائي نہيں کي - محمود غزنوي کا زمانه رخصت هو چکا تها اور اب وه دوباره واپس نہيں آسکتا تها - سلاطين و شاهان دهلي ' به طيب خاطر يا به جبر و اکراه ' اُنہيں شرائط پر تخت نشين هوا کرتے تهے جو هندوؤں کے ليے قابل قبول هوتے -

وه غير رواداري' جس کي جلال الدين خلجي هدايت کرتا تها مگر عملاً جس پر کاربند نه هوتا تها ' يقيناً اسلام کا کوئي جزو نہيں هے - وه مسلمان' جو غير رواداري کو اپنا فرض سمجھتے تهے انہوں نے قطعاً اپنے کو مجبور پايا - متعصبوں کے ليے ايذا دهي ايک طرح کي خيالي چيز هو گئي جسے عملي لوگوں نے تصورات کے کرکري خانے ميں ڈال ديا -

ايک غير ملکي اور مطلق العنان شخص مثلاً سلطان محمود (جس کي حمايت ميں ايک منظم قوم کي طاقت هو) تو غرور پر امن شهروں

---

* ضياءالدين برني کي تاريخ فيروز شاهي - فارسي متن صفحه ۲۱۲ -

کو لوٹ کر اور مال غنیمت لاد کر لے جا سکتا تھا - لیکن سلاطین دھلی کے لئے جو اپنی ھندو رعایا کے لگان ان کی فوج اور مادي طاقتوں کے آسرے پر تھے اس طرح کا طرز عمل نا ممکن تھا - ان کے نئے فرقہ دارانہ معرکوں کا مفہوم ایک ناگزیر تباھی ھوتا - وسط ھند میں ابتدا دھلی کے مفروضہ واقعات انگلیوں پر گنے جاسکتے ھیں لیکن جب ان کی جانچ زیادہ قریب سے کی جاتی ھے تو وہ جماعتی مظالم نہیں بلکہ افراد کی بے انصافیوں کے واقعات ثابت ہوتے ھیں اور کم از کم اس عہد کے لوگ بھی ایسا نہیں سمجھتے تھے - یہہ عجیب بات ھے کہ قرون وسطی کے سیاسی یا مذھبی لٹریچر میں ؟ مسلمانوں کے خلاف ھندو قوم کے مقابلہ کے خفیف ترین آثار بھی نہیں پائے جاتے ؟ لیکن اس کی یہہ وجہ نہیں ہے کہ ھندو اس کے لیے تیار نہ تھے یا مقابلہ کے قابل نہ تھے - نہیں! وہ تو اپنی جنگ جوئی اور شوق جدال کے لئے بدنام تھے لیکن ھندوستان کے زمانۂ وسطی کی متعدد لڑائیوں میں سے کسی ایک لڑائی میں بھی ہم فوجوں کی تقسیم مذھبی (اعتبار سے) نہیں پاتے - افغاني سپاهیوں کا ایک دستہ ، - جنگ ترائن میں راے پتھورا کي سرکردگي میں لڑا تھا - مسلمانوں کي ایک پیادہ سپاہ نے پاني پت کي لڑائي میں مرھٹوں کي مدد کي تھي - مگر اصلي ھندو مسلم جنگ در اصل کبھي نہیں ھوئي -

اگر ھم ھندوستان کے زمانۂ وسطی کي تاریخ ، صحیح طور پر سمجھہ لیں تو ھم اِس غیر حقیقي اور نامعقول تصویر کو ایک ھي مرتبہ اور ہمیشہ کے لئے خارج کردیںگے کہ "غیر ملکي فاتحین کي ایک جماعت ' ایک پُر امن و بے ضرر آبادي پر حکومت اور بہ جبر حکومت کر رھي ھے " اس قسم کي راے کي تائید کے لئے اصل ماخذوں میں شہادت کا ایک ریزہ اور ایک لفظ بھي موجود نہیں ھے -

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بادشاھوں نے ' ھندو راجاؤں سے جنگ

کي لیکن اُس سے زائد مرتبہ وہ دوسرے مسلمان بادشاھوں سے بھي لڑے -
اسي طرح ایک جنگ میں ایک راجپوت کے لیے جس سے سلطان دھلي سے
جنگ ھوئی تھي ' تقریباً ایک سو راجپوت ' راجستان کے فرقہ وار جاگیروں
میں قتل کئے گئے تھے - ھندو مذھب بہر صورت پوري طرح مسلح تھا اور
ھندوستان کے زمانۂ وسطیٰ کي حکومت ' در مستعد اور جنگجو جماعتوں
میں' ایک رفیق کار کي حیثیت رکھتی تھي - شہنشاہ ایک مسلمان تھا اور
اس لیے کہ ھندو مذھب ذات در ذات منقسم تھا' مسلمانوں کي حیثیت
قوي‌ترین اور متحدہ اقلیت کي سي ھوگئي تھی - اور چھتریوں بلکہ
برھمنوں سے تعداد میں بڑھی ھوئي تھي - اگر ھندو مذھب میں' مساوات
اور جماعتي جمہوریت کي روح موجود ھوتي' جو زمانۂ وسطیٰ میں' اسلام
کي بہترین خصوصیت تھي' تو یقیناً معاملات اس سے مختلف ھوتے !

لیکن ان سلاطین کي رواداري' نہایت سختي سے ان کي مملکت کے
اندر محدود تھي - ایک مرتبہ وہ یا ان کي سپاہ ' اگر شاھي سرحد سے باھر
نکل جاتي تو ان تمام رواداریوں بلکہ اعلیٰ احساسات و انسانیت تک کو
بالائے طاق رکھہ دیا جاتا ' متعصبانہ جوش ' جو باھر تو انقلابي تشدّد کے
ساتھہ بھڑک اُٹھتا تھا ' ملک کے اندر بہ جبر قابو میں رکھا جاتا تھا -
سلطان محمود کي جابرانہ سختي' اگر ملک کافور کي اُس تعدي سے ' جو
دکن میں ھوئی ' بڑھہ چڑھہ کر نہیں تو برابر ضرور تھی - کھلے ھوئے
واقعات سے انکار کرنا بےفائدہ ھے - قرون وسطیٰ کا ایک مسلمان مورخ بھي
ایسا نہیں ھے جس نے مندروں ' بتوں اور بے مثل صنعتي یادگاروں کي
اُس تباھی کے ذکر کرنے میں کمي کی ھو ' جو دھلی کی فتح‌یاب سپاہ
کے پیچھے پیچھے ھوتی جاتی تھی - وہ خود ان افسوس‌ناک کامیابیوں
پر فخر کرتے تھے اور (اسي لیے) ان کے چھپانے' میں انھوں نے کوئي کوشش
نہیں کی - یہ بالکل صحیح ھے کہ مندروں اور عبادت‌گاھوں کی تخریب

مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہے اور ایک مذہب کی حیثیت سے ' اسلام کا اندازہ اُن ارباب سیاست کے کارناموں سے نہ کرنا چاهیے جنهوں نے قرون وسطیٰ کے اوائل میں اُسے اس غلط طور پر پیش کیا (لیکن اسی کے ساتھہ) یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے نہ زمانہ کے ساتھہ ساتھہ' رسوم بھی مختلف ہوتے رہتے ہیں - اُس زمانہ کے مسلّمہ روایات کے بموجب دشمن کی عبادت‌گاہ کی غارت گری جنگ کے جائز اعمال میں سمجھی جاتی رہی -

جب منگولیا کے خانہ بدوشوں نے ' مسلمانوں کی سر زمین وسط ایشیا ' ایران اور افغانستان پر حملہ کیا تو اپنی فتوحات کا ملی طریق کار ' مساجد اور کتب‌خانوں کی تخریب و غارت‌گری سمجھا - شہاب‌الدین غوری کی فتح هندوستان ' یا ملک کافور کا حملۂ دکن ' اِن هنگاموں سے نسبۃً غنیمت معلوم هوگا جو سلجوقیوں ' غزنویوں اور تاتاریوں نے ایران کے شہروں اور موضعوں میں برپا کیے - جنگ بچوں کا کھیل نہیں ہے - نبی فہیم ملکۂ سبا نے کہا تھا - "*بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی تخریب کرتے ہیں اور وهاں کے عزیزترین شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں ' یہی خیال و جذبہ تھا جس نے ایک هی بادشاہ کی دو رعایا میں ' باوجود اختلاف مذهب ' رواداری کی اجازت دی - اور اسی نے غیر ملکیوں کے جبر و سختی کو ' هم‌مذهب هونے کی صورت میں بھی روا رکھا - اهل هند نے ' با وجود اپنی غیر معمولی نمک حلالی کے ' اکثر اخلاقی زندگی کے دیگر اُصولوں میں ' اپنے کو غیر مخلص ثابت کیا - تُرک اور خلجی شہنشاهوں کی سپاہ ' هندوؤں اور مسلمانوں ' دونوں پر مشتمل تھی جنوبی ' هند میں مندروں کے انہدام میں هندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا - اُس زمانہ کی لوٹ مار کی اصل غرض ' سونے

* قرآن مجید سورۂ نمل رکوع ۱۸ -

چاندي کي حرص و هوس تھی - بت شکنی کا ادعاے پُرفریب تو محض باهر کي "واہ وا" کے لیے تھا - مملکت سے باهر هندوؤں کے خلاف مُہم تو شہنشاهوں کے لئے ایک خالص کار و باري قسمت آزمائي تھی اور اُس زمانہ کے اقتصادي حالت نے اُسے تجربہ‌کار مہتمموں کي مجلس کے هاتھوں میں دے دیا تھا جو جمع اموال کی سب سے بڑھہ کر نفع بخش صورت تھي - تجارتي منافع ایک مدت سے هندستان کو پہونچتا چلا آ رها تھا - قیمتي دھاتیں ملک میں آهستہ آهستہ جمع هوتی جارهی تھیں اور بے شمار عقیدتمندوں کے خلوص کي بدولت بڑے بڑے مندروں میں جگہ پاني جا رهي تھیں - هندستان ایسے زراعتی ملک میں گانوں والوں کو لوٹنے میں سوا سخت ٹکروں کے اور کیا حاصل هو سکتا تھا - چنانچہ ان سخت تجربات کے لیے نہ هندوؤں نے کوشش کي اور نہ مسلمانوں نے - قرون وسطی کي تقریباً تمام مہمات میں معمولي شہری اور دیہاتی بالکل امن کي حالت میں چھوڑ دئے گئے - اصل مطلب مندروں اور اُس کی روایتی دولت سے تھا اور اُس کي بھي اصل غرض مذهبي تعصب نہیں بلکہ مالي هوس تھي - اگر هندوؤں کے مندر بھي مسلمانوں کي مسجدوں کي طرح سادہ اور معمولی هوتے تو نہ محمود غزنوي هندوستان پر حملہ کرتا اور نہ علاء الدین خلجی اپني فاتح سپاہ کو دکن روانہ کرتا !

قرون وسطی کے لوگ مسلح اور سرکش تھے وہ ایک ایسي مرکزي بادشاهت کي اعانت کیوں کرتے ؟ بلکہ کیوں اس کو گوارا کرتے جب وہ بادشاهت' نہ تو ان کے استحقاق جاریہ کے اعتبار سے مناسب تھی اور نہ قانون مذهبي کي کتابوں کے رو سے ؟ بہرحال لوگوں نے سلطنت کے لیے کام کیا اور لڑے مرے — وہ یقیناً اُس کے لیے کوئی نہ کوئي امید اور اعتقاد ضرور رکھتے هونگے اور اُس نظام کو گوارا کرنے کے لیے بھی کوئي نہ کوئي اخلاقي احساس و شعور بھي رکھتے هونگے جس کے لیے وہ اتنی بڑی قربانیاں کرنے کو تیار تھے -

جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُس نے یہاں متعدد ایسے رئیس پائے جو مغرور تھے اور باہم غیر متحد ۔ اور ہندستانیوں کی تشفی کے لیے اُن کے امتحانات ازمائش میں صرف ایک کڑی ہوئی سلطنت کی یاد باقی رہ گئی تھی - سلاطین دھلی ؛ ملک کو متحد کرنے میں کیوں کامیاب ہوئے جب اُن کے ہندو پیشروؤں کے لیے یہ کام سخت دشوار ثابت ہوا تھا ؟ تقدیر کا فیصلہ ؛ انسانی ہی ہاتھوں کے توسط سے اپنے کو نمایاں کرتا ہے - دانستہ یا نا دانستہ طور پر ؛ لوگوں کے دلوں میں ؛ شاہان دھلی کو اپنے مخالفین پر ترجیح دینے کے کچھ وجوہ ضرور موجود ہونگے - علامانہ جماعت کا ہونا تو ایک طرف ۔ ہندوستانی بڑے شوریدہ پشت اور سرکش تھے اور بہت سے منچلے تو تیار تھے کہ اس طرح کے اول موقع پر اپنے کو کام میں بھی لائیں - اس زمانہ میں سمجھدار لوگ ۔ ظلم سے نہیں بلکہ بد نظمی سے زیادہ خائف تھے - اول اول یہ امر ؛ ابتدائی طور پر ذھن نشین کر لینا چاھیے کہ سلطنت کا وجود ؛ دراصل خلجیوں کے انقلاب کے ساتھ شروع ہوا ؛ غلام بادشاھوں کی حکومت محض ایک دھوکا اور سوانگ تھی ؛ یا ایک بلند عمارت تھی بے بنیاد ؛ جو اکثر غزنین کے پہاڑوں سے شروع ہوتی اور دھلی کے باب بدایونی پر ختم ہو جاتی تھی - ھندستان کو متحد کرنے کا کام ؛ تند خو اور آتش مزاج علاؤالدین خلجی نے کیا جس کے بعد سے قومی اتحاد کا تخیّل ؛ لوگوں کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوا - بلوے ہوئے بغاوتیں اور خانہ‌جنگیاں ہوئیں - ہم نے لڑائیاں بھی کیں اور مارا بھی لیکن حالت امن یا زمانہ جنگ ؛ کسی حالت میں بھی ہم نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ ہم ایک ہی گھر کے رہنے والے ہیں اور ہم کو ایک حکومت رکھنی چاھیے عام اس سے کہ اس کی حیثیت کیسی ہی ہو -

فطرت یہ چاھتی تھی کہ ھمالیہ کے جنوبی حصہ کی زمین ؛ ایک

قسم کے لوگوں کا ملک ہو اور فطرت کا یہ مقصد، مذہب و صنعت کے ذریعہ سے تکمیل کو پہونچ گیا - شمال مغربی کوہستانی دروں کو عبور کرکے، ہندستان کے زرخیز میدانوں میں اول اول جس مسلمان نے قدم رکھا تھا اُس سے بھی صدیوں پیشتر، ہمارے ذہنی اور نسبی اتحاد کی بنیاد رکھی جاچکی تھی - یہ بڑا کام، بڑے ہی ذہنوں کے کرنے کا تھا - مندروں اور جاتروں کے ضوابط میں، ویدوں کے رسموں اور برتوں میں، رامائن اور مہابھارت کے قصوں میں، بودھ مذہب کے رواداراًنہ فلسفے میں ؟ اور منو کے قانون میں ہم وہ قومی ادرات پاتے ہیں جنھوں نے آریہ ورت کے سر زمین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نا قابل تقسیم بنا دیا - اگر یہ عظیم‌الشان کام، اس سے پہلے انجام نہ پاجاتا تو اکبر اور علاؤالدین کا انتظامی بندوبست، اخلاقی مضبوطی سے محروم رہ جاتا اور اُن کی سلطنتیں بھی، سکندر کی سلطنت کی طرح، چندروزہ ثابت ہوتیں -

ہندی مسلم صوفیہ نے، شاید نا دانستہ، اپنے عظیم المرتبت ہندو پیشینیوں کے نقش قدم کی پیروی کی - ہندستان کے مسلمانوں کے ساتھ یہ سخت نا انصافی ہوگی کہ اُن کا اندازہ اُن کے اُن بادشاہوں کے چال چلن سے تو کیا جاے جس کے وہ کسی طرح ذمہ دار نہ تھے - لیکن اُن کے مذہبی پیشواؤں، اُن کے صناعوں؟ اور اُن کے شاعروں سے بے توجہی کی جائے جو اُن پر ان سے کہیں زیادہ اثر رکھتے تھے - اُس وقت کے جمہور مسلمان (اور آج کل کے بھی) متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے - شائقین تحقیق کو صوفیہ کے ملفوظات کا ایک سرسری مطالعہ اس امر کا یقین دلا سکتا ہے کہ مثل حکمرانان ہند، اُن کی روزانہ زندگی، کسی بلند منشاء کو پیش نظر رکھنے کی بجاے ایک افسردہ کن افلاس کی حالت میں گذرتی تھی - اُن کے سروں پر ہمیشہ چھت بھی میسر نہ آتی تھی اور شکم سیر ہوکر کھانا تو ایک نادرالوقوع واقعہ سمجھا جاتا تھا - یہ محدود کامیابی، جو

اسلام نے هندوستان میں حاصل کی وہ اپنے بادشاهوں اور ارباب سیاست کے هاتھوں نہیں بلکہ اپنے فقرا و مشائخ کی بدولت کی ایک نئے مذهب کے لیے اس کی تمام باتوں کا انحصار اس کے طریقۂ تبلیغ پر ہے - اسلام اگر اس ملک میں، سوا غزنی کے فتحمند خانہ بدوشوں کے کوئی اور طرز نہیں اختیار کرسکتا تھا تو یہاں کے قابل لوگ بھی اس کو قبول نہیں کر سکتے تھے، لیکن اسلام، اپنے نمایندے اُن سے کہیں بہتر اور شریف تر رکھتا تھا یعنی وہ، جو شاهی درباروں اور فوجی قیام گاهوں کی فضا سے بہت دور، مسکین لوگوں کی طرح خاکسارانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس نبی (صلعم) کی سنت کے مصداق تھے "جس کا فقر اس کے لیے باعث فخر تھا*" -

هندو مذهب نے اپنے وسیع المشرب نقطۂ خیال سے ان مسلمان صوفیہ کو اپنے رشیوں میں داخل کر لیا اور جذبات همسایگی نے بہت جلد بڑھ کر ایک مشترکہ سلسلہ بزرگوں کا تیار کر دیا - یہی تیرهویں صدی عیسوی میں تھا اور آج بھی یہی باقی ہے!

غرض اس طرح، ترکوں کے لا حاصل تعصب کی جگہ، ایک تازہ تر مگر بلندتر فلسفے نے حاصل کرلی چنانچہ ایک صبح کو شیخ نظام الدین اولیا، نے جو زمانۂ وسطی کے زبردست صوفیہ میں تھے، اپنی خانقاہ کی چھت پر چڑھے تو کچھ هندوؤں کو دیکھا کہ وہ اپنے بتوں کو پوج رہے هیں - ایک مسلمان کے لیے یہ بات عجیب تھی کہ وہ ایک آزاد مخلوق کو اس حالت میں دیکھے کہ وہ اُس بُت کی پرستش کر رہی هو جسے اُس نے اپنے هی هاتھوں سے پتھر سے تراش کر بنایا هو - لیکن شیخ مذکور کے فلسفے نے کافری کو بھی اپنے روادارانہ آغوش میں لے لیا - آپ نے فرمایا : "هر

---

* ارشاد نبوی ہے "الفقر فخری" -

قوم کي (الگ الگ) ایک جائز راہ ' ایک مذہب اور ایک پرستش گاہ ہے - *

یہی تھي ہمارے مذہبي سمجھوتے کي حقیقي بنیاد قرون وسطی میں ! اور یہ سمجھوتا بھي ایسا تھا جسے ہندستان کے بڑے بڑے اصحاب فکر' بڑے بڑے اہل علم' اور بڑے بڑے ارباب سیاست نے تسلیم کر لیا تھا - ہماري تمام نا رضامندي کي تہ میں' اختلاف کرنے کي رضامندي کارفرما تھي - ہم میں سے ہر ایک کے لیے اپنا عقیدہ' سب سے اچھا اور سب سے بہتر تھا - ہندو کو ایک اچھے ہندو' اور مسلمان کو ایک اچھے مسلمان ہونے کي' آزادانہ طور پر' اجازت تھي - گویا اسلام اس ملک میں بالکل ایک دوسرا نظام تخیل تھا جو بہت سے مخالف نظریوں کو گوارا کیے ہوئے تھا - ایک ایسي ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹي)' جو شاخ در شاخ فرقوں میں منقسم ہو' مسلمان کي حیثیت' صرف ایک '' مزید فرقہ '' کي سي ہو گئي تھي - یہ نیا مذہب' ہندستاني قومیت کي وسیع پیچیدگیوں پر محتوي اور مشتمل تھا - اس لیے سیاست میں' اپنے ملکي لوگوں کی قیادت' ایک مسلمان کے لیے آسان ہو گئي - یہ (نیا) مذہب' پرانے مذہب کے منافذ میں بھي جلد جلد داخل ہونے لگا - مسلمانوں کی عام جماعت نے (جو ہندو مذہب چھوڑکر داخل اسلام ہوئي تھي) گو مسجد کے لیے اپنا مندر ترک کر دیا لیکن اپنے روایتی رسوم کے تبدیل کرنے کا اسے خیال بھي نہیں آیا —

---

* ہر قوم راست راہے - دینے و قبلہ گاہے- جس پر امیر خسرو نے جو اس وقت موجود تھے یہ مصرع اضافہ کیا ع

من قبلہ راست کردم بر سمت کجکلاہے -

اس مصرع میں اس واقعہ کي طرف اشارہ تھا کہ اس وقت شیخ کي کلاہ ' پیشاني کي طرف ترچھي ہو گئي تھي - یہ واقعہ توزک جہانگیري میں منقول ہے -

هندستانی مسلمانوں میں اریہ ورت کے قدیم رسموں کا رواج' آج بھی ایک بدنام‌کن اور نا قابل انکار واقع ھے - هندستان کے کسي ایک طبقے کو بقیہ لوگوں پر حکومت کرنے کي کوئي خاص وجہ نہ تھي چنانچہ مسلمانوں نے ' بڑھ کر تھیک وهی حیثیت اختیار کرلي جو اُن سے پہلے راجپوتوں کو حاصل تھي - اگر ایک مسلمان شہنشاہ اپني انتظامی و سیاسی قابلیت کی بنا پر اپنے کو کار آمد اور ناگزیر ثابت کر سکتا تھا تو (اہل ملک کو) اس کے اختیار و اعتبار کے تسلیم کر لینے میں کوئي سخت اعتراض نہ هوتا تھا -

لیکن ما بعد کے دو اسباب نے ایک مرکزي حکومت کے قیام و استحکام کو اور زیادہ نا گزیر اور گوارا بنا دیا : (۱) ایک تو منگولیا والوں کا خروج (۲) دوسرے هندوستان کي دیہاتي جماعتوں کي بد نظمي -

خلجیوں کے خروج سے تقریباً ساتھ برس پہلے' منگولیا والے' هندوستان کي سرحد پر خطرے کي طرح منڈلا رهے تھے - انھوں نے ترکستان ' ماوراءالنھر* ' ایران اور افغانستان کے تمام زرخیز شہروں کو غارت کر دیا تھا اور پنجاب میں لاهور تک بڑھ آئے تھے - (اس وقت) هندو اور مسلم دونوں یکساں طور پر خطرے میں تھے کیوں‌کہ منگولیا والے مسلمانوں کے جانی دشمن تھے - انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب کے تمام مرکزی مقامات کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا - اسي طرح وہ هندوؤں کے بھي دوست نہ تھے ' اُن کي زبان ناقابل فہم ' اور ان کے اطوار و عادات سخت ناگوار تھے - وہ جہاں گئے وهاں کي عورتوں کو' عام اس سے کہ وہ ادنیٰ طبقے کی هوں یا اعلیٰ طبقے کی ' اُنھوں نے کنیزیں بنا لیا اور ان کی حالت' موت سے بھي زیادہ سخت اور سقیم بنا ڈالی -

---

* آکسس (دریاے آموں) اور جیکسرٹیز کے درمیان کي زمین - اور جیکسرٹیز کے آگے کي زمین ترکستان ھے -

وہ بچوں کو بے دردی سے قتل کر ڈالتے' قتل عام اور خونریزی سے انہیں مسرت ہوتی (اس طرح) دو نسلوں تک ایک تاریک اور مہیب بادل' آسمان پر گھرا ہوا تھا اس وقت وہ آدمی ' یا آدمیوں کا وہ گروہ ' جس نے منگولیا والوں کو آسکے ہی میں روک دیا' یقیناً : ناقابل انکار طور پر ہندوستان بھر کے لوگوں کے شکریے کا مستحق ہوا ہوگا دوسرے یہ کہ دیہاتی جماعتوں کا جمہوری نظام ' شہاب الدین کے حملے سے صدیوں پہلے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا - قانون اور رواج کی جگہ جبر و قوت نے لے لی تھی - ایسی ہمہ گیر بد نظمی کے زمانے میں مکھیاؤں اور متقدم لوگوں نے یہ دیکھ کر' کہ کوئی زبر دست طاقت ان کی سر برآہی کرنے والی ہے ' گاؤوں پر خود مختارانہ قوت قائم کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی - اور غریب کاشتکار رعایا کو بے رحمی کے ساتھ ستانا شروع کر دیا تھا - (ایسی حالت میں) صرف ایک مضبوط مرکزی حکومت کا قیام ہی کاشتکاروں کو مکھیاؤں کے چنگل سے رہائی دلا سکتا تھا -

بس یہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھے جنھوں نے منگولیا والوں کو مار بھگایا - اور ملک کے نظام متحاصل کو از سر نو درست کیا چنانچہ جہاں بے قاعدگی کی یہ کثرت تھی وہاں اس امن کے تسلط کی وجہ' کچھ تو اتفاقی تھی اور کچھ دونوں جماعتوں کے حالات کا اقتضا تھا - علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی سے پہلے کسی وقت بھی ہندوؤں کا ایک زبردست حملہ' سلطنت دہلی کو خاک میں ملا سکتا تھا - لیکن (علاؤالدین کے عہد میں) مسلم ارباب سیاست نے' یقیناً اپنے رقیبوں سے بڑھ کر' دور اندیشی اور ہوشیاری دکھلائی - ان کے گزشتہ تلخ تجربات نے انہیں منگولیا کے خانہ بدوشوں کے خلاف ایک سخت اور کامیاب مقابلے کا اہل بنا دیا اور چونکہ رسم روایات کے پھندوں سے وہ نسبتاً آزاد تھے اس لئے اُن انتظامی اور مالی اصلاحات کے تجویز اور نافذ کرنے کے قابل ثابت ہوئے جس کی ملک کو ضرورت تھی -

هندوؤں کي سرداري کی باگ، راجپوتوں کے قبضه میں آ گئی تهي جو اس درجه غیر متحد اور باهمي خانه جنگیوں کے شایق تهے که نه وہ اندروني انتظامات کے لیے لوگوں کو متفق کر سکتے تهے اور نه بیروني مدافعت کے لیے، اور نه پهر راجستان کا ریگزار هي اس قابل تها که هندوستان کي سلطنت وهاں تعمیر یا پامال کي جا سکتي!

---

* أُردو زبان کے لغت

(از سید مسعود حسن صاحب رضوی ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی)

یوں تو ملک کے مختلف حصوں میں طرح طرح کی بولیاں بولی جاتی ھیں مگر اُن میں زبان کا درجہ صرف اُنھیں کو حاصل ھے جن کے صرف و نحو کے قاعدے بن چکے ھیں، لغت مرتب ھو چکے ھیں، فصاحت اور بلاغت کے معیار قائم ھو چکے ھیں، اور جن میں کتابوں کا کافی ذخیرہ بھی موجود ھے - اُردو بھی ایک زمانے میں صرف ایک بولی ھی تھی- لیکن ترقی کرتے کرتے اب زبان کا درجہ حاصل کر چکی ھے - اور کم سے کم اِس حیثیت سے ھندستان کی سب زبانوں پر فوقیت رکھتی ھے کہ اُس کے بولنے اور سمجھنے والوں کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع ھے -

اُردو کی اِس ترقی کے ذریعے بھی وھی ھیں جو اُوپر بیان کیے گئے - اِس لیے اُردو زبان کی تاریخ میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے کے قابل ھے کہ اُس کی تنظیم اور تہذیب کب سے شروع ھوئی - اور اب تک اس سلسلے میں کیا کیا کوششیں ھوتی رھیں - اِس غرض کے لیے ضرورت ھے کہ لغت - قواعد اور بلاغت کی کتابیں اور ان کی ترتیب اور فہرستیں سامنے موجود ھوں -

اِسی طرح اُردو ادب کی تاریخ کے لئے مختلف علموں اور فنوں کی کتابوں اور اُن کی باترتیب فہرستوں کا موجود ھونا نہایت ضروری ھے یہہ کتابوں کے ذخیرے اور فہرستیں جسقدر مکمل ھونگی اُتنی ھی زبان اور ادب کی تاریخ بھی مکمل ھوگی -

---

* یہ مضمون اکیڈمی کی گذشتہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا -

عام طور پر لوگوں کو علم نہیں ہے کہ اُردو میں علم و فن پر کتنی کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں - اور اکثر لوگ تو اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُردو کا کتابی سرمایہ بہت ہی حقیر ہے - اگر مختلف مضمونوں کی تمام کتابوں کی فہرستیں مرتب ہو جائیں تو یہ غلط فہمی دور ہو جائیگی - اور اُردو کا اعتبار اور وقار بہت بڑھ جائیگا -

اِنہیں خیالوں کو سامنے رکھ کر میں نے کئی سال ہوئے اِس کام کی ابتدا کر دی تھی اور اُردو لغتوں کی فہرست بنانا شروع کر دیا تھا - افسوس ہے کہ مجھے اس فہرست کو مکمل کرنے کی فرصت نہ مل سکی - بہر حال اب رسالہ "ہندستانی" کے اڈیٹر صاحب اور اڈیٹوریل بورڈ کے سخت اصرار سے مجبور ہوکر یہ فہرست اِسی غیر مکمل حالت میں پیش کی جاتی ہے - دُھن کے پکے لوگ ایسی فہرستوں کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھ لیں اور ایک مضمون کی فہرست مرتب کرنا اپنا فرض قرار دے لیں تو اُردو کی ایک بہت بڑی خدمت انجام پا جائے -

مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب مرحوم نے اردو کی کل کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی کوشش کی تھی اُن کی اِس کوشش کا نتیجہ "الفہرست" کی صورت میں دنیا کے سامنے آچکا ہے - اول تو یہ ایک آدمی کے کرنے کا کام ہی نہ تھا - دوسرے اِس کتاب کی تالیف اور ترتیب میں جو سہولت پسندی اور بے احتیاطی برتی گئی ہے اُس کا کسی قدر اندازہ اِس فہرست کو اُس کتاب کی فہرست لغات سے مقابلہ کرنے پر ہو جائیگا - بہر حال "الفہرست" جس غرض سے مرتب کی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور اُردو کتابوں کی فہرست کی جتنی ضرورت پہلے تھی اُتنی ہی اب بھی باقی ہے -

اِس فہرست میں ایسی کئی چیزوں کا ذکر ہے جن تک بہت کم نگاہوں کی رسائی ہوئی ہوگی اور بعض تو ایسی ہیں جن کا دیکھنا کیسا

اب تک اُن کا نام بھی نہ سنا گیا تھا اِن نادر چیزوں میں سے اکثر میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں ـ

یہہ اُردو لغتوں کی فہرست ہے لیکن میں نے اِس کو صرف اُنہیں کتابوں میں محدود نہیں کیا ہے جن میں اُردو لفظوں اور محاوروں وغیرہ کے معنی اُردو ہی میں بتائے گئے ہیں ـ بلکہ اُن تمام کتابوں کو شامل کر لیا ہے جن میں اُردو زبان کے لفظوں اور محاوروں کے معنی کسی زبان٭ میں یا کسی زبان کے لفظوں اور محاوروں کے معنی اُردو زبان میں دئے گئے ہیں ـ دوسری قسم کی کتابیں بہت کم ہیں اور اُن کا اِس فہرست میں شامل کیا جانا کچھہ بہت مناسب بھی نہیں معلوم ہوتا ـ مگر چونکہ میرا مقصد یہہ ہے کہ ہر فن کی اُردو کتابوں کی فہرست مکمل تیار کی جائے اور اِن کتابوں کی جگہ کسی اور فہرست میں نہیں نکلتی اس لئے اسی فہرست میں داخل کر لی گئیں کیونکہ اگرچہ وہ اُردو زبان کے لغت نہیں ہیں لیکن لغت ہیں اور اُردو زبان میں ہیں ـ

میری خواہش تو یہہ تھی کہ ہر لغت کے مؤلف کا نام ـ تالیف کا زمانہ٭ کتاب کا حجم اور اُس کی خصوصیتوں کا ذکر کروں ـ اِس لئے جتنی کتابوں تک میری پہونچ ہو سکی اُنہیں غور کی نظر سے دیکھا اور اپنے کام کی جتنی باتیں مل سکیں لے لیں ـ لیکن جو کتابیں میرے دسترس سے باہر تھیں اُنکے بارے میں جو کچھہ بھی کسی ذریعے سے معلوم ہوسکا اُسی پر قناعت کرنا پڑی ـ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جنھیں میں نے خود دیکھا ہے لیکن اُن کے مؤلف اور تالیف کے زمانے کا پتا کسی طرح نہ لگ سکا ـ بہر حال جہاں کہیں میں کُل ضروری اطلاعیں بہم نہیں پہونچا سکا وہاں ہمیشہ مجبوری کا عالم تھا ـ میری کاہلی یا بے احتیاطی کو اِس میں دخل نہیں ـ

کتابوں کي ترتیب ان کي تالیف کے زمانے کے لحاظ سے قائم کي گئی هے - لیکن جن کتابوں کي تالیف کا زمانہ معلوم نہیں هو سکا اُنہیں آخر میں بلا ترتیب درج کر دیا هے -

جن چند لغتوں کا حال مولوي عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقي اُردو "اورنگ‌آباد" کے اُس مضمون سے لیا هے جس کا عنوان هے - "اهل یورپ نے اُردو زبان کي کیا خدمت کي" اُن کا بیان ختم کرکے قوسین میں ع - ح لکھہ دیا هے -

(۱) خالق باري

حضرت امیر خسرو کو جس طرح اور بہت سي چیزوں میں اولیت کا شرف حاصل هے ؛ اُسي طرح اُردو کا سب سے پہلا لغت لکھنے کا فخر بھي اُنھیں کے لئے هے - اب تک اُردو کا کوئي ایسا لغت دستیاب نہیں ہوا جو خالق باري سے زیادہ قدیم ٹھہرتا - مولانا آزاد مرحوم "آب حیات" میں لکھتے هیں -

"خالق باري جس کا اختصار آج‌تک بچوں کا وظیفہ هے کئي بڑي بڑي جلدوں میں تھي" -

افسوس هے کہ خالق باري کا کوئي بہت قدیم نسخہ نہ ملا جو اِس قول کي تصدیق کر سکتا - مجھے جو پرانے سے پرانا نسخہ ملا هے اُس کي تاریخ تحریر ۱۳ شعبان ۱۲۱۷ ھ هے یعني اُس کي عمر سوا سو برس سے کچھہ زائد هے - مگر کتاب کي تصنیف کو کوئي ساڑھے چھہ سو برس هو چکے هیں اِس لئے یہ نسخہ بھي قدیم نہیں کہا جا سکتا -

عام طور پر مشہور هے کہ خالق باري امیر خسرو کي تصنیف هے مگر جو لوگ تحقیق کي دھن میں کسي بات کو بغیر کافي ثبوت کے نہیں

مانتے - اور کسي بات کي شہرت کو اُس کي صحت کي دليل نہيں جانتے اُنہيں اِس ميں بھي شک ھے ليکن خالق باري کے اُردو لفظوں اور فقروں کي قدامت امير خسرو کا هندي اور فارسي دونوں پر عبور رکھنا امير خسرو کي ايجاد خيز طبيعت اور کتاب کي آخري بيت ميں امير خسرو کے تخلص کا نہايت حسن سے آنا يہ سب باتيں عام راے کي تائيد کرتي هيں -اور امير خسرو هي کو خالق باري کا مصنف ثابت کرتي هيں -

خالق باري ايک منظوم لغت ھے جس ميں فارسي عربي اور هندي کے هم معني الفاظ جو روز مرہ کي بات چيت کے ليے ضروري تھے جمع کر ديے گئے هيں - اِس طرح کا منظوم لغت امير خسرو کي ايجاد نہيں ھے - سنسکرت ميں ايسے لغت خالق باري سے بہت پہلے تصنيف هوچکے تھے - فارسي ميں بھي کم سے کم ايک ايسي هي کتاب اِس سے پہلے ضرور موجود تھي - اور اُس کو جو عام مقبوليت هندوستان ميں ابھي کچھہ دن پہلے تک حاصل تھي وہ يقين دلاتي ھے کہ امير خسرو کي نظر سے وہ کتاب ضرور گزري هوگي - ميري مراد کتاب نصاب الصبيان سے ھے جو ابو نصر محمد بدرالدين فراهي نے ساتويں صدي هجري کي ابتدا ميں تاليف کي تھي - يہ امر بالکل قرين قياس ھے کہ امير خسرو کو خالق باري لکھنے کا خيال اِسي کتاب کي بدولت پيدا هوا هو نصاب الصبيان کي طرح خالق باري ميں بھي مختلف بحروں ميں بہت سے قطعے هيں - يہ مشابہت بھي ميرے خيال کي تائيد کرتي ھے - امير خسرو کي هر تصنيف کي طرح خالق باري بھي بہت مقبول هوئي - اِس کے بعد اُسي طرز کي بہت سي کتابيں لکھي گئيں مگر با وجود اس کے کہ وہ رائج الوقت زبان ميں هونے کي وجہ سے خالق باري سے کہيں زيادہ مفيد تھيں - اور خالق باري کي قديم زبان پڑھنے

والے جو درکنار پڑھانے والے بھی نہ سمجھہ سکتے تھے - پھر بھی اُن کتابوں کو وہ قبول عام نصیب نہوا جو خالق باری کو چھہ سو برس سے زیادہ حاصل رہا -

خالق باری کے طرز کی جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن کا مقصد بالعموم یہہ تھا کہ ہر وقت استعمال میں آنے والے لفظ یکجا کر کے نظم کر دیے جائیں کہ بچوں کو اُن کے یاد کرنے میں آسانی ہو - مگر خالق باری غالباً بچوں کے لیے نہیں لکھی گئی تھی - امیر خسرو کے زمانے میں چنگیزیوں کی تاخت و تاراج نے ایران و توران کو زیر و زبر کر دیا تھا - اُن کے جدال و قتال سے تنگ آکر ہزارہا ایرانیوں اور تورانیوں نے ہندستان میں پناہ لی تھی اِن لوگوں کو ہندستانیوں سے بات چیت کرنے میں بڑی دقت پڑتی تھی - نہ وہ اِن کی بات سمجھتے تھے نہ یہ اُن کی - قیاس کہتا ہے کہ اسی دقّت کو دور کرنے کے لئے امیر خسرو نے فارسی اور ہندی کے ضروری ہم معنی الفاظ یکجا کر کے نظم کر دیے ہونگے -

جس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے امیر خسرو نے خالق باری تصنیف کی تھی وہ ضرورت اب باقی نہیں رہی - نہ پرانا طریقہ تعلیم باقی رہا - اِس لیے خالق باری کی شہرت عوام میں روز بروز کم ہوتی جائیگی - لیکن اب ادبی تحقیق کا ذوق اور زبان اردو کی تاریخ جاننے کا شوق بڑھہ رہا ہے اِس لئے خواص میں اِس کی وقعت دو حیثیتوں سے بڑھتی جائے گی ایک یہ کہ اِس میں آج سے چھہ سو برس پہلے کی اُردو کے نمونے موجود ہیں - اور دوسرے یہہ کہ یہہ اُردو کا سب سے پہلا لغت ہے -

خالق باری کی وجہ تسمیہ تو ظاہر ہے - جس طرح شیخ سعدی شیرازی کا پند نامہ اور شیخ علاءالدین خراسانی کا ترجیع بند اپنے

اپنے ابتداء ي لفظوں کي بنا پر کریما اور مامقیماں کے نام سے مشہور هو گئے - اُسي طرح خالق باري کے ابتداء ي دو لفظ اُس کا نام قرار پاگئے - لیکن یہ معلوم نہ هو سکا که خود امیر خسرو نے اِس کتاب کا نام کیا رکھا تھا - اندا بتدا ضرور چلتا ہے که آج سے کوء ي تین سو برس پہلے بھي یه کتاب خالق باري هي کے نام سے مشہور تھي - الله خداء ي (نمبر ۴ فہرست هذا) جس کا ذکر آگے آئیگا ۱۰۱۰ ه کي تصنیف هے اِس کے مصنف تجلي نے کتاب کي مختصر منظوم تمهید میں یه شعر بھي لکھا هے :—

شاید از لطف و رحمت باري

روح خسرو نمایدم یاري

اِس شعر میں امیر خسرو کي روح سے مدد مانگي هے اور اِس کے پہلے مصرعے کے آخري لفظ سے خالق باري کي طرف اشارہ کیا هے اِس کے علاوہ خود اپني تصنیف کا نام الله خداء ي رکھا هے اِس سے صاف ظاهر ہے که اس زمانے میں بھي امیر خسرو کا هندي و فارسي منظوم لغت موجود تھا اور اُس کا نام بھي خالق باري هی تھا - تجلي نے جس طرح منظوم لغت لکھنے میں خالق باری کا انداز اختیار کیا اُسي طرح اُس کا نام بھي خالق باري کے طرز پر الله خداءی رکھا - ورنه ظاهر ہے که کتاب کا یه نام رکھنے کي کوئي وجه نه تھی - کیونکه اِس نام کو کتاب سے کوئي مناسبت نہیں هے - خالق باري کے تمام مطبوعه نسخوں میں ۱۹۲ بیتیں هیں لیکن جو پرانا قلمي نسخه میرے پاس هے اُس میں یه بیت نہیں هے - بیت

راہ سبیل طریق پہچان

ارتهہ تہو کا مارگ جان

اِس طرح اُس میں صرف ۱۹۱ بیتیں ہیں - ذیل میں ابتدائی بیں بیتیں نمونے کے طور پر لکھتا ہوں -

خالق باری - سرجن ہار   واحد ایک - بدا کرتار
رسول پیمبر - جان بسیٹھہ   یار دوست - بولی - حاایتھہ
اسم اللہ - خدا کا ناؤں   گرما ہے دھوپ - سایہ ہے چھانوں

(۲) بحرالفضائل في منافع الافاضل -

' یہہ فارسي زبان کا لغت ہے جس کو محمد بن قوام کرخي نے ۷۹۵ ھ میں تالیف کیا - اس کتاب کی دو جلدیں ہیں - پہلي جلد میں فارسي کے لفظ اور اصطلاحیں ہیں - دوسری جلد میں پہلي جلد کے ضمیمے چودہ بابوں میں ہیں - آخري باب کا عنوان یہہ ہے :—

" در بعضے الفاظ ہندوی کہ در نظم ہندوي استعمال کنند "

یہ گویا اُن ہندی لفظوں کا لغت ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کي زبان پر چڑھہ گئے تھے -

(۳) قصیدہ در لغات ہندی

یہہ قصیدہ خالق باری کے طرز پر لکھا گیا ہے - اِس کے مصنف حکیم یوسفي ہیں - حکیم صاحب ہرات کے رہنے والے تھے - بابر بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان میں موجود تھے - بہت سي کتابیں اُن کي تصنیف سے ہیں - منجملہ اُن کے طب یوسفي ' رسالہ نبض ' رسالہ قارورہ ' رباعیات یوسفي وغیرہ مدتوں طب کے درس میں داخل رہیں - یوسفي کو نظم پر وہ قدرت حاصل ہے کہ طبي مسئلے اور نسخے وغیرہ نہایت صفائي سے بے تکلف نظم کرتے چلے جاتے ہیں - میرے کتب خانے میں اُن کے رسالوں کا ایک بہت قدیم مجموعہ ہے - اُس میں ایک مختصر سي مثنوی بھي " مذمت

بخل و بخیل " میں ھے ایک قصیدہ ھے جس میں دواؤں کے نام عربی و فارسی میں نظم کیے ھیں اور کہیں کہیں اُن کے خواص بھی لکھہ دیے ھیں - اِسی مجموعے میں " قصیدہ در لغات ھندی " بھی ھے اور جس رسالے میں یہ قصیدہ ھے اُسی میں ایک قصیدہ حفظان صحت کے اُصول میں بھی ھے جو شہنشاہ بابر کے نام معنون کیا گیا ھے - عنوان کی عبارت یہ ھے :—

" ایں قصید ایست در حفظ صحت مزین بنام حضرت بادشاہ - سکندر حشمت سلیمان جاہ - تاج بخش عالم آرائے - عدو بند قلعہ کشائے طراز کسوت سلطنت و فرمان روائی ' نگین خاتم عظمت و کشور کشائی - قوت بازوئے مسلمانی - فروغ دیدۂ جہانبانی - خورشید روشن رائی - جمشید ممالک آرائی " -

آنکہ اورا رسد سرافرازی — شاہ جم قدر بابر غازی
کف او غیرتِ سحاب آمد — رائے او رشک آفتاب آمد
تا بعِ رائے اوست موج ملک — مسند قدرِ اوست اوجِ فلک
فلک آمد بذات او فاخر — خرد از مدح او بود قاصر
تا جہاں باشد ایزد متعال — دارَدش بر سریر عز و جلال

ظاھر ھے کہ اِس نظم کی تصنیف کو کم سے کم سوا چار سو برس ضرور ھو چکے ھیں اِس " قصیدہ " کا پہلا شعر یہہ ھے :—

نام ھر چیزے بہ ھندی بشنو از من اے پسر
خاصہ نامِ ھر دوائے نفع بردارے مگر

اِس سے ظاھر ھوتا ھے کہ مصنف کل دواؤں اور بہت سی ضروری چیزوں کے نام ھندی میں بتانا چاھتا ھے لیکن میرے پاس اِس قصیدے کے صرف ۴۴ شعر ھیں اور اُن میں دواؤں کے نام بہت ھی کم ھیں - ممکن ھے

که پوري نظم طویل هو اور یه صرف اسکا ایک حصه هو ذیل میں چند شعر نقل کیے جاتے هیں —

بُل تکلم باشد و بُل کر بگو یعنی سخن
بول

شکر فرماید ترا آنکس که گوید شکر کر

جیب و کن آمد زبان و گوش و داري ریش دان
جیبهه کان داڑهي

موچ را مي خوان بروت و کانه کور و بهرہ کر
مونچهه کانا بهرا

کال پوست و پڑ مغز و استخوان گویند هاد
کهال هاڑ

انگولي انگشت باشد انگوٹه انگشت سر
انگلي انگوٹها

هست پیشاني متهه سینه چهتي دست است هت
ماتها چهاتي هاتهه

موه روي و چل روان شو بیت بنشیں دک نگر
منهه پیٹهه دیکهه

گوسفند آمد بهڑ بز بکري و اوٹ اشتر است
بهڑ اونٹ

بلد گاؤ و فیل هاتي گوره اسپ و گده خر
بردہ هاتهي گهوڑا گدها

ثمر هندی امبلي السي بود تخم کتان
املي

مٹدوه نوعي ز ارزن دان و گندہ نیشکر
منتوہ گنڈا = گنا

ریشم ابریشم بود - کالا سیاہ اُجلا - سفید

سرمہ کاجل - مرچ فلفل - سعد موتہ - عود اگر

مانک و موتي بود - یاقوت و مروارید لیک

دھربا باشد کپور و روپہ نقرہ سونہ زر
روپا سونا

(۴) اللہ خدائی

اِس کتاب کا نام ھی بتاتا ھے کہ مصنف نے یہ کتاب امیر خسرو کی تقلید میں خالق باري کے طرز پر لکھي ھے "سبب تالیف" میں خود بھی اِس کا اعتراف کیا ھے - لکھتے ھیں :—

بعد ازاں سر کنم بیانِ سخن فضلہ گرد آورم زخوانِ سخن

بہرِ مرغِ سخن نہادم دام مددے خواستم ز روحِ نظام

شاید از لطف رحمتِ باري روح خسرو نمایدم یاري

تا مگر فکرتم تمام اُفتد طائر معنی ام بدام اُفتد

خالق باری جو جیسا میں اوپر لکھہ چکا ھوں کریما اور مامقیماں کی طرح اپني ابتدائي لفظوں سے موسوم ھو گئي - بہت ممکن ھے کہ امیر خسرو نے اِس کا کچھہ اور نام رکھا ھو - مگر اللہ خدائي کا نام خود مصنف کا تجویز کیا ھوا ھے - چنانچہ خاتمے میں کہتے ھیں :—

چوں بفضل خدائے گشت تمام

کردم اللہ خدائي ایں را نام

اور اگر ایسا نہ هوتا تو یہ کتاب اِس نام سے مشہور نہیں هو سکتی تھي اِس لیے کہ اِس کي پہلي بیت میں یہ لفظ موجود هي نہیں هیں -

اِس کتاب کے مؤلف شاہ جہاني عہد کے کوئي بزرگ هیں اُن کا تخلص تجلي هے اور تصنیف کا زمانہ ۱۰۶۰ ع ھ خود کہتے هیں :—

در مبہم چوں ایں هوس افزود

سال هجری هزار و شصت نمود

کل کتاب میں ڈھائي سو بیتیں هیں - ابتدا کي چند بیتیں یہہ هیں :—

هے صمد پاک اور احد یکہ جان ام‌القری کو مکہ

اب پدر باپ - والدہ مائي هست اخوي برادر و بھائي

جد دادا - عمو بود چاچا قول در لفظ هندوی باچا

(۵) تحفة الہند

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کو هندوؤں کے علموں کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا هوا - چنانچہ کوکلتاس خاں کي فرمایش سے مرزا محمد ابن فخرالدین محمد نے یہ کتاب تالیف کي - مؤلف نے اِس کا دیباچہ اپنے زمانے کے رنگ کے خلاف اور اورنگزیب کي طبیعت کے موافق نہایت مختصر لکھا هے - میں اُسے یہاں نقل کیے دیتا هوں کہ کتاب کي تالیف کا سبب اور مضامین کي فہرست خود مؤلف کي زبان سے سن لیجیے :—

"الحمد لله رب‌العالمین والصلوة علی رسوله محمد و آله و اصحابه اجمعین اما بعد - چنین گوید مست بادۂ هذیان بیحد مرزا محمد ابن فخرالدین محمد که در عهد میمنت مهدخدیو کشورستان - خدائگان قضا فرمان - نیر اوج صاحقبرانی اختر برج گورگاني - شهنشاه خورشید کلاه

گردون سریر ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بادشاه عالمگیر خلد الله تعالی ملکه و سلطانه - افاض علی العالمین بره و احسانه - حسب الاشارت با بشارت وزارت و امارت مرتبت - ابهت و ایالت منزلت - رفیع شاه جم جناه سکندر مکان کوکلتاش خان برائے مطالعه همایون بندگان شهر یار والا مدار مرکز محیط سلطنت کبری مرکز (؟) دولت عظمی در علوم متداولهٔ هندیان - جزوے چند پرداختم و آں را به تحفة الهند موسوم و مشهور ساختم و آں مشتمل است بر مقدمه و هفت باب و خاتمه -

۱—مقدمه در بیان مصطلحات حروف تهجیه هندیه و علم خط و ذکر اشکال حروف مذکوره از مفردات ومرکبات و بعضے قواعد کلیه -

۲—باب اول—در علم پنگل یعنی علم عروض اهل هند -

۳—باب دوم—در علم تُک یعنی علم قوافی اهل هند -

۴—باب سوم—در علم الکار یعنی علم بیان و بدیع اهل هند -

۵—باب چهارم—در علم سنگار رس یعنی علم عاشقی و معشوقی و بیان احوال عاشق و معشوق -

۶—باب پنجم—در علم سنگیت یعنی علم موسیقی اهل هند وغیره -

۷—باب ششم—در علم کوک یعنی علم اقسام زن و مرد و صحبت داشتن و مباشرت با زنان -

۸—باب هفتم—در علم سامدریک یعنی علم قیافه که علامات خیر و شر در انسان ازاں معلوم شود -

۹—خاتمه در ذکر لغات و مصطلحات و کنایات اهل هند - من الله توفیق والرشاد منه السداد و الیه المعاد -

میں نے اِس کتاب کو اِس فہرست میں صرف اُس کے خاتمے کی

وجہ سے جگہ دی ھے کیونکہ اِس میں "لغات ومصطلحات و کنایات اهل هند" کا ذکر ھے کتاب تحفۃالهند اب نہایت کمیاب ھے - اس لیے مجھے نہایت افسوس تھا کہ اِس کا جو قلمی نسخہ مجھے دستیاب ھوا وہ ناقص ھے - باب پنجم کا زیادہ حصہ اور "خاتمہ" پورا غائب ھے - لیکن قدیم قلمی کتابوں کے جس ذخیرے میں سے یہ نایاب نسخہ مجھے هاتھہ آیا تھا اُسی میں هندی اور فارسی کا ایک لغت بھی نکل آیا مگر نہ مصنف کا نام معلوم ھو سکا نہ کتاب کا نہ تصنیف کے زمانے کا پتا لگ سکا نہ تحریر کی تاریخ کا - میں اِسی کوشش میں تھا کہ کسی طرح اِن میں سے کسی بات کا سراغ لگ جائے کہ یکایک خیال آیا کہ کہیں یہ تحفۃالهند کا خاتمہ نہ ھو اب جو میں نے غور کرنا شروع کیا تو خیال صحیح نکلا - اِس کی صحت کے چند ثبوت ذیل میں لکھتا ھوں :—

(۱) یہ لغت اور تحفۃالهند دونوں کتابیں ایک ھی کاتب کی لکھی ھوئی معلوم ھوتی ھیں - اگرچہ دونوں کتابوں کی جسامت میں فرق ھے مگر خط ایک ھے -

(۲) تحفۃالهند کے خاتمے میں مؤلف نے جو کچھہ لکھنا چاھا تھا وھی یعنی "لغات و مصطلحات و کنایات اهل هند" اِس لغت کا موضوع ھے -

(۳) بعض لفظوں کے معنی اِس لغت میں بھی دیے گئے ھیں اور تحفۃالهند میں بھی - یہ معنی جن عبارتوں میں لکھے گئے ھیں اُن میں ایسی لفظی مشابہت موجود ھے - جو یقین دلاتی ھے - کہ دونوں عبارتیں ایک ھی قلم سے نکلی ھیں مثلاً "کوک" کے معنی لغت میں یوں لکھے ھیں :—

"نام علمے است در معرفت اقسام زن و مرد و فن مباشرت" اور تحفۃالهند میں کوک کی تعریف یوں دی ھے :—

"علم کوک یعنی معرفت اقسام زن و مرد و صحبت داشتن و مباشرت کردن با زنان"

لفظ "سنگیت" کے معنی لغت میں یوں لکھے ھیں :-

"علم موسیقی را نامند و آن مشتمل است بر راگ و تال و نرت یعنی نغمۂ و أصول و رقص" -

اور تحفۃالہند میں "سنگیت" کی تعریف میں لکھا ھے :—

"عموماً مجموعۂ راگ و تال و نرت یعنی نغمۂ و أصول و رقص و خصوصاً بمعنی نغمه باشد"

لفظ رومانچ کے معنی لغت میں یہ بتائے ھیں :—

"در اصطلاح اهل سنگار رس نام "بهاوے" است و آن "بهاوے" باشد که از شوق و خواهش صحبت نائک نائکا را قشعریره پیدا شود و موے برا ندام تیغ کشد"

اور تحفۃالہند میں علم سنگار رس کے تحت میں "بھاؤ" کے اقسام بیان کرتے ھوئے "رومانچ" کی تعریف یوں کرتے ھیں :—

"آں حالتے بود که از استیلائے شہوت و غلبۂ شوق صحبت نائک مُوے بر اندام نائکا بایستند و قشعریره واقع شود -

لفظ "ابھرن" کے معنی لغت میں یوں لکھے ھیں :—

"بمعنی زیور و هر هنت و آرایش بود و آں باصطلاح ایشان (یعنی اهل هند) دوازده است و در علم سنگار رس بتفصیل ذکر نموده شد" اِس عبارت کا آخری جملہ یعنی "در علم سنگار رس بتفصیل ذکر نموده شد" صاف ظاهر کرتا ھے - کہ اِس لغت کا مصنف علم سنگار رس کا بیان

اس سے پہلے کر چکا ھے ۔ اور لغت کا دیکھنے والا اس بیان کو پڑھ بھی چکا ھے اِس لیے بارہ ابھرنوں کی دو بارہ تفصیل ضروری نہیں ہے ۔ صرف اُس بیان کی طرف اشارہ کر دینا کافی ھے ۔ عبارت کے انداز سے یہ بھی ظاہر ہوتا ھے کہ علم "سنگار رس" پر مصنف نے کوئی علاحدہ کتاب نہیں لکھی تھی کیونکہ اگر مصنف اپنی کسی دوسری کتاب کا حوالہ دے رہا ہوتا تو اوپر نقل کیے ہوئے جملے میں "سنگار رس" کی جگہ اُس کتاب کا نام ہوتا یا اُس معنی کے لفظ ہوتے کہ "وہ کتاب جو میں نے علم سنگار رس میں لکھی ھے" ۔ اگر "سنگار رس" ھی کو کتاب کا نام فرض کر لیں تو بھی "علم سنگار رس" کی جگہ "کتاب سنگار رس" ہونا چاھیے اور ان سب باتوں پر نظر کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لغت کسی ایسی کتاب کا ایک جزو ھے جس میں علم سنگار رس کا بیان بھی اِس سے پہلے موجود ھے اب ذرا کتاب تحفۃالہند کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ اُس کا باب چہارم علم سنگار رس کے بیان میں ھے ۔ اور "خاتمہ" میں "لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند" کا ذکر ھے جو اِس لغت کا موضوع ھے ۔ شکی طبیعت والے تو اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید کوئی اور کتاب بھی ایسی ہو کہ اُس میں علم سنگار رس کا بیان بھی ہو اور لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند کا ذکر بھی ہو اور یہ لغت اُسی فرضی کتاب کا ایک جزو ہو ۔ لیکن اگر اِس طرح کے شبہوں کو دخل در معقولات کا موقع دیا جائے تو شاید ھی کوئی بات کبھی ثابت ہو سکے بہرحال ادبی تحقیق کے سلسلے میں جس طرح کے ثبوت بالعموم کافی سمجھے جاتے ہیں ان پر نظر کر کے میرے نزدیک یہہ بات ثابت ھے کہ یہہ لغت تحفۃالہند کا "خاتمہ" ہے جسے مرزا محمد ابن فخرالدین محمد نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں تالیف کیا تھا ۔

اِس لغت میں هندی لفظوں کا تلفظ اور ان کے معنی فارسی میں دیے گئے هیں - ذیل لفظوں کی تعداد ڈھائی هزار کے قریب ہے - اگرچه اِن میں بہت سے لفظ ایسے هیں جو اردو میں گھل مل نہیں سکے - لیکن بہت سے لفظ ایسے بھی هیں جو قدما کے کلام میں پاٸے جاتے هیں مگر اب متروک هو جانے کی وجه سے اُن کا سمجھنا دشوار هو گیا هے - اردو کے دوسرے لغتوں میں اول تو یه لفظ ملتے هي نہیں هیں اور اگر ملتے بھي هیں تو اُن کے صحیح تلفظ اور لغوي معني معلوم نہیں هو سکتے - ان کے علاوه رائج‌الوقت الفاظ بھي بہت هیں -

تحفةالهند کا جتنا حصه میرے پاس هے اُس کي ضخامت ۲۲۲ صفحے هے اور اس کے ' خاتمے ' کا حجم ۴۴ صفحے هے - هر صفحے میں اوسطاً ۲۲ سطریں هیں اور خط بہت خفی هے -

(۶) فرینسس کَس ایم تیورني سِس کا لغت

مؤلف ایک اطالوي مسنری تھا جو هندستان میں تبلیغ مذهب کي غرض سے آیا تھا - اُس نے ۱۷۰۴ ع میں هندستاني زبان کا ایک لغت لکھا تھا (ع - ح) -

(۷) جان جُو شُواکِٹلر کا لغت

مؤلف پروشیا کا باشندہ تھا - دلندیزوں نے اِس کو اپنا سفیر بنا کر شاه عالم کے دربار میں بھیجا تھا - چند سال هندستان میں رہ کر پھر ۱۷۱۶ ع میں ایران کا سفیر هو کر چلا گیا - اُس نے هندستاني زبان کا ایک لغت غالباً لاطیني زبان میں لکھا تھا - (ع - ح) -

(۸) غرائب اللغات

یہہ کتاب میري نظر سے نہیں گزري - عجائب اللغات (دیکھو نمبر ۹ فہرست ھذا) کے دیباچے سے صرف یہہ پتا چلتا ھے کہ اِس کے مؤلف فاضل اجل مولوي عبدالواسع ھانسوي ھیں اور نوادرالالفاظ (دیکھو نمبر ۱۰ فہرست ھذا) کے دیباچے سے یہہ معلوم ھوتا ھے کہ اِس لغت میں وہ ھندي الفاظ جمع کر دیے گئے ھیں جن کے عربي یا فارسي یا ترکي مترادفات لوگوں کو بالعموم معلوم نہ تھے - مؤلف نے ھندي لفظوں کو اصل لغت قرار دے کر اُن کے معني فارسي میں اور مترادفات عربي فارسي یا ترکي میں دیے ھیں -

(۹) عجائب اللغات

مؤلف نے دیباچے میں اِس لغت کي تالیف کا حال یوں لکھا ھے
" میگوید اضعف عباداللہ العلي متعلم قاصرالفہم اجمیری پلولي کہ چوں بعضے از معاني و مضامین بہ لسان ھندي از زبان مردم شنیدہ میشد و اکثر از مبتدیان در جست و جوے فرس آنہا حیران و سرگردان مي گشتند - بنابران - بقدر فہم خود فارسي آنہا از نسخۂ جہانگیری و فرھنگ طب شہابي - و غرائب اللغات تصنیف افاضلت پناھي مولوي عبدالواسع ھانسوي حفظہ اللہ تعالیٰ عن الافات والدواھي انتخاب نمودہ در ایں اوراق معدودہ مُندرج ساختم و ابواب مطابق اوائل حروف ھندي جدا جدا بر داختم و استشہاد بعضے لغات از اشعار معتبر از ھر جا بہزار تکاپو بر ملصہ بیان انداختم و نام ایں عجائب اللغات نہادم" -

اس عبارت سے معلوم ھوتا ھے کہ یہہ لغت غرائب اللغات کے بعد اور نوادرالالفاظ سے پہلے تالیف کیا گیا تھا ورنہ مولف خان آرزو کي تحقیق سے

بھی فائدہ اُٹھانا - مؤلف نے مولوی عبدالواسع کے نام کے بعد جو دعائیہ فقرہ لکھا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عجائب‌اللغات کی تالیف کے وقت زندہ تھے -

میرے کتب خانے میں اِس لغت کا جو نسخہ موجود ہے وہ مکمل کتاب نہیں ہے - بلکہ اصل کتاب کا انتخاب منتخب عجائب‌اللغات کے نام سے ہے اور صرف ۴۶ صفحوں پر ختم ہوگیا ہے - ہر صفحے میں سترہ اٹھارہ سطریں ہیں -

(۱۰) اُردو لغت مؤلفہ خان آرزو

یہ لغت علامۂ شہیر سراج الدین علی خاں آرزو کی تالیف ہے اِن کی علمی و ادبی قابلیت اور اِن کی جلالت قدر کے جاننے والے ابھی اِتنے موجود ہیں کہ اُن کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں - مگر اُن کے اُردو لغت کے سلسلے میں صرف اِتنی بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خان آرزو - میر تقی میر کے ماموں اور اُستاد تھے - مرزا رفیع سودا کو بھی اُن کی شاگردی کا شرف حاصل تھا -

مؤلف نے دیباچے میں اِس کتاب کا "سبب تالیف" یہ لکھا ہے - "میگوید فقیر سراج الدین علی آرزو تخلص کہ یکے از فضلاے ہندوستان کتابے در فن لغت تالیف نمودہ مسمیٰ بہ غرائب اللغات و لغات ہندی کہ فارسی یا عربی یا ترکی آں زبان زد اہل ایں دیار کمتر بود در آں با معانی آں مرقوم فرمودہ - چوں اکثر در بیان معنی الفاظ تساہلے و سقمے بہ نظر آمد لہذا نسخۂ در ایں باب بقلم آمد - در ہر جاے کہ سہو و خطاے معلوم کرد اشارت بداں نمود - نیز انچہ بطبع ناقص ایں کمال دوست در آمد بر آں افزود - و چوں در غرائب‌اللغات رعایت حرف ثانی نبود بر آوردن لفظ قدرے مشکل می نمود ازیں باعث مراعات مذکور نیز بعمل آمد" -

اِس لغت کا جو قلمي نسخه میرے کتب خانه میں هے وہ ۱۲۴۰ ھ کا نقل کیا هوا هے اِس کا حجم ۳۰۱ صفحے هے اور هر صفحے میں ۱۵ سطریں هیں - خاتمه پر یهه عبارت لکهي هوئی هے - "تمام شد کتاب غرائب اللغات من تصنیف سراج الدین علی خاں المتخلص به آرزو به دارالسلطنت لکهنؤ بتاریخ پانزدهم شعبان المعظم روز پنجشنبه سنه یک هزار و دوصد و چهل" - مگر دیباچے کی عبارت سے صاف ظاهر هے که اِس کتاب کا نام غرائب اللغات نهیں هے یه مسلم هے که خان آرزو نے الفاظ هندی کا ایک لغت نوادرالالفاظ کے نام سے لکها تها - اغلب هے که یهه وهي لغت هو - خان آرزو اپني عمر کے آخري حصے میں لکهنؤ میں نواب شجاع الدوله کي سرکار میں ۳۰۰ روپیه ماهوار کے ملازم هو گئے تهے اور یهیں سنه ۱۱۶۹ ھ میں کوئي ۹۸ برس کي عمر میں انتقال کیا - اِس سے صاف ظاهر هے که یه لغت اٹهارویں صدي عیسوي کے نصف اول میں لکها گیا تها -

(۱۱) ڈیوڈ مِل کا لغت

ڈیوڈ مل کے مضامین کا مجموعه سنه ۱۷۴۳ ع میں شایع هوا تها اُس میں لاطیني - هندستاني اور فارسي کا ایک مختصر سا لغت بهي شامل تها - (ع + ح) -

(۱۲) فرگسن کا هندوستاني لغت

یهه هندوستاني انگریزي لغت پهلے پهل سنه ۱۷۷۳ع میں شایع هوا تها - (ع + ح) -

(۱۳) شمس البیان في مصطلحات هندوستان

یهه کتاب مرشد آباد کے نواب امیرالملک شمس الدوله سید احمد علي خاں

بہادر ذوالفقار جنگ کي فرمایش سے مرزا جان طپش نے ۱۲۰۷ ھ میں تالیف کي تھي - اِس تالیف کي غرض دیباچے کي اِس عبارت سے ظاهر هوتی ہے کہ " نسخہ مشتمل بر توضیح اصطلاحات دیار دهلی و روز مرهٔ فصحاے اُردو ے معلی انچہ در بعضے اشعار منظوم مي گردد و فهم دور دستان و هر آنانکہ در امصار بعید واقع اند بادراک کُنهش نمی رسد بزیور تالیف آراستگی یابد تا مطالعۂ آں انواع کنایت را صراحت بخشد بہر طالبان ایں فن کار آساں گردد " -

مؤلف نے اُردو محاوروں کے معني فارسي میں بیان کیے هیں اور هر محاورے کي سند میں اساتذہ کے شعر پیش کیے هیں - یہہ کتاب نہایت قابل قدر ہے اِس میں بہت سے ایسے محاوروں کے معني دیے هوے هیں جو متقدمین کے کلام میں موجود هیں مگر اب متروک هو گئے هیں اور جن کے معني سمجھنے میں دقت هوتی ہے مثلاً کسي کي آس پجانا - آنکھوں میں آني - بسرام لینا - بوجھہ پکڑنا - درخت کا پاتوں آ لگنا پانوں چل جانا وغیرہ - میرے کتب خانہ میں اِس کتاب کا جو نسخہ ہے وہ ۱۲۲۹ ھ میں مطبع آفتاب عالمتاب - مرشدآباد میں چھپا تھا اور سو صفحوں میں تمام هوا ہے -

کتاب الفہرست کے مؤلف نے اِس لغت کے مؤلف کا نام مرزا جان طپش کي جگہ مرزا خان عیش لکھہ دیا ہے - تذکرہ طور کلیم میں لکھا ہے کہ مرزا جان کا اصلي نام اسمعیل تھا - لکھنؤ میں مرزا جہاندار شاہ کی رفاقت میں رهتے تھے اس کے بعد بنگالہ میں نواب شمس الدولہ کي سرکار سے متعلق هوگئے تھے - سنسکرت زبان خوب جانتے تھے - میر درد کے شاگرد تھے اور زیادہ تر قطعے کہتے تھے -

(۱۴) انگریزي ہندوستاني لغت مولفہ ڈاکٹر گلکرسٹ

یہ لغت اٹھارهویں صدي عیسوي کے آخر میں لکھا گیا اور فورٹ ولیم کالج کے مطبع میں چھپا - (ع + ح) -

(۱۵) هندی عربی آئینه

اِس کتاب میں اُن عربي لفظوں کي جدولیں دي گئي هیں جن کا هندستاني زبان سے تعلق هے - یهه کتاب بهي فورت ولیم کالج کے مطبع میں سنه ۱۸۰۴ ع میں چهپی تهی - (ع + ح) -

(۱۶) کپتان جوزف تیلر اور ڈاکٹر هنٹر کا هندستانی انگریزي لغت

کپتان تیلر فورت ولیم کالج کلکته میں هندستاني زبان کے پروفیسر تهے - انهوں نے اپنے استعمال کے لیے ایک هندستاني انگریزي لغت مرتب کیا تها - ڈاکٹر هنٹر نے فورت ولیم کالج کے قابل قابل هندستانیوں کي مدد سے اس لغت پر نظر ثاني کر کے اس کو پہلي مرتبه سنه ۱۸۰۸ ع میں کلکته میں چهپوایا -

(۱۷) انگریزی هندوستاني لغت مرتبۂ ڈاکٹر هیرس

ڈاکٹر هیرس کا یهه لغت سنه ۱۸۱۱ ع سے پہلے تالیف هو چکا تها اس لیے که کپتان تامس روبک نے اپنے لغت کي تالیف میں اس سے مدد لي تهي اور ان کا لغت سنه ۱۸۱۱ ع میں شائع هوا تها - اس لغت کے علاوه ڈاکٹر هیرس نے هندستاني اور دکهن کا ایک نهایت ضخیم لغت تیار کرنے کا سامان کیا تها - نهایت محنت اور کوشش سے قابل هندستانیوں اور دکهنیوں کي مدد سے اس لغت کے لیے مودا فراهم کیا تها مگر اس کام کو تکمیل تک پهنچانے نه پائے تهے که موت آ گئي - جتنا مواد وه فراهم کرچکے تهے وه کئي ضخیم جلدوں میں سما سکا تها - یه قلمي جلدیں انڈیا هاوس کے کتب خانے میں رکهه دي گئي تهیں -

جان شیکسپیر نے اپنے لغت کی تالیف میں اس مواد سے بہت فائدہ اٹھایا ۔ ڈاکٹر ھیرس کا قیام مدراس میں تھا ۔

(۱۸) فرھنگ اصطلاحات جہازرانی

اس فرھنگ کے مؤلف کپتان تامس روبک ھیں جو فورٹ ولیم کالج کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے ۔ اس میں جہاز کے مختلف حصوں کے نام ۔ جہازرانی کے اصطلاحات اور بحری فوج کے قواعد کے الفاظ دیے گئے ھیں ۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۱۱ ع میں چھپی تھی ۔ (ع ۔ ح) ۔

(۱۹) ھندستانی انگریزی لغت مؤلفہ کپتان تامس روبک

اس میں وہ الفاظ و محاورات جمع کیے گئے ھیں جو ھندستانی زبان کی مروجہ کتابوں میں موجود تھے مؤلف نے اس کتاب کی تدوین میں گلکرسٹ ، ھنٹر اور ھیرس کے لغتوں سے بھی مدد لی ھے ۔ یہ کتاب بھی سنہ ۱۸۱۱ ع میں چھپی تھی ۔ (ع ۔ ح) ۔

خزینۃالامثال

یہ عربی ، فارسی اور اردو مثلوں کا مجموعہ سید حسین شاہ حقیقت کا مرتب کیا ھوا ھے ۔ اس کی ترتیب یوں ھے کہ ھر حرف کے تحت میں پہلے عربی پھر فارسی اور پھر اردو مثلیں لکھی گئی ھیں ۔ عربی مثلوں کا ترجمہ بھی فارسی میں مولوی تراب علی نے کر دیا ھے ۔ یہہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع نظامی ، لکھنؤ ، میں شاھی زمانے میں چھپی تھی ۔ میں نے اس کا جو نسخہ دیکھا ھے وہ مطبع نولکشور ، کانپور ، میں سنہ ۱۸۹۲ ع میں چھپا تھا اور اس کا حجم ۲۵۵ صفحے ھے ۔

اس کتاب کی تالیف کا زمانہ ٹھیک معلوم نہیں - لیکن حقیقت کی ہین کتابیں اور میرے کتب خانے میں ہیں یعنی صنم کدۂ چین - جذب عشق اور ہشت گلزار جو ۱۲۰۵ ھ ۱۲۱۱ ھ اور ۱۲۲۵ ھ میں ترتیب وار لکھی گئی ہیں - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خزینۃالامثال تیرھویں صدی ھجری کی ابتدا میں یعنی اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری یا انیسویں صدی عیسوی کے ابتدا کی چند سالوں میں تالیف ہوئی -

(باقی آیندہ)

تذکرۂ خسرو کے تمہیدی صفحات

جہانگیر کی پیدایش

(از مولوی مقبول احمد صمدنی ، صاحب حیات جلیل)

عشق از فرہاد ہا ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خوشاں ہیچ غوغاے نہ داشت

زندہ جاوید مورخ ، لالہ سجان رائے* جو بہادر شاہی دربار سے بندرابن داس کے ممتاز خطاب سے سرفراز تھے ، اپنی مستند و نفیس کتاب خلاصۃالتواریخ† میں لکھتے ہیں کہ ہندو راجاؤں سے قرابت و یگانگی پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے ہمایوں کو پیدا ہوا تھا - یہہ عظمت و سطوت والا بادشاہ جب شیر شاہی افواج سے

* "منشی المناشی لالہ سجان رائے بھنڈاری" لکھے جاتے ہیں - شاہزادہ محمد معظم (شاہ عالم) کے مقرب و معتمد دیوان تھے ، تلوار اور قلم دونوں کے دھنی - ۱۰۹۵ھ (۱۶۸۴ع) میں گول کنڈے کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے - حسن لیاقت کی وجہ سے شاہزادہ اُن کو بہت عزیز رکھتا تھا - عالمگیر کے یہاں بھی اُن کو شرف و امتیاز حاصل تھا ذات کے کھتری تھے ، بٹالہ ملک پنجاب کے رہنے والے - (امراے ہنود صفحہ ۳۷۹) - ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ع) میں فوت ہوئے - منتخب اللباب حصہ دوم (ص ۲۱۱) اور قاموس المشاہیر جلد اول (ص ۱۳۲) میں بندرابن داس بہادر شاہی کے نام سے ان کا ذکر ہے - مقدمہ رقعات عالمگیر (مطبوعہ ۱۹۳۰ع) میں ان کی سکونت پٹیالہ تحریر ہے - در اصل اس غلطی کی ذمہ داری ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہند (جلد ہشتم صفحہ ۵) اور قاموس المشاہیر (جلد اول صفحات ۲۸۲ و ۲۸۳) پر ہے - پروفیسر ڈوسن نے سجان (س ، ج ، ا ، ن) کو سبحان (س ، ب ، ح ، ا ، ن ،) لکھہ دیا ہے - سبحان اللہ -

† اس کے متعدد قلمی نسخے میری نظر سے گزرے ہیں -- آغاز یا خاتمہ کتاب میں فاضل مگر منکسر مزاج مصنف نے اپنا یا کتاب کا نام کہیں نہیں لکھا جن کتابوں میں اس کا حوالہ ہے اِس کو "خلاصۃالتواریخ" لکھتے ہیں - دیباچہ ماثرالامرا (صفحہ ۴) میں بھی اِس کا نام خلاصۃالتواریخ اور عہد عالمگیر کی تصنیف بتایا ہے -- مسٹر بیل ، آریئنٹل بیاگرفی کل ڈکشنری (صفحہ ۷۳)

شکست کھاکر شکستہ حالی میں ، ایران پہونچتا ھے جو شاہ طہماسپ صفوی نے اس مفلوک الحال و غریب الدیار مگر عظیم المرتبت مہمان کی بڑی تعظیم و تکریم کی - شایان شان خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا - زیادہ قیام سے بے تکلفی بڑھی تو اثنائے گفتگو میں شاہ کی زبان سے یہہ نکلا کہ جب بابر نے ھندستان فتح کیا تھا تو اگر اُسی ھنگامہ اور اُسی سلسلہ میں وھاں کے بڑے بڑے عمائد اور زمینداروں سے رشتہ و پیوند کسی طور سے قائم

میں " بندرابن " کی کتاب کا نام " لب التواریخ " لکھتے ھیں - یہ دوسرے بندرابن تھے ، بہارا مل کے بیٹے - جو دارا شکوہ کا دیوان تھا اور جس کو شاہ جہاں نے " رائے " کا خطاب دیا تھا باپ کے مرنے پر بیٹے کو عالمگیر نے رھی اعزاز بخشا - اُس کی " لب التواریخ " میں شہاب الدین غوری سے لے کر ۱۱۰۱ ھ سنہ ۱۶۸۹ ع) تک کے حالات مندرج ھیں - یہ " لب التواریخ ھند " بھی کہلاتی ہے - غلط فہمی سے بچنے کے لیے ، اس قدر اور لکھہ دینا چاھتا ھوں کہ " لب التواریخ " دو اور بھی ھیں - ایک امیر یحیی بن عبداللطیف الحسینی کی ، جو سنہ ۹۲۸ ھ (سنہ ۱۵۲۱ ع) میں تالیف ھوئی اور جس کا تذکرہ ماثرالامرا اور حاجی خلیفہ میں ھے -- دوسری ، مدرس سکندر فریزر ٹیلر کی یادگار ھے

منشی سجان رائے نے آئین اکبری کے طرز پر ابتدائے آفرینش یا آغاز عالم عالمیان سے لے کر سال چہارم جلوس عالمگیر یعنی ۱۱۰۷ ھ تک ھندستان کی نہایت اچھی تاریخ لکھی ھے صوبوں ، علاقوں ، شہروں ، اور قصبوں کے حالات بقدر ضرورت لکھے ھیں - یہ اُس عہد کا خاصا " امپیریل گزیٹیر " ھے جو دو برس کی سعی و محنت سے تیار ھوا تھا - خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ یا خلاصہ جان گلکرسٹ صاحب کی فرمایش سے میر شیر علی افسوس نے اردو میں کیا تھا - آرایش محفل نام ھے - انگریزی پیکو میجر ھنری کورٹ کے قلم سے آراستہ ھوا -- خلاصۃ التواریخ مطبوعہ (دھلی سنہ ۱۹۱۸ ع) میں باوجود سعی و اھتمام بمقابلہ قلمی نسخوں کے کچھہ باتیں رہ گئی ھیں --

منشی صاحب کے خطوط (۱۱۰۷ ھ تک) کا مجموعہ خلاصۃ المکاتیب ھے -

* صفحہ ۳۶۰ -- نسخہ قلمی کتب خانہ عالیہ صدیقہ مولوی حکیم سید منظور احمد صاحب مغفور --

کر لیتا تو خوب ہوتا - نازک موقعوں پر اُس سے امداد و اعانت ہوتی ؟ امور سلطنت میں خلل نہ آنے پاتا - ضرورت کے وقت یہی ناتے رشتے مضبوط طنابیں بن جاتے - سلیمہ کی صحبت تھی اور دل پر چوٹ - ھمایوں نے آنکھہ سے دو تین قطرے ٹپکادیے اور کچھہ جواب نہ دیا - ایک مدت بعد وہ لوٹ کر ھندستان آیا اور اپنے باپ کا فتح کیا ہوا ملک خاندان سوری سے چھین لیا مگر یہہ خیال اُس کے دل و دماغ پر ھمیشہ مستولی رہا - پیام موت آچکا تھا - کتب خانہ کے زینہ سے پھسلا اور جان عزیز جان آفرین کے سپرد کی - جس عزم کو کہ ھمایوں قلت فرصت اور ناگہانی موت کی وجہ سے عمل میں نہ لا سکا تھا اُس کو اُس کے سعادت مند اور صاحب تدبیر جانشین اکبر نے پورا کیا - وصیت کے موافق تخت نشین ہونے کے بعد ھندستان کے ذی رتبہ زمینداران کو وصلت و پیوند کے لیے نوید بھیجے - اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ تسلیم و اقبال کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں -*

تم جسے یاد کرو ؟ پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا ؟ نہ خدا یاد رہے

---

* خان بہادر سید محمد لطیف تاریخ آگرہ صفحات ۲۰۷ و ۲۸۴ و تاریخ ھند از مسٹر ٹی لاؤس صفحہ ۹۸ - "آگرہ میں تین دن" از لفٹنٹ کرنیل اچ اے نیویل - صفحہ ۲۹ -

فارسی مورخوں نے خواہ مسلمان ہوں خواہ ھندو ، کمال راستی و درستی سے کام لیا اور اس تصویر کے دونوں رخ دکھا دیے ہیں - جہاں وہ یہہ لکھتےھیں کہ :—

(۱) سال بست و نہم دختر عفت سرشت راجہ بھگونت داس را با شاہزادہ سلیم پیوند ہیوگانی دادند -- مآثرالامرا جلد دوم - صفحہ ۱۳۰ -

(۲) اودے سنگھہ عرف موتہ راجہ (مارواڑ) کی ۲ مان متی ؟ (بال متی) نامی لڑکی سلیم کے عقد میں آءی -- جس سے سلطان خسرو متولد ہوا -- ماثر جلد دوم -- صفحہ ۱۸۱ --

آزاد دھلوي نے دربار اکبری* میں اسي گفتگو کو "" ھندوؤں کے ساتھھ ایلدایمت "" کے عنوان سے اپنے شیریں انداز اور دلکش عبارت میں بہ تبدیل پرداز نقل کیا ھے - امراے ھنود میں† بھي پیرایہ بدل کر ایسا ھي لکھا ھے -

(۳) راۓ کلیان مل زمیندار بیکانیر ، صبیہ برادر خود را داخل پرستاران محل سراے خسروانی ساختہ سر رشتۂ اختصاص بدست آورد - ماثر جلد دوم - صفحہ ۱۴۸ -

(۴) سال سي و یکم صبیۂ راے راے سنگھہ بیکانیری بعقد ازدواج شاھزادہ سلیم در آمدہ بر منزلت او افزود - ایضاً ص ۱۲۱ -

(۵) ۹۸۴ ھ (سنہ ۱۵۷۶ ع) میں اکبر نے راجہ بیر برادر راے لون کرن کو راجا ڈونگر پور کے پاس بھیجا - راجا اپني بیٹي حرم سراۓ شاھي میں داخل کرنا چاھتا تھا مگر بعض وجوہ سے رکا ھوا تھا - اُن کے پھونچتے ھي راني کو خوش خوش روانہ کر دیا - دربار اکبری - صفحہ ۲۹۷ -

(۶) سال سوم جلوس جہانگیري میں راجہ مہا سنگھہ ولد راجہ جگت سنگھہ پسر کنور مان سنگھہ کچھواھہ کي بہن کے لئے اسي ھزار روپیہ ساچق (تحائف قبل شادی) بھیجکر داخل محل کي گئي - راجہ مان سنگھہ نے ساتھہ ھاتھي بطریق جہیز پیش کئے - ماثر ج ۳ - ص ۱۷۵ -

(۷) سال چہارم راجہ بر سنگھہ دیو ، بندیلہ کي بیٹي اُس کے عرض کرنے پر خسروی (بادشاھي) محل میں داخل ھوئي ایضاً - ص ۲۱۳ -

تو اُس کے ساتھہ اُن کو یہہ تحریر کرنے میں بھي باک نہیں ھوتا کہ راجگان اودے پور نے مسلمانوں کو لڑکي دینے کاننگ گوارا نہیں کیا - یہ بھي لکھتے ھیں "" گویند کہ صبایاۓ راجہاے راٹھور و کچھواھہ داخل محل بادشاھان تیموریہ شدہ اند اما از قوم سیسودیا ، این نسبت را ھیچ کس قبول نہ کردہ "" - اس اجمال کي تفصیل یہ ھے کہ جہانگیر نے تخت نشین ھونے پر خواھش کي تھي کہ جگت سنگھہ پسر راجہ مان سنگھہ کي لڑکي کو داخل شبستان محل شاھي کرے مگر راۓ بھوج پسر راۓ سرجن ھادا جو اُس کا نانا (پدر مادر) تھا راضي نہ ھوا - بادشاہ کو نا گوار بھي گزرا - خیال تھا کہ واپسي کابل پر اُس کي تنبیہ کي جائے گي مگر قضاۓ الھي سے راۓ بھوج اسي سال فوت ھو گیا - ماثر جلد دوم - صفحہ ۱۲۱ -

* صفحہ ۶۱ -

† صفحہ ۳۸ -

چنانچہ سب سے پہلے خود اس کے مشکوے عالي میں اس ملک کے حکمران خاندانوں میں کي دو شاهزادیاں داخل هوئیں - ایک حسن‌خاں* میواتي کي دختر نیک اختر - دوسري - راجه بهارا مل† کچهواهه والي جےپور کي خوش سلیقه اور باتمیز بیٹي‡ - اسي راجه کے نسبت جهانگیر اپنے تزک§ میں کہتا هے " اول کسے که از راجپوتان کچهواهه شرف بندگي پدر من دریافت ؟ راجه بهارا مل بود - در راستي و درستي اخلاص و نسبت شجاعت از قوم خود امتیاز تمام داشت " -

---

* یهه خلاصةالتواریخ کي روایت هے - مآثرالامرا میں لکھا هے که حسین خاں میواتي کے چچا زاد بھائي جمال خاں نے اپني بیٹي اکبر کو خود آکر بیاه دي تهي - "جمال خاں عمزاده حسین خاں میواتي که از زمینداران معتبر هندوستان بود دو صبیه داشت - چوں بملازمت رسید کلاں را بادشاه در حبالۂ عقد خود آورده و دوم را به بیرام خاں تزویج نمود - (جلد اول - صفحه ٦٩٣) صبیه یعني دختر (غیاث)

† بهارا مل' بهاري مل اور پورن مل بهي کہلاتا تها - اس نے ٩٣٣ ه (سنه ١٥٢٧ ع) کے قریب بابر کے رو برو سر اطاعت خم کیا تها - اکبر سے بهي دوستانه اور خیرخواهانه مراسم و تعلقات تهے - مورخین لکھتے هیں که سب سے پہلے اسي نے اپني بیٹي کي شادی اکبر سے کر دی تهی (تاریخ هند از تهي لاواس صفحه ٩٨ - نیز دیگر تواریخ مندرجه بالا و ما بعد) بهارا مل اور اُس کا بیٹا بهگوان داس یکساں اعلی مراتب فوجي و ملکي پر پہونچ گئے تهے اور سلطنت کے مقرب و با رسوخ امیر تهے - مسٹر بیل راجه کا نام بهاری مل بتاتے هیں - اُمراے هنود (صفحه ٧٤) میں بهارا مل لکھا هے دربار اکبری (ص ٣٥٦) میں تحریر هے که راجه بهارا مل راجه ابتیر اُس وقت کچهواهه خاندان کا چراغ روشن کرنے والا تها -

‡ مریم زماني کہلاتي هے - اصلي نام کسي مورخ نے نہیں لکھا - مفتاح‌التواریخ (ص ٣٠٩) میں سلطانه رقیه بیگم تحریر هے ٩٦٩ ه (سنه ١٥٦١ ع) میں زینت بخش محلات هوئي تهي آگره میں اپنے بیٹے جهانگیر کے عهد میں سنه ١٠٣٢ ه (سنه ١٦٢٣ ع) میں وفات پائي - جهانگیر نے اُس کي قبر پر بهشت آباد سکندره میں' بیرون مقبره اکبر' گنبد و عمارت بنوائي جو "روضۂ مریم" کے نام سے مشهور هے - اِس میں پادریوں کا چهاپه خانه مدت سے هے (آگره هینڈبک از کین - صفحه ٣٨) -

§ صفحه ٧ نسخه مطبوعه قدیمه علي گڈهه -

شاہ نواز خاں* لکھتے ہیں کہ "در قصبہ سانگانیر راجہ بہارامل باکثرے از خویشاں بہ تقبیل بساط سرافراز گشتہ بانواع عواطف پایہ قدرش افزود راجہ از درست فکری و دور اندیشی خواست کہ خود را از زمرۂ زمینداران بر آوردہ در مخصوصان درگاہ بادشاہی انسلاک دہد خواہش نمود کہ صبیہ خود را داخل حرم سرا نماید - بادشاہ قبول فرمود - راجہ پسر انجام این نسبت دستوری بگرفت - و ہنگام معاودت در منزل سانبھر صبیہ عفت سرشت را بہ تزک تمام بدولت سرائے بادشاہی فرستاد و خود در منزل رتن با بھگونت داس پسر و کنور مان سنگھ پور او بشرف ملازمت اختصاص یافت"۔

[قصبہ سانگانیر میں راجہ بہارا مل اپنے بہت سے عزیز و اقارب کے ساتھ حاضر ہوا - اس کے ساتھ بڑی مہربانیاں کی گئیں عزت و مرتبہ بڑھا - راجہ نے عقل مندی اور دوراندیشی سے خواہش کی کہ زمینداروں کے طبقہ سے نکل کر بادشاہی لوگوں کے حلقہ میں آجاوں - بیٹی دینا چاہی - بادشاہ نے قبول کی - راجہ نے اس نسبت کی انجام دہی کے لیے اجازت پائی - واپس آکر سانبھر کے مقام پر پورے اہتمام و احتشام کے ساتھ لڑکی کو بادشاہ کے دولت‌خانہ بھیج دیا - اور لشکرگاہ رتن میں خود معہ بھگونت داس اپنے بیٹے اور کنور مان سنگھ پوتے کے حاضر ہوکر سلام و آداب بجالایا -]

نامور مورخ اسٹینلے لین پول کا بیان ہے کہ "سنہ ۱۵۶۲ع میں بھگوانداس کا باپ راجہ بہاری مل، والی امیر و مورث مہاراجگان حال جے پور بادشاہ کے حضور میں بجا آوری آداب کے لیے حاضر ہوا تو اُس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی اور اُس کی بیٹی کو جو بڑی عالی منش لڑکی تھی جہاں پناہ نے قبول فرمایا - وہ محل سرائے سلطانی کی خواتین میں داخل ہوئی - اکبر

---

* مآثرالامرا - جلد دوم - صفحہ ۱۱۳ -

اپني اعمام زاديوں ؟ رقيه و سليمه ؟ سے شادي کر چکا تھا مگر اس راجپوت شاهزادي کے ساتھه شادي کرنے سے ایک نئي مصلحت شناسي (پالسي) کا آغاز هوا - * ان کے بعد حسب ضرورت و مصلحت اکبر نے اور راجپوتنيوں سے بھي شادي کي - مثلاً راجه بيکانير کي لڑکي وغيرها - †

کون کهه سکتا هے که اس راے پر عمل کرنے میں دانشمند اکبر نے غلطي کي يا عجلت فرمائي - اُبھرنے والي قوموں اور جماعتوں کو اس قسم کے تعلقات بغير چارا نهيں هوتا - دنيا کي تاريخ بتاتي هے که میدان ترقي میں قدم رکھنے والے اور عروج پانے والے انسان؟ جن کي زبان پر "ملک خدا تنگ نيست؟ پاے مرا لنگ نيست" هوتا هے؟ اپني اولاد کو مختلط النسل هونے سے بچا نهيں سکتے - هندستان؟ کے سات کرور مسلمانوں میں کے بہت سے معزز اور محترم خاندان ایسے هي مسلمان و هندو یا ملکي و غير ملکي قرابتوں کي يادگار هيں - همارے زمانه کي وه هونهار جماعت جو اینگلو انڈین کهلاتي هے ؟ دو مختلف قوم اور رنگ کے انسانوں کے اتحاد کا نتيجه هے - اکبر کیا کرتا - "بابر جب هندستان آيا هے تو مسلمانوں کي حرم سرائیں هندستاني عورتوں سے بھري هوئي تھيں اور مسلمانوں کي ظاهري کثرت پر "دوغلے" يا "ادهه‌ذات" يا "دونسلا" هونے کا اطلاق هوتا تھا - ‡ "ملک و ملت کي پابنديان يا جماعتي خصوصيات مانع نه تھيں - اکبر کهلے کو "مغل؟ تھا جو عربي زبان میں "منگول؟ کو کهتے هيں - هندستان آکر يه لفظ اُس کے ليے يا اُس کے اُن بھائيوں کے ليے ره گيا تھا جو بابر کے اخلاف و اولاد تھے - يه شاخ يورپ میں بعض اوقات "بابری" کهلاتي هے -

---

* هندستان کي قرون وسطیٰ کي تاريخ - از استيفلے لين پول - صفحه ۲۵۱ -

† " " " " - صفحه ۲۵۷ -

‡ " " " " - صفحه ۱۸۹ -

بابر بھي "منکسخدیس" یا مختلطالنسل تھا یعني باپ کي طرف سے "ترک" اور ماں کي جانب سے "مغل" - وہ مُغل کے نام سے حد درجہ تنفر کرتا بلکہ چڑھتا تھا - *

سر ولیم سلي‌مین† لکھتے ھیں کہ میں نے مسلمانوں کو یہہ کہتے ھوئے سنا ھے کہ "ھندوستان میں ھماري سلطنت پر زوال اس وجہ سے آیا کہ ھمارے سلاطین کي رگوں میں راجپوتي خون باقي نہیں رھا تھا" - اس میں شبہہ نہیں کہ ھندستان کے راجپوتوں کے خون سے بہتر کوئي خون ھي نوع آدم کي رگوں میں موجزن نہیں رھا ھے - " یہہ وھي بات ھوگي اگر بالفاظ دیگر یہہ کہدیا جاوے کہ کوئي قوم خود یا جس کو اس سے سابقہ پڑتا ھے کسی خون کو اپنے سے بہتر نہیں مانتي - یہہ اختلاف محض تخیل پر مبني ھے اور تخیل کي قوت تمام اقوام نیز افراد میں یکساں دائر و سائر ھے - برٹن لوگوں کو دیکھہ لیجیے کہ اپنے خون کو دنیا میں سب سے اچھا سمجھتے رھے جب تک کہ رومن؟ اسکاٹ اور سیکسن لوگوں کے ھاتھہ سے مغلوب نہ ھوئے - سیکسن ڈین کہتے تھے کہ ھمارا خون دنیا بھر سے بہتر ھے - اُن نے اس زعم کو اور نارمن لوگوں نے توڑا - نسل انساني کي تاریخ یہي ھے -

مسٹر ونسنٹ اسمتھہ کا خیال اس بارہ میں یہ ھے :— ‡

"یہہ تو تسلیم ھو سکتا ھے کہ راجپوتي خون کے ملنے سے دھلي کے شاھي خاندان کي جسماني ترتیب ضرور سنبھل گئي تھي -

---

* - ھندوستان کے قرون وسطی کي تاریخ - از اسٹینلے لین پول - صفحہ ۱۹۷ -

† - سیاحت و تذکرے (ریمبلس ایلنڈري کلکشنس) - صفحہ ۳۲۱ -

‡ - ایضاً - صفحہ بالا -

لیکن دودمان تیمور کي شکست و زوال کو فرمانروا سلاطین کی رگوں سے راجپوتي خون کے رخصت هو جانے پر محمول یا منسوب کرنا هرگز صحیح نہیں هو سکتا - سلطنت تو اورنگ زیب کي وفات سے بہت پہلے رخصت هونا چاهتي تهي - حالانکه اورنگ‌زیب نے خود دو هندو بیبیاں بیاهي تهیں؟ اپنے بیٹے معظم (بہادر شاہ) کي شادي ایک هندو شاهزادي سے کي تهي اور یہي اس کے آبا و اجداد کا دستور تها -

لین پول نے بهي اپني "هندوستان کے مغل شہنشاهوں اور اُن کے سکوں کي تاریخ"* میں یہي لکها هے -

آزاد دهلوی دربار اکبری† میں دانایان فرنگ کا یہه قول نقل کرتے هیں "انسان کي طبیعت میں داخل هے که جس خون سے خود پیدا هوا هے اسي خون کي نسل پر وہ شوق کا جوش اور رغبت کا ولوله نہیں هوتا جو غیر خون پر هوتا هے - دیکهو خچر میں گهوڑے سے زیادہ زور هوتا هے -"

امرائے هنود‡ میں لکها هے "اکثر مورخین کي یہه رائے هے که مسلمانوں کا اپني مفتوح قوم کو امورات سلطنت میں دخیل کر کے محکومیت کے درجے سے بڑهانا اُن کي سلطنت کي تباهي و بربادی کا باعث هوا -"

اس بارہ خاص میں مسٹر ونسنٹ اسمتهه کا قول فیصل § هے - "یہه حیرت نہیں هے که سلطنت دهلي کو زوال آیا - حیرت تو یہه هے که وہ اتنے دن کیسے ٹهہری" -

---

* صفحه ۱۸ -
† صفحه ۷۸ -
‡ صفحه ۴۶ -
§ سیاحت و تذکرے (ازسلی مین) نوٹ صفحه ۴۲۱ -

اس موقع پر میں فرانس کے همه‌دان و همه‌گیر مصنف، مشہور مستشرق و فلسفي، نامور مورخ ڈاکٹر گستاولي بان کي رائے بھي پیش کر دینا چاھتا ھوں جو عربوں کے تنزل و زوال کے اسباب میں سے ایک قومي سبب اُن کا غیر اقوام کے ساتھہ میل جول اور شادي بیاہ بتاتے ھیں - فرماتے ھیں :— *

"ان مختلف اقوام.....ازدواج و امتزاج کي وجہ سے عربي خون کي خاصیت بہت جلد بدل گئي......"

"ایک ھي ملک میں مختلف اقوام کا گُھل مل جانا ھمیشہ تباھي کا باعث ھوتا ھے - تاریخ نے ثابت کر دیا ھے کہ.... حکومت کے قائم رکھنے کے لیے .....نہایت ضروري ھے.....کہ فاتح قوم مفتوح قوم سے ازدواج و امتزاج نہ کرے - عربیوں نے اس...کا کبھي خیال نہ کیا - رومیوں نے کچھہ دنوں اس کا خیال رکھا اور اُن کا تنزل اُسي دن سے شروع ھوا جس دن اُنھوں نے اس امر کا ملحوظ رکھنا چھوڑ دیا -"

"عرب برابر اُن اقوام سے جن کے ساتھہ رھتے رھے ازدواج و امتزاج کرتے رھے .....اس ازدواج و امتزاج سے اُن کے قومي خصائص کا تلف ھو جانا ایک لازمي امر تھا.. ...محض یہہ امتزاج اقوام .....اُن کے تنزل کے لیے کافي تھا -"

ان اقتباسات میں 'عربوں' کي جگہ آپ 'مغلوں' پڑھیں اور دیکھیں کہ کیا یہہ کلیہ حرف بہ حرف ماوراءالنہر کے نہیں ' ھندستان کے مغلوں پر صادق نہیں آتا - ان کے ملنے اور زوال کا باعث کیا ھوا - ؟ یہي غیر قوموں سے ازدواج و امتزاج ' نسلي خصوصیات کا مٹ جانا یا حکیمانہ زبان میں "فساد خون" -

---

* تمدن عرب - صفحات ۴۳۹ - ۵۲۰ - ۵۵۱ بالترتیب -

اسی مردم‌خیز، علم دوست سر زمین کے ایک دوسرے شرف نواز عالم موسیو سدیو کی مشہور "تاریخ عرب" سے واضح ھے کہ بنی‌اسرائیل کا طرز تمدن اور آئین معاشرت اس کا مانع تھا کہ مغلوب و فاتح اقوام کی عورتوں سے تناسلی اختلاط قائم کیا جائے* - اس بارہ میں یہود کی تاریخوں کو مطالعہ فرمایئے اور اُمت موسوی کے عروج و زوال سے سبق حاصل کیجئے -

فلسفہ تاریخ کا یہہ ایک سادہ مگر ضروری مسئلہ ھے جو حوالۂ قلم کر رہا ہوں - تاہم اندیشہ ھے کہ بعض نازک اور تفریح پسند دماغ اس دماغی ورزش کے متحمل نہ ہو سکیں گے - اس بحث سے سرگراں ہوں گے - مجھے معذرت کی ضرورت نہیں - تذکرہ و سیرت کو تاریخ سے وہی نسبت ھے جو افراد کو اقوام سے یا ارکان و افراد کو جماعت سے ہوتی ھے - شاہزادہ خسرو ایسے ہی ازدواج و امتزاج کا نتیجہ تھا - اس لیے یہ بحث یہاں ناگزیر تھی - ع - کر تو نمی پسندی معذور دار مارا -

باز آمد - سر ولیم کی روایت† ھے کہ یہہ جے پوری ملکہ بڑی دوراندیش و ہوش‌مند تھی - شوہر کے نزدیک اسکے مشوروں کی بڑی وقعت تھی - مسٹر ولسنٹ اسمتھ اس پر‡ اضافہ کرتے ھیں "کچھہ شبہہ نہیں کہ ہندستان کے باشندے زیر بار منت و احسان رہیں گے کہ اکبر کے عہد دراز میں اُن کو جو فلاح و رفاہ نصیب ہوئی وہ اسی انتہا درجہ کی پاکیزہ عورت کی بدولت تھی - اس کا اثر نہ صرف شوہر پر تھا بلکہ دوراندیش و مدبر وزرا بھی اس کے قابلانہ مشوروں اور صلاحوں سے متمتع و مستفید ہوتے تھے -

---

* صفحہ ۳۷۰ -

† سیاحت و تذکرے (ریمبلس اینڈ ری‌کلکشنس) - صفحہ ۳۲۹ -

‡ سیاحت و تذکرے (ریمبلس اینڈ ری‌کلکشنس) - صفحہ ۳۲۹ - نوٹ

حسب امید یہہ قرابت خوب پھلی پھولی - اس سے ایسی بہت سی شاخیں پھوٹیں جنہوں نے ہندستان میں مغلوں کی سلطنت کی بنیاد کم از کم ایک صدی آیندہ کے لیے راسخ کر دی - مغلوں نے محترم حرم میں آکر اس نیک نہاد رانی نے اپنا رنگ ڈھنگ نہیں بدلا تھا - لیکن اپنے تاجدار سرتاج اور اُس کی نسل کے لیے صفحۂ دہر پر بہت سے گہرے نقش اور نہ مٹنے والی یادگاریں چھوڑ گئی ہے - مورخین * اس کا نام بتانے سے قاصر ہیں تاریخ و آگاہی کی دنیا اُس کو "مریم زمانی" کے خطاب سے جانتی ہے - یہہ صحیح ہے کہ کچھہ دن تک اس کی آغوش بھی اولاد کی دولت سے خالی رہی - دو بچے † ہوے اور جاتے رہے - کبھی کبھی یہہ آرزو یا حسرت خود اکبر کو بھی بہت ستاتی تھی - وہ بارہا خدا کے مقبول اور برگزیدہ بندوں کی خدمت میں حاضر ہوا - قدمبوسی کی - نذریں دیں - التجائیں کیں - دعائیں کرائیں - مزارات پر جاروب کشی کی - مگر ہر بات کے لیے وقت مقرر ہے - ۹۷۶ھ (سنہ ۱۵۶۸ع) میں آگرہ کے قریب سیکری فتح پور ‡ کے

* بیاس اور ینل بیاگر فی کل ذکا نری - صفحہ ۱۷۲ -

† ہینڈ بک آگرہ و تاج از ہیویل - صفحہ ۱۰۸ -

‡ فتحپور سیکری ضلع آگرہ میں ایک مشہور مقام ہے - صاحب مآثرالامرا (جلد دوم - صفحہ ۵۵۳) لکھتا ہے کہ یہ جگہ پہلے بیانہ کے تعلق تھی - جب ہمایوں نے اس علاقہ میں رانا سانگا پر فتح پائی تو اظہار شکر میں شکری (شین کے ساتھہ) نام بدل دیا - جہانگیر کی پیدایش کے بعد ، اس جگہ کی مقبولیت اور خوبی و عظمت کا معتقد ہو کر اکبر نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا - شیخ کی درگاہ اور مسجد و شہرپناہ اور عظیم الشان رفیع و وسیع عمارات و محلات تعمیر کرائیں - آب و ہوا ناسازگار ثابت ہوئی - پورے طور پر آبادی کی نوبت کبھی نہیں پہونچی - یہ عمارتیں اب سیاحان عالم کی زیارتگاہ رہ گئی ہیں - خالی پڑی ہیں اور سرکار عالیہ برطانیہ کی توجہ اور نظر التفات سے اچھی حالت میں ہیں - تزک جہانگیر کے دیباچہ (صفحہ ۲) میں لکھا ہے کہ قصبہ سیکری اکبرآباد (آگرہ) سے بارہ کوس ہے

اللہ - اللہ ! کبھی اسی فتحپور کے گیت گائے جاتے تھے - شیخ فیضی وغیرہ غزلیں کہتے تھے

نسیم خوشدلی از فتحپور می آید - کہ بادشاہ من از راہ دور می آید

ایک مرتاض و خدا رسیدہ بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتی کی دعا کی برکت سے شجر مراد بار آور ہوا - قرار داد کے موافق* وضع حمل کے زمانہ

* تزک کا دیباچہ نگار (صفحہ ۴) لکھتا ہے کہ شیخ سلیم بڑے خدا پرست اور درویش تھے لوگ اُن کی مقبولیت دعا کے قائل تھے - اُن کا نسب نامہ سات واسطہ سے شیخ فرید شکر گنج تک پہونچتا تھا جو پنجاب میں پاک پٹن کی خاک میں آرام فرما رہے ہیں انہیں کے پوتے شیخ علاءالدین کو دربار جہانگیری سے اسلام خان خطاب عطا ہوا تھا - جو ۱۰۱۷ھ (سنہ ۱۶۰۸ع) میں گورنر بنگالہ مقرر ہوئے تھے - شیخ سلیم نے ۲۴ حج کئے تھے - وہ شیخ الاسلام لقب تھا - ۲۹ رمضان ۹۷۹ھ (۱۵ فروری سنہ ۱۵۷۴ع) کو رحلت فرمائی - باوجود اختلاف مذہب و عقائد اکثر مورخین نے اِن کی بڑی تعریف کی ہے شمس العلما آزاد دہلوی کی دربار اکبری (ص ۷۹۴) اور تزک جہانگیری کے انگریزی ترجمہ پر بورہم صاحب کا نوٹ (ص ۱۸) اور کرنیل نیویل کی تحریر (آگرہ میں تین دن - صفحات ۸۷ و ۸۸ و ۱۱۰) نیز مسٹر سٹینلے لین پول کی تاریخ (ص ۲۷۱) ملاحظہ طلب ہے -

شیخ سلیم نے دیار عرب میں مدتوں سیاحت کی تھی - وہاں "شیخ الہند" کے لقب سے مشہور و معروف تھے - ہندوستان واپس آئے تو موضع سیکری میں بالائے کوہ - آبادی سے متصل مسجد و خانقاہ بفواکر مجاہدہ و ریاضت میں مصروف ہو گئے - اِتفاق وقت یہ پیش آیا کہ اکبر کے (جو چودہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا تھا اور چودہ برس اور گزر چکے تھے یعنی اٹھائیس سال کی عمر ہو گئی تھی) - کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا - شیخ کے حالات سن کر اور دیکھ کر آرزوے مفرط ظاہر کی اور مدد و دعا کا طالب ہوا - شیخ نے اسکو تین بیٹوں کے پیدا ہونے کی بشارت دی - اسی زمانہ میں آثار حمل نمایاں ہوئے اور آپ کی کرامت و خوشخبری پوری ہوکر رہی - "شیخ ہندی" سے سال وفات (۹۷۹ھ) نکلتا ہے - (ماثرالامرا جلد دوم ۵۵۵ - و - دربار اکبری ص ۷۹۲) - سر ولیم سلی مین اپنی کتاب (کے صفحات ۳۲۲ لغایۃ ۳۲۴) میں شیخ سلیم کو بڑی تعظیم و ادب سے یاد کرتے اور لکھتے ہیں کہ اس "نہایت متبرک عمر رسیدہ بزرگ" کا سن اُسوقت چھیانوے سال کا تھا - مسٹر بوریم (اپنے نوٹ صفحہ ۷۱ میں) لکھتے ہیں کہ شیخ کی رحلت کے وقت جہانگیر دو برس سات مہینہ کا تھا - وہ بیل صاحب اور خزینۃالاصفیا (جلد اول ص ۴۳۵) کا حوالہ دیتے ہیں -

† آگرہ میں تین روز - از کرنیل نیویل - صفحہ ۸۸ -

کے قریب خوش نصیب هندو ملکه* اس مسلمان ولی کے دائرہ قدس میں بکمال عقیدت و اخلاص پهونچا دی گئی† - شیخ نے

*مسٹر بیورڈج کا خیال هے که جهانگیر کی ماں غالباً ایک مسلمان خاتون سلیمه سلطان بیگم تهی - جو همایوں کی بهن کی لڑکی اور بیرام خاں کی بیوہ تهی - مسٹر بیوریج همارے زمانه کے مستند اور محتاط تاریخ نویس گزرے هیں - مقبرل هیایںمدان و هیچ میرز اور اُن سے متعدد مباحث پر مراسلت رهی هے - مآثرالامرا کے انگریزی ترجمه میں موصوف نے میری ناچیز خدمات کا حواله دیا هے میں نے اُن کی تحقیق اور اُن کی رایوں کو اکثر صحیح اور قرین قیاس پایا هے مگر اس موقع پر یه عرض کرنا ناگزیر هے که اُن کو غالباً "سلیمه" اور "سلیم" دونوں ناموں کے التباس سے یهه غلط فهمی هوئی هے - ورنه فارسی کی تمام پرانی تاریخیں اسی جےپوری ملکه "مریم زمانی" کو جهانگیر کی ماں بتاتی هیں - سلیمه سلطان کے بطن سے اکبر کے صرف دو بچے هوئے تهے - ایک شاهزادہ خانم بیگم، دوسرا سلطان مراد - مسٹر ولیم بیل نے مفتاح التواریخ (ص ۹ . ۳) میں لکها هے که "ولادت جهانگیر از بطن سلطانه رکیه بیگم صبیه راجه بهاری مل بوقوع آمده" - ظاهر هے که یهاں خدیجةالزمانی رقیه سلطان بیگم سے مراد نهیں جو مرزا هندال کی بیٹی اور اکبر کی سب سے پهلی بیوی تهی (تاریخ هندوستان - جلد هفتم از شمس العلما مولوی ذکاءالله خان بهادر - ص ۳) قرینه چاهتا هے که "دیه رکیه" هندی کی "رکیه" هوگی یا کوئی اور بگڑا هوا نام هوگا - مسٹر ونسنٹ اِسمتهه بهی اشتباه ظاهر کرتے هیں - (نوٹ زیر تحریر سلی مین صاحب - ص ۴۳۰) - سر ولیم سلی مین "ملکه جودہ بائی" کو جهانگیر کی ماں بتاتے هیں (؟) (سیاحت نامه اور تذکرے صفحات ۴۲۳ و ۴۲۹ جلد اول مسٹر هیویل، هینڈ بک آگرہ و تاج (ص ۱۰۸) اور لفٹننٹ کرنیل نیویل' آگرہ میں تین دن، (ص ۲۹) اور خان بهادر سر محمد لطیف، سی - آئی - اِی، اپنی تاریخ آگرہ (انگریزی صفحه ۲۹) میں اسی "مریم زمانی" یا جودہ پوری شاهزادی کو جهانگیر کی ماں لکهتے هیں - پکٹورل آگرہ (آگرہ مصور - ص ۵) اور "آگرہ میں تین دن" صفحه ۸۸ اور ڈنکن صاحب کی مرسمه و مصحح هینڈ بک آگرہ، صفحه ۱۹ میں بهی یهی تحریر هے -

† دیباچه تزک - ص ۲ - خلاصةالتواریخ صفحه ۳۶۱ -

مغزل گاہ کے قریب* اس کے قیام و راحت کے شایاں مکان تعمیر ہوا جو اب تک موجود اور رنگ محل سے موسوم ہے - ۱۷ ربیع الاول† ۹۷۷ ھ ‡ (یکم ستمبر سنہ ۱۵۶۹ ع) کو بدھ کے دن شیخ کی چلہ گاہ کے نیچے وہ بچہ پیدا ہوا جس کے اِنتظار میں نہ صرف دودمان تیمور بلکہ سارے ھندستان کی آنکھیں بےچین و مضطرب تھیں - یہہ ھمایوں کا پوتا تھا - راجہ بہارا مل کچھواھہ کا نواسا؟

شاہ نواز خان بتاتے ھیں کہ ایسے موقعوں پر تغیر مکان اچھا شگون سمجھا جاتا ھے - (مآثر - ج ۲ ص ۵۵۴) -

اسي قسم کا ایک دوسرا واقعہ مآثرالامرا (جلد دوم - صفحہ ۷۳) میں مرقوم ھے جو اِسوقت یاد آ گیا -

شیخ ضیاء اللہ (شیخ محمد غوث گوالیاری کے پوتے) بڑے عالم و فاضل اور درویش قانع و کامل تھے - بادشاھی نوکری یا دربار کا تعلق پسند نہیں کیا - آگرہ میں سکونت اختیار کرلی تھي خانقاہ و خانقاہ تعمیر کرائي تھي - اکبرلاھور میں ھرنوں کي لڑائي دیکھہ رھا تھا کہ اسی ھرن کا سینگھہ اُس کے ایک نازک مقام پر لگ گیا - اس سے سخت تکلیف و اذیت تھي - اطراف و جوانب سے عمائد و اکابر عیادت کے لیے آئے مگر شیخ ضیاءالھند نے خبر نہ لي - بادشاہ نے ابوالفضل سے اسکا تذکرہ یا شکوہ کیا - ناچار بیچارے لاھور پہونچے - اتفاق وقت کہ شاھزادہ دانیال کي ایک حرم حاملہ تھي - بادشاہ نے فرمایا کہ وضع حمل کے وقت شیخ کے مکان پر پہونچا دي جائے - ھرچند شیخ صاحب نے عذر کیا - پزیرا نہ ھوا - اور اِس ضعیفہ کو وھاں لے آئے - شیخ کا نفس اِس بارہ میں سچا اور نفس الامري تھا - اُنہوں نے زندگي سے بیزار ھو کر ایک ھفتہ بعد جان دیدي -

* - مآثرالامرا - جلد دوم - صفحہ ۷۱ -

† - خلاصۃالتواریخ - ص ۳۶۱ - و تزک جہانگیري صفحہ اول -

‡ - میرے تزک کے نسخہ میں غلطي سے ۹۹۷ھ چھپا ھے - ملا عبدالحمید نے بادشاہ نامہ میں سنہ ۹۷۷ھ صحیح لکھا ھے -

راجه بهگوانداس کا بهانجا اور مان سنگهه کا پهوپهي زاد بهائي ان بزرگ * کے استقرار و ارشاد سے اُن هي کے نام نامي پر

---

* - شیخ سلیم چشتي کو تمام مورخوں نے ' مسلمان هوں یا هندو ' یا انگلو انڈین ' بڑی عظمت و توقیر سے یاد فرمایا اور اُن کي نفس‌سالي کشته نشیني رز خداداني و خدا پرستي کا سچے دل سے اعتراف کیا هے - مگر بعض ممتاز یوروپین اهل قلم ایسے بهي هیں جنهوں نے افسوس هے که اس ولادت کے بارہ میں ناپاک و ناشایسته خیال ظاهر کیے هیں - اِن کو نقل کرکے اپنے قلم کو گندہ کرنا کون پسند کریگا - جن حضرات کو ایسے جذبات تعصب و آلودگي سے بدمزہ هونا گوارا هو ' مسٹر ایچ جي کین ' سي - آئي - اي ' ایم اے کي آگرہ هینڈ بک صفحات ۸۰ و ۹۰) اور جنرل کاڈفری چارلس منڈی ' گورنر جرسي کا دو ساله سیاحت نامه هند (سنه ۱۸۲۷ و سنه ۱۸۲۸ع) موسوم به هندوستان کے قلم اور پنسل کے نقوش ' صفحه ۳۰) ملاحظه فرمائیں قلم اور تلوار کا دهني ' جنرل مس ند گمانی و کج افکاری کا الزام اوروں کے سر رکهه کر بظاهر اپني برأت مگر حقیقة دبی زبان سے اُن کی تائید کرتا هے - کسی تاریخ نویس کا نام نه لینے سے خود اُس کے دل کا چور نهل جاتا هے - شاید ' وطن سے دور ' مگر وطن کی محبت سے چور ' دور اندیش منڈی کا دهیان باهر کے کسی عالیشان قصر و ایوان کی جانب کیا هوگا - ورنه بدتهذیب هندوستان تو شایستگی و تمدن کی ان برکتوں سے آج بهی محروم هے - اس هفت سرشت سر زمین کی تاریکی اور یهاں والوں کی کوته نظری جو چار سو برس پهلے رهی هو گی ' وهي هے - میں یقین نهیں کر سکتا که کوئی باهوش ذی فہم شخص حقیقة شیخ سلیم کو "جهانگیر کا حقیقی باپ" سمجهتا یا باور کرتا هو گا لیکن اگر کوئي ایسا نابینائے مادر زاد مورخ هو تو یاد رکهے که ترانوے بورانوے برس کے بوڑهے کے اولاد ' اگر هو سکتي هے تو خالص روحاني قوت سے هو سکتي هے - انسان کے ظاهري قوا اس عمر میں معطل اور ازکار رفته هو جاتے هیں - ایسے پیر فاني کو جوان ' اور اپني جواني کي قدردان ' راجپوت خون والي ' هندوستان بهر کي ملکه ' سوائے ادب و عظمت ' احترام و عقیدت کے اور کس نگاہ سے دیکهے گي -

مسٹر ونسنٹ اسمتهه اپنے نوٹ (مندرجه سیاحت نامه ' تذکرہ سلي بن صاحب - حصه اول -- صفحه ۲۳۲) میں بجا لکهتے هیں "مسٹر کین کي هینڈ بک اگرچه ایک فاضل شخص کي تالیف هے ' پهر بهي وہ گائیڈ بک هے - همیشه صحیح اور ٹهیک نهیں

مرزا سلیم * نام رکھا گیا -

یمن و برکت کے لیے حضرت شیخ نے اپنی بیٹی سے دودھ† پلوایا - اکبر نے خوشي خوشي اپني سب منتیں پوری کیں - حتی کہ سلطان الہند خواجہ اجمیر کے مزار پر انوار پر پیادہ پا ‡ گیا اور وہ تمام بندگانہ اور حقیر

ہو سکتی البتہ اس قسم کی جیسی کتابیں معمولاً ہوتی ہیں اُن سے زیادہ معلومات لی ہے "

میں آگاہ ہوں کہ با خبر انگریز و سیاح اس کتاب کی "اتنی ہی" وقعت فرماتے ہیں - مگر اسکا کیا علاج ہے کہ ایسی ہی کتابیں عوام کے ہاتھوں میں جاتی اور بجائے کائید اور رہنما ہونے کے لوگوں کی گمراہی اور غلطی میں پڑنے کا ذریعہ ہوتی ہیں

* خلاصۃالتواریخ قلمی صفحہ ۳۶۱ - تزک جہانگیری صفحہ اول - سیاحت نامہ سلیمین ص ۳۲۳

جہانگیر لکھتا ہے کہ قیاصرہ روم (سلاطین ترک) میں بھی سلیم نام کا ایک بادشاہ تھا اس لیے اشتباہ سے بچنے کے لئے یہ فرق کر دیا گیا تھا - تزک میں لکھا ہے کہ شاہزادہ کا نام "سلطان سلیم" رکھا گیا تھا (صفحہ اول) -

† دربار اکبری - صفحہ ۷۹۳

‡ شاید ہمارے زمانہ کے نازک طبع و نفیس مزاج لوگوں کو اس کے متعلق کچھہ تامل ہو، اس لئے کسی قدر صراحت کر دینا ضروری ہے -

طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ "بادشاہ جمعہ کے دن ۱۲ شعبان ۹۷۷ ھ (۲۰ جنوری سنہ ۱۵۷۰ ع) کو آگرہ سے اجمیر پیادہ پا روانہ ہوا - روزانہ سات آٹھہ کوس طے کرتا تھا" (اس کو ڈوسن صاحب نے بھی ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہندستان، جلد پنجم میں صفحہ ۳۳۳ پر نقل کیا ہے) سر ولیم سلیمین کہتے ہیں کہ "وہ ہر روز تین کوس چلتا تھا" (سیاحت نامہ اور تذکرے - صفحہ ۳۲۳) -

کوس کی مسافت عموماً مختلف پائی جاتی ہے صوبہ جات متحدہ میں دو میل کے برابر سمجھا جاتا ہے - ممالک مغربی و شمالی کے گزیٹیر (صفحہ ۵٦٨) کے مطابق آگرہ کا کوس بقدر پونے دو میل کے ہوتا ہے - اس لیے تین کوس کے صرف سوا پانچ میل ہوئے - مگر مسٹر ونسنٹ اسمتھہ (زیر تحریر سلیمین) تائید کرتے ہیں کہ طبقات اکبری کا لکھنا بلا شبہہ بالکل صحیح و درست ہے - اکبر غایت درجہ مستعد و جفا کش تھا - اس کے لیے چودہ میل روزانہ چلنا کچھہ مشکل نہ تھا - وہ کچھہ دن

کام انجام دیے جن کی ایسی جلیل القدر هستی سے توقع نهیں کی جاتی تهی - اولاد سے محبت کرنا انسانی فطرت کا خاصه هے مگر سلیم کے ساتهه اکبر کی اُلفت عشق و جنون کی حد تک پهونچی هوئی تهی - جهانگیر لکهتا هے * که میرے باپ نے نه کبهی حالت مستی' نه کبهی هوشیاری میں' میرا نام بهول کر بهی نهیں لیا - محمد سلیم یا سلطان سلیم کهه کر کبهی نهیں پکارا ' بلکه وفور شفقت سے همیشه " شیخو بابا " یا " شیخو جی† " هی کها کرتا تها - خیال رهے که تیموری خاندان کے ارکان (بادشاه اور ولی عهد کو چهوڑ کر) معموماً " سلطان " کهے جاتے تهے - حتی که مجازاً ‡ ایک کو بهی " سلاطین " کهه دیتے تهے اگرچه لفظاً جمع کا صیغه هے -

خافی خان § راوی هیں که شفیق باپ نے ولیعهد مقرر کیا تو " شاهنشاه " کا خطاب عطا کیا اور جمله $ لوازمات بادشاهی و اسباب و سامان سلطانی مرحمت فرمائے - قلعه آگره ¶ کے دیوان خاص میں تخت سنگ سیاه پر جو قطعه تاریخ ١٠١١ ھ (١٦٣٠ع) کا منقوش هے' اس اعلان کی تجدید یا مکرر تصدیق کی یادگار هے -

---

اجمیر میں ٹهہرا - رمضان کے مهینے میں دهلی پهونچا - پهر سفر ٧ فروری سے ٨ مارچ تک رها - اکبر ضرور وسط فروری کے قریب اجمیر پهونچا هوگا - اس حساب سے اس نے تقریباً تین ماه پیاده روی میں گزارے تهے -

* تزک جهانگیری صفحه اول -

† دربار اکبری - صفحه ٧٩٣ -

‡ دربار اکبری - نوٹ - صفحه ١٠٠ -

§ منتخب اللباب خافی خان - حصه اول - صفحه ٢٣٠ -

$ دربار اکبری - صفحه ٩٣ -

¶ مغل یمپایر از کین صاحب - صفحه ١١٦ - و آگره هینڈ بک - صفحه ٣ -

تاج و تخت پانے کے بعد شاہانہ آداب و معمول پر کار فرما ہوکر سلیم نے اپنا نام و لقب* "ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی" رکھا اور اس دارفانی سے انتقال کے بعد جنت مکانی کہلایا ۔ مغلوں کی شاخ میں جہانگیر ہندستان کا چوتھا شاہنشاہ تھا ۔

---

* تزک جہانگیری ص ۲ - و - دیباچہ تزک ص ۲ -

قومي سیرت کي تشکیل

(از خواجہ غلام السیدین ایم - اے - ڈی)

هندستانیوں کي قومی سیرت سے بحث کرنا اور اِس کی تشکیل اور تربیت کے مسئلہ کو حل کرنا ایک مشکل اور ذمہ داري کا کم ھے - کیونکہ صحیح معنوں میں کسي جماعت کی ذهنیت اور سیرت سے اسی وقت بحث کي جا سکتی ھے جب وہ اِس درجہ منتظم هو گئی هو کہ اِس کو ایک "قوم" کہا جا سکے - قوم کا لفظ بجاے خود بے شمار اختلافات کا مرکز رها هے اور صاحبان فکر نے اِس کے لیے مختلف معیار اور شرائط قرار دیے هیں - اور اپنے اپنے معیار کے مطابق بعض جماعتوں کو قومیت کے حقوق سے محروم رکھا ھے اور بعض کي قومیت کو تسلیم کیا ھے - مثلاً پروفیسر ریمزے میور (Ramsay Muir) نے جو انگریزي مورخین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے هیں اپنی کتاب "قومیت اور بین الاقوامیت" میں قومیت کے لیے سات شرطیں بتائی هیں جن میں سے پہلي چھہ لازم نہیں هیں لیکن ساتویں لازم ھے - اِن شرائط میں مندرجہ ذیل امور شامل هیں - "کسي خاص جغرافی علاقہ کی سکونت - اتحاد نسل - اتحاد زبان - اتحاد مذهب - ایک کافی عرصہ تک کسي مستحکم اور منتظم سلطنت کا قیام - اقتصادي مفاد کا اشتراک جس سے مشاغل اور افکار میں یگانگت پیدا هوتی ھے اور سب سے زیادہ یہہ کہ اِس قوم کے افراد کي مشترک روایات هوں جو دُکھہ درد سب نے مل جل کر جھیلے هوں اور کامیابیاں حاصل کي هوں اِن کی یاد جو افسانوں اور راگوں میں ، اِن بڑے بڑے آدمیوں کے محبوب ناموں میں جنھوں نے گویا تمام قوم کي سیرت اور نصب العین کو اپني ذات میں جمع کر کے دکھا دیا ، اور اِن مقدس مقاموں کے نام میں محفوظ هوں جن میں قومي

یادگاریں دفن ھیں "۔ پروفیسر موصوف کے بیان میں یہ بات قابل غور ھے کہ وہ ابتدائي شرائط میں سے کسي کو قومیت کے لیے لازم قرار نہیں دیتے ۔ بلکہ اِس کو ایک نفسی اور ذھني امر سمجھتے ھیں جس کا تعلق صرف خارجي اسباب، یعنی مذھب، نسل اور زبان وغیرہ کے اتحاد پر نہیں بلکہ قوم کي سیرت، افراد کے باھمی تعلق اور نفسی نظام پر ھے - میرے خیال میں انسان کي کوئي جماعت قوم اُس وقت بنتي ھے جب اس میں دماغي اتحاد اور یک جہتي ہو، جب ایک ھي آب وھوا اور سیاسي اور معاشرتی ماحول میں رھتے رھتے ان کے نقطہ نظر اور فلسفۂ زندگي میں ایک حد تک یکسانیت اور یک‌رنگي پیدا ھو گئي ھو ۔ میرا یہہ مطلب نہیں کہ اِس کے افراد میں اختلاف طبائع اور انفرادیت نہ رھے اور وہ سب ایک دوسرے کی نقل بن کر رہ جائیں ۔ لیکن یہ ضرور ھے کہ اِس اختلاف طبائع میں، جو بجائے خود ترقي اور تنوع کي بنیاد ھے، ایک وحدت کا رنگ پایا جائے اور جو کچھہ اختلافات ھوں وہ قومي سیرت کے بنیادي اصولوں پر قائم اور انھیں کا اظہار ھوں - ان کے خیالات اور فکر کی دنیا میں جو کچھہ قیمتي اور دیرپا پیداوار ھو یعني اُن کا ادب، اُن کا فلسفہ، اُن کا آرٹ، ان کی تہذیب، اور ان کا نظام قدور، اس کا اثر اور رنگ تمام افراد کي زندگي میں کم و بیش نمایاں ھو - یہ ممکن ھے کہ خود اس قوم کے افراد کو ایک دوسرے میں یہ مشابہت اور دماغي اتحاد نظر نہ آئے لیکن ایک طرف تو اس یک جہتی کا احساس ضروري ھے کہ "ھم ایک دوسرے کے اعضا ھیں" اور دوسري طرف دیگر اقوام کے مقابلے میں ان میں ایسي شخصیت اور خصوصیات پائي جائیں جو ان کو تمدني اور ذھني اعتبار سے ممتاز کریں - مثلاً ایک ھندستاني یورپ یا امریکہ یا چین یا عرب میں صاف طور پر پہچان لیا جائے نہ بوجہ شکل اور رنگ کے اختلافات کے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپني ذات میں بعض خاص

قدور کا حامل ہے جو اس ترکیب اور تناسب سے اور کسی ملک کے باشندے میں نہیں پائی جاتیں - کسی خاص شخص میں ان صفات کا بہت زیادہ نمایاں ہونا یا نہ ہونا اُس کی ذاتی طبیعت اور تربیت پر منحصر ہے لیکن جب قوم بحیثیت ایک منتظم جماعت کے کسی مسئلہ پر غور کرے ' یا کسی معاملہ میں قدم اُٹھائے تو یہ خصوصیات اپنا اثر ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں - اس کی ایک عمدہ مثال انگریزوں کی قوم ہے جن میں قومی سیرت کی خصوصیتیں اس قدر نمایاں ہیں کہ ایک باخبر آدمی بالعموم تھوڑے سے تجربہ کے بعد بتا سکتا ہے کہ فلاں شخص انگریز ہے - امریکن یا جرمن یا روسی نہیں - مجھے یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ انگریزوں کی یا کسی قوم کی مخصوص سیرت بجائے خود قابل تعریف ہے یا نہیں - اور قومی خصوصیات کا اس قدر نمایاں ہونا کہ کوئی فرد یا قوم وسیع‌تر انسانی حقوق اور ہمدردی کو فراموش کردے اچھی بات ہے یا بری - اس جگہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی بڑی انسانی جماعت کی سیرت یا ذہنیت کی صحیح تصویر اسی وقت کھینچی جا سکتی ہے جب وہ جماعت اشتراک مقاصد اور قدور کی وجہ سے ایک "قوم" بن جائے -

اس لئے قومی سیرت سے بحث کرنے سے قبل ' ہمارا فرض یہہ ہے کہ ہم یہہ دریافت کریں کہ ہندستانی ایک "قوم" ہیں یا نہیں - آیا ان تینتیس کروڑ بندگان خدا میں جو اس زبردست بر اعظم میں زندگی بسر کر سکتے ہیں ' اغراض و مقاصد کا وہ اتحاد اور زندگی کے نظام اور جذبات کی دنیا میں وہ ہم‌آہنگی پائی جاتی ہے یا نہیں جو انہیں قوم کے خطاب کا مستحق بنا سکتی ہے - آیا حیات انسانی کی بعض قدور ایسی ہیں جن کو انہوں نے مدتوں سے عزیز اور محترم سمجھا ہے اور جن کا اثر براہ راست یا بالواسطہ ان کی زندگی پر ہوتا

رہا ہے - یا یہ شمار انسانوں کی آبادی محض بہت سے مختلف خیال اور مختلف مقاصد گروہوں اور جماعتوں پر مشتمل ہے جو بعض اتفاقات کی وجہ سے ایک ہی جغرافی ماحول میں جمع ہو گئے ہیں اور برخلاف ان مختلف جانوروں کے گروہوں کے جو اپنی صلح پسندی اور رواداری کی وجہ سے "خوش باش گھرانے" کہلاتے ہیں یا فطرتاً ایک دوسرے کے ساتھہ جنگ و جدال اور کشمکش کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ؟

(۲)

مختصر یہہ کہ ہندستانیوں میں کوئی مخصوص قومی سیرت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ان کی قومی خصوصیات کیا ہیں جو ان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں ؟ ان کی ذہنیت میں کون سی ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام کے پیچھے رہ گئے ہیں؟ اور کون سے ایسے امکانات ہیں جن کی صحیح تربیت سے ان کی خفتہ قوتیں بیدار اور مردہ ہمتیں زندہ ہو سکتی ہیں ؟ میرے خیال میں یہہ کہنا غلط ہے کہ ہندستانی ایک قوم نہیں ہیں - کیونکہ یہہ دعوی ان کی ارتقائی تاریخ کے سکھائے ہوئے سبق کو نظر انداز کرتا ہے - ہندستان میں، اور ہندستانیوں میں خود کو ڈھالنے کی، واقعات اور حالات زمانہ کے ساتھہ مطابق اور ہم‌آہنگ بنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے - ہندستان نے ان تمام قوموں اور تہذیبوں کو یکے بعد دیگرے ضم کر لیا جو دور دراز کے مختلف ملکوں سے اِس کی مہمان نوازی کی تلاش میں یہاں پہونچیں اُس نے آریوں کو اپنے قدیم باشندوں کے ساتھہ با وجود اِن کی ذات پات کی تمیز کے، اِس طرح ملا جلا دیا کہ ایک نیا اِنسانی ٹائپ دنیا کی تاریخ میں نمودار ہوا - اِس کے بعد اور جو حملہ‌آور وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے وہ بھی فاتح بننے کے بعد اِس کے حلقہ بگوش غلام ہوکر رہ گئے - ہزار برس گزرے ایک بالکل مختلف نسل اور مذہب کے

لوگوں نے عرب اور ایران اور ترکستان وغیرہ سے آ کر یہاں ڈیرہ جمایا اور وہ بھی باوجود اختلاف طبائع اور اختلاف مذہب کے هندستانی بن گئے - بعض اُن کی ابتداءی طبیعت اور نقطۂ نظر پر ایک اور رنگ چڑھ گیا جو هندستان کے ساتھہ مخصوص تھا - اُن کی طرز معاشرت اُن کے فلسفۂ زندگی ، اُن کے ادب اور آرٹ بلکہ اُن کے مذهب تک پر یہاں کا گہرا اثر پڑا - اور وہ باوجود اپنی وسیع‌تر همدردی اور اسلامی رشتۂ اخوت کے ، باوجود اصولاً "هر ملک ملک ماست کہ ملک خداے ماست" کے قائل هونے کے ، ایسے هی صحیح معنوں میں هندستانی بن گئے جیسے وہ آریا جو اُن سے هزاروں برس پیشتر آئے تھے - جو لوگ اِس بات کے منکر هیں وہ تاریخ اور واقعات پر خاک ڈالتے هیں - اور سطحی اختلافات اور عارضی اثرات کے پردے میں اصل حقیقت کو نہیں دیکھہ سکتے -

اِن دونوں مختلف اور زبردست نسلوں اور تہذیبوں کے ملنے سے جو تہذیب اور ذهنیت پیدا هوءی اِس کو موجودہ زمانے کی هندستانی تہذیب اور ذهنیت کہہ سکتے هیں ، جیسا کہ آگے چل کر بتاؤں‌گا ، اِس میں بعض ایسے خارجی اثرات داخل هوئے هیں جنھوں نے توازن کو متزلزل کر دیا هے اور جن کی وجہ سے تبدیلی اور اِنقلاب کی گرد میں آج کل هندستانی ذهنیت کا اصلی چہرہ دکھائی نہیں دیتا - مگر بہر حال هندستان کی جو کچھہ تہذیب اور دماغی کارنامے اب موجود هیں وہ نہ هندوؤں کی تنہا جد و جہد کا نتیجہ هیں نہ محض مسلمانوں کا عطیہ - وہ اِن دونوں کے باهمی اشتراک عمل اور تاثر پذیری کا ثمر هیں - نہیں بلکہ اس زبردست رو میں ان بےشمار چھوٹی چھوٹی ندیوں کا قابل قدر خراج بھی شامل هے جن کا آغاز ان دونوں تہذیبوں کے علاوہ اور کسی سرچشمہ سے هوا هے - مثلاً بدھہ مت کا فلسفہ زندگی ، جینیوں کا احترام حیات ، یونانیوں کی صنعت اور سپاهگری ، آریوں کا سیاسی اور معاشرتی نظم و نسق - ابتدائی باشندوں

اور خصوصاً دراوڑوں کی دستکاری اور منتظم قبیلہ دار زندگی - اور پھر یہہ چھوٹے چھوٹے الفاظ "ہندو تہذیب" اور "مسلمان تہذیب" خود کیسے کیسے زبردست اور متنوع اثرات اور کارناموں کے حاصل ہیں! اِن میں اِنساني ارتقاء کے تاریخ کے کیا کیا شگوفے اور اِنسان کے هاتهه اور تخیل کی کیا کیا گلکاریاں نہیں بھري ہیں! "ہندو تہذیب" کا ذکر ہمارے خیال کو ایک ایسے شاداب اور متنوع باغ کی سیر کراتا ھے جس میں ایک طرف ویدوں کے زمانہ کي سیدھي' سادھي لیکن خوش باش زندگي کا نظارہ دکھاءي دیتا ھے رامائن اور مہابھارت کے معرکے ہیں اور اِن کے ساتھہ اِنساني جدو جهد کا وہ فلسفہ جو بھگوت گیتا کے صفحات میں بھرا ہوا ھے - دوسري طرف ہندوؤں کے دور عروج کي وہ بھري محفلیں جن پر وکرماجیت صدارت کرتے تھے اور اِن کے نورتن اپني خیال آفرینوں اور بذلہ سنجیوں سے تمام در بار بلکہ تمام ملک میں علم و ذوق کي شمع روشن رکھتے تھے - اسي باغ میں کہیں کالیداس کے ڈرامے ہو رھے ہیں کہیں تان سین کي موسیقي دنیا کو رقص میں تحلیل کر رھي ھے - اِس میں راجپوتي شجاعت کي داستانیں بھي مدفون ہیں - مدفون نہیں پوشیدہ ہیں اِس طرح جیسے ستار کے تاروں میں موسیقي جو مضراب کا انتظار کرتي رهتي ھے! اور وہ تمام علوم و فنون اور دستکاریاں جو اِس تہذیب کا پھل تھیں لیکن اِس کے ساتھہ مردہ نہیں ہوئیں ...... میرا یہہ مطلب نہیں کہ اِس تہذیب میں خامیاں نہیں تھیں - تھیں اور بہت زبردست تھیں - اِس میں اخوت مساوات اور معاشرتي عدل کي کمي تھي - جماعتوں کي اٹل تقسیم افراد کي قوتوں کو دبائے ہوءے تھي - برھمنوں نے اپنے اقتدار اور قوت کو مستقل بنانے کے لیے مذھب کو چند رسوم میں تبدیل کر دیا تھا اور خود اِنسان اور اِس کے بنانے والے کے درمیان حائل ہو گئے تھے - لیکن باوجود اِن تمام خرابیوں کے کس قدر قابل قدر تھا وہ تمدن؟ (اور ھے

وہ تحفہ) جو "ہندو تہذیب" نے ہندوستان کی "تہذیب نو" کی خدمت میں پیش کیا تا کہ وہ اِس کے اچھے عناصر دو اپنے میں جذب کر کے انسانی زندگی کا ایک حسین‌تر مرقع بنائے -

اور پھر "اِسلامی تہذیب" کا پُر سحر لفظ جو آپ کے چشم زدن میں عرب کے صحراؤں، ایران کے مرغزاروں، وسط ایشیا کی مہیب گھاٹیوں اور روم اور فانس اور اٹلی اور ہسپانیہ کی خوبصورت وادیوں کو تخیل کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے - اِس کی قائم کردہ جماعتوں میں خدا کی خدائی کا سکہ جما ہوا ہے - اور سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں کیونکہ خدا سب کا ایک ہے اور اُس کی مشیت سب پر یکساں طریقے سے حاوی ہے - اِس میں جماعتوں اور فرقوں اور قبیلوں میں، امیر اور غریب میں، کالوں اور گوروں میں سب میں مساوات ہے - خدا اور انسان دونوں کی نظر میں سب کے حقوق برابر ہیں - سب کو ایک سے مواقع حاصل ہیں - سب کا رشتہ براہ راست اپنے خالق سے ملا ہوا ہے - اس میں جہاں ایک طرف علم و ادب کا چرچا اور ہمت افزائی ہے وہاں دوسری طرف عملیت اور جہاں‌گیری اور جہاں‌رانی کی قابلیت ہے - اس میں جوش اور ولولہ اور خواہش عمل ہے جو دنیا کو اور فطرت کی بے چین اور رام نہ ہونے والی قوتوں کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں - میں پھر یہہ نہیں کہتا کہ یہہ شگفتگی اور شباب اسلامی تہذیب میں ہمیشہ قائم رہا یا جب یہہ تہذیب ہندستان پہنچی تو اس میں یہہ سب چیزیں موجود تھیں - نہیں اس میں سے بعض چیزیں زائل یا کمزور ہو چکی تھیں - شخصی قوت اور استبداد کو سوسائٹی کے مفاد اور افراد کی آزادی پر ترجیح دی جاتی تھی - روح مذہب کے بجائے الفاظ کا زیادہ احترام ہونے لگا تھا - لیکن باوجود ان نقائص کے اس تہذیب کے تصادم نے ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک دی - کیونکہ اس کی تہذیب بجائے متحرک اور

جاندار ہونے کے ساتھ اور جامد ہو چلی تھی اور اس کے اعضا میں سستی پیدا ہو گئی تھی - اس نے سیاست اور معاشرت اور مذہب میں نئے معیاروں اور نئے قدروں کو ہندستان کی خدمت میں پیش کیا تا کہ وہ ان کی مدد سے اس نئی قومی سیرت اور قومی تہذیب کی تشکیل کرے جو ہماری امیدوں کی جولاں گاہ ہے -

اِس لیے ہندوستان میں جو لوگ اس وقت آباد ہیں ان کی زندگی اور تہذیب کی جڑیں زمانہ ماضی میں بہت دور تک چلی گئی ہیں - ان کی تربیت ان روایات میں ہوئی ہے جو علم و فن، ادب و فلسفہ، سیاست و مذہب سے مالا مال ہیں - وہ اس ماضی کے بوجھ سے، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتے - ہم اہل امریکہ کی طرح نہیں جو ماضی کی روایتوں سے آزاد اپنے لئے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنا سکتے ہیں - ان کی ہدایت اور ہمت افزائی کے لیے کوئی گہرے اور دیر پا چشمے ایسے نہیں جن سے ان کو ہمیشہ استقلال اور آئندہ کے لیے امداد حاصل ہوتی رہے - ہماری جو نئی نسل دنیا میں آتی ہے اس کو ایک نظام تمدن، ایک معیار قدور، ایک فلسفۂ زندگی اپنے چاروں طرف نظر آتا ہے جو اس کو مخصوص طریقے سے متاثر کرتا اور اپنے قالب میں ڈھالتا ہے - ہر بچہ اس کو اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے اور ہوا کے ساتھ ساتھ اس میں بھی سانس لیتا ہے - اس لیے باوجود ان اختلافات کے جو ہندستانیوں میں، مختلف صوبوں اور مذہبوں اور نسلوں کے متعلق ہونے کی وجہ سے پائے جاتے ہیں "وہ ہندستانی" تہذیب و تمدن کے رنگ کو قبول کرتا ہے اور جب بلوغ کو پہنچتا ہے تو اس کی سیرت ایک مخصوص شکل اختیار کر لیتی ہے جو بعض نمایاں لحاظ سے مختلف ہوتی ہے - یہہ سوال آگے چل کر پیدا ہوگا کہ یہہ سیرت کس حد تک قابل تعریف ہے - یہاں صرف یہہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہہ سیرت مختلف ہوتی ہے -

اس ہندوستانی تہذیب نے اپنے دوسرے دور عروج یعنی مغلوں کے زمانہ میں (جو ہم سے قریب تر ہے اور اسی وجہ سے اس کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں) مادی اور علمی کارناموں کی جو تاریخ چھوڑی ہے وہ ہر طرح قابل فخر ہے - میں ہرگز یہہ نہیں چاہتا کہ دور ماضی کو "عہد زریں" بناکر دکھاؤں، نہ میری بعض وطن پرستوں کی طرح یہہ خواہش ہے کہ اپنے ملک کی ہر چیز کو اچھا اور مکمل بنا کر پیش کروں - صداقت کا مطالبہ اٹل ہے اور وہ حب وطن اور اظہار ہمدردی وغیرہ سب کے مطالبوں پر بھاری ہے - لیکن اس دور کے کارناموں کا ذکر کرنے سے میرا مقصد یہہ ہے کہ ہماری موجودہ ذہنیت کے تاریخی ارتقا اور پس منظر پر روشنی پڑے مغلوں کے عروج کے زمانے میں ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت کے تعاون نے جو ہندوستانی ذہنیت پیدا کی اس کا اظہار مادی زندگی میں اس خوش حالی کی صورت میں ہوا جو عام لوگوں کو اِس وقت کے مقابلہ میں، یقیناً حاصل تھی - ان بے نظیر عمارتوں میں ہوا جو ہندوستان میں شمال سے جنوب تک، اور مشرق سے مغرب تک موتیوں کی طرح ٹکی ہوئی ہے اور جن کا شاہ کار اور سرتاج، تاج محل ہے جس میں ایک نہایت اور زبردست اور حسن شناس قوم کی تخلیقی قوتوں نے اپنا انتہائے کمال دکھایا ہے - اور ان مفاد عامہ کے انتظامات میں ہوا جنہوں نے شہروں اور دیہات کی زندگی کو متمدن اور دور دراز کے سفروں کو آرام دہ بنا دیا تھا، تہذیب و تمدن کی ترقی کے ان لوازمات میں ہوا جو خوراک، لباس، طرز بود و باش، گفتگو اور آداب مجلس میں نئی نئی ایجادات کی شکل میں نمودار ہوئے - فنون لطیفہ اور صنعت و حرفت خصوصاً انتہائی باریکی رکھنے والی دستکاریوں میں انہوں نے جو کام کیا وہ اب بھی مبصرین اور ماہرین فن سے خراج تحسین وصول کرتا ہے - علم و فکر کی جد و جہد برابر جاری رہی - اور اگرچہ سائنس میں

انہوں نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی کیوں کہ اس کے لیے ابھی اسباب بھی پیدا نہیں ہوئے تھے، جیسے اس کے کچھہ ھی بعد یورپ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ادب اخلاق اور فلسفہ، مذہب اور تصوف، تاریخ اور سیرت نگاری کے میدان میں انہوں نے قابل قدر تصانیف چھوڑیں - ان کا ادب فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں ساتھہ ساتھہ ترقی کر رہا تھا - اور اس میں کوئی مخاصمت پیدا نہیں ہوئی تھی - سیاست مدن اور انتظام سلطنت میں انہوں نے بہت زبردست ترقی کی - کیوں کہ ہندستان جیسی وسیع مملکت کو ایک حکومت کے ماتحت لاکر اس کا یہہ نظم و نسق کرنا بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی - غرض یہہ خیال کرنا کہ حکومت برطانیہ کے اقتدار سے قبل ہندستان ایک نیم وحشی، نیم مہذب حالت میں تھا، اور اس کی تمام گذشتہ تاریخ اور کارناموں کو محض موجودہ عہد کی تمہید سمجھنا ایک سخت غلطی اور ظلم ھے - یہہ غلطی تاریخی اعتبار سے اس نوعیت کی ھے اور صداقت کے اعتبار سے اس سے بدتر جو کہ مسٹر ایچ - جی - ولز نے اپنی "تاریخ عالم" میں کی ھے یعنی یہہ کہ ابتدائے آفرینش انسان سے تماشاگاہ عالم میں جو تماشا ہوتا رہا ھے وہ محض اسی لیے تھا کہ اس کا تتمہ اور کمال عروج "مجلس اقوام" کی شکل میں ظاہر ہو -

(۳)

لیکن تہذیبیں بھی افراد کی طرح پیدا ہوتی ہیں، نشو و نما پاتی ہیں، اور اپنا پورا عروج حاصل کرنے کے بعد یا تو فنا ہو جاتی ہیں یا ایک قسم کی معلق، چہ خفتہ چہ بیدار، حالت ان پر طاری ہو جاتی ھے - تاریخ میں جو زبردست اور کمال آفریں تہذیبوں کی یادگاریں محفوظ ہیں وہ سب اسی اصول کی شہادت دیتی ہیں - یہہ محال عقلی نہیں ھے کہ کوئی تہذیب ایسی عمدہ بنیادوں پر قائم ہو، اور اس کی علمبردار نسلیں اور قومیں اس قدر پاک اور حیات‌پرور خون رگوں میں رکھتی

هوں کہ وہ نمو اور زوال کے اس دائرہ سے نجات پاکر ایک مستقل اور پائدار صورت اختیار کر لے - لیکن یہ ابھی تک محض ایک امکان عقلي ہے - اس کي کوئي عملي مثال موجود نہیں - اسي عام قاعدہ کے بموجب ہندستان کي تہذیب پر بھی سترھویں صدی کے بعد سے سستي اور زوال طاري ہونا شروع ہوا - اس کے اعضا اور عناصر کمزور ہونے لگے اور لوگوں کی تخلیقي قوتوں اور معاشرتي نظام دونوں نے جواب دینا شروع کیا - کہیں کہیں مقامي اور عارضي شگفتگي اور زندگي ضرور ظاہر ہوئي - لیکن وہ بعض مقامي حالات پر مبني تھي اور تمام ملک کي علمي اور معاشرتي زندگي کے اثر اور قوت بخش رد عمل سے علحدہ ہونے کی وجہ سے وہ دیرپا نہیں ہو سکتي تھي - یعني وہ ایک موج تھي جو "بیرون دریا" تھي - اس لیے اس کی کوئي مستقل ہستي نہ ہو سکتي تھی - مثلاً دکن کي بعض ریاستوں کي مادي خوش حالی اور علمي بیداری - مغلوں کے آخري دور میں اردو ادب کي ترقی وغیرہ -

ہمیں اس وقت عبرتناک زوال کے اسباب سے مفصل بحث کرني مقصود نہیں - وہ بجاے خود ایک مستقل اور غور طلب مسئلہ ہے - اور جب ہندستان کي تاریخ جذبہ‌داري کے اثرات سے آزاد ہوکر انصاف اور صداقت کے ساتھہ لکھي جاۓ گي اس وقت سنجیدہ مورخ اس پر روشني ڈالے گا - تاہم یہاں اتنا کہہ دینا ضروري ہے کہ محض طوائف‌الملوکي اور سیاسي جتھا بندي کے بکھرجانے سے یہہ لازم نہیں آتا کہ ملک کی علمي اور اخلاقی زندگی بھی متزلزل ہو جاۓ - سیاسی انقلابوں کے زمانے بعض ملکوں کی تاریخ میں نہایت زبردست علمی اور ادبي جد و جہد کے زمانے ہوۓ ہیں - انقلاب فرانس اس کی ایک مثال ہے - انقلاب روس سے کچھہ هي پہلے؟ جب گویا اس معرکۃالآرا زلزلے کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی؟ روسیوں نے جو ادبی جدو جہد کی اور جو نامور ادیب پیدا کیے وہ سب بھی

اس بات کی شہادت ہیں کہ محض ملکی بد نظمی کسی قوم کی زندگی کے اعلیٰ تر مظاہر کو برباد نہیں کرسکتی ۔ ہندستان میں بھی ملکی بدنظمی نے اہل ہند کے تہذیب و تمدن اور علمی جد و جہد کو نقصان ضرور پہنچایا ۔ لیکن ہندستانیوں کے علمی زوال اور عام انتشار کا تنہا سبب قرار نہیں دی جاسکتی ۔ اس کے اسباب کو تلاش کرنے کے لیے زیادہ گہری نظر اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے ۔

کسی ملک کی تہذیب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ نئے خیالات کو پیدا کریں ، ان کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر وہ ایک وسیع افادی معیار پر پورے اُتریں تو ان کو اپنے نظام زندگی میں راہ دیں ۔ حرکت زندگی کی جان ہے اور قوموں کی زندگی میں یہ حرکت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس میں علمی تخلیق کا مادہ ہو اور وہ برابر مصروف کار رہے اور اسی حالت میں ممکن ہے جب ملک کا نظام تعلیم اور سماجی نظام دونوں بالارادہ جدت ، اجتہاد اور تخلیق کی قوتوں کو نشو و نما کریں اور ان کو اظہار کا موقع دیں ۔ اگر کسی ملک کا نظام معاشرت جامد اور ساکن ہوکر رہ جاے جس میں نہ افراد کی حرکت کی گنجایش ہو نہ نئے اور زندگی بخشنے والے خیالات کو سر سبز ہونے کا موقع ملے تو اس کی ہر قسم کی ترقی رک جاتی ہے ۔ اس میں ہر نئی تحریک کو شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے کیوں کہ قائم شدہ صورت حالات کو بدلنے کی دھمکی دیتی ہے ۔ افراد کو اظہار خودی کا موقع نہیں دیا جاتا ۔ انفرادی اختلافات کو دبایا جاتا ہے ۔ لوگ بجاے اس روشنی کو ظاہر کرنے کے جو ان میں ودیعت کی گئی ہے ، بجاے بے خوف ہوکر ان قدرتی صلاحیتوں اور عطیوں کو کام میں لانے کے جو ان کے حصہ میں آئے ہیں سوسائٹی کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں اور محض

ایک دوسرے کی نقل کرنے پر اکتفا کرتے ھیں - ان کو بجاۓ رواداری کے کے تعصب، بجاۓ وسعت خیال کے تنگ نظری، بجاۓ جدت اور اجتہاد کے تقلید اور کم ھمتی اور بجاۓ نقد و تنقید کے ادعا کا مرض لاحق ھو جاتا ھے -

گذشتہ دو صدیوں سے یہی کیفیت تھی جو رفتہ رفتہ ھندستان میں پیدا ھونی شروع ھوئی اور جس نے ملک کی زندگی میں جمود، اور سستی، اور نا امیدی کو غالب کردیا - مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے سے جوں جوں علمی افلاس زیادہ ھوتا گیا عام لوگوں میں، خواہ وہ تعلیم یافتہ ھوں یا غیر تعلیم یافتہ، تقلید پسندی اور قدامت پرستی کی ذھنیت بڑھتی گئی - اور بجاۓ اس کے کہ وہ نئے سیاسی اور اقتصادی حالات سے متاثر ھوکر اپنے لیے زندگی کے تمام شعبوں میں نئی شاھراھیں نکالتے وہ نئے علوم و فنون سے منہ موڑ کر ماضی کی مدح سرائی میں مصروف ھو ھوگئے اور ھندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے بغیر ماضی کو اچھی طرح سمجھے محض جذبات سے متاثر ھوکر اس کو عہد زریں تصور کر لیا - اور بغیر ھاتھہ پاؤں ھلاۓ اس امید میں زندگی بسر کرنے لگے کہ وہ زمانہ کبھی نہ کبھی عود کر آۓ گا -

اِس ذھنیت کا اظہار بہت نمایاں طرح اس مخالفت کی صورت میں ھوا جو ھندستانیوں نے بالعموم ان تحریکوں کے ساتھہ کی جو راجہ رام موھن راۓ اور سر سید احمد خاں کے نام کے ساتھہ منسوب ھیں دونوں نے اپنی اپنی جگہہ یہ محسوس کیا کہ قومی زندگی پر بہت سے ایسے تعصبات اور ترقی کو روکنے والے اثرات حاوی ھو گئے ھیں جن کو دور کرنا ضروری ھے - بعض اثرات مذھب کی آڑ پکڑ کر کام کر رھے تھے، بعض سماجی زندگی پر رسوم اور پابندیوں کی شکل میں حاوی تھے، اور بعض ھر اس تحریک کی مخالفت کرتے تھے، جس کا کوئی تعلق موجودہ

زمانے سے یا مغرب کي تہذیب سے ھو - اور ان کا جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ یہہ تمام تحریکیں ھمارے قدیم تاریخي تہذیب و تمدن اور مذھب و علوم کي جڑوں کو کھوکھلي کردیں گی - یہی وجہ تھي کہ جب ان مصلحین نے اپنے اصلاحي خیالات کو ملک کے سامنے پیش کیا تو مختلف طبقیں اور گروھوں نے ان کي مخالفت کي اور ان کو مذھب اور قوم کا دشمن اور کافر وغیرہ قرار دیا - لیکن چوں کہ ان کي باتیں سچي تھیں دل سے نکلی تھیں اور ان کی شخصیت میں اثر اور زور تھا اس لیے وہ رفتہ رفتہ اس مخالفت کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان کے خیالات کو کچھہ عرصہ کے بعد عام طور پر قبول کرلیا گیا -

میں نے اوپر ذکر کیا ھے کہ ماضي کو پوجنے اور حال کي طرف سے بیزاري کي ذھنیت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رھي - اس کے بہت سے اسباب ھوئے - لیکن اس کا غالباً سب سے بڑا سبب مغربي تہذیب کا تصادم تھا - جس طرح گذشتہ زمانے میں نئي تہذیبوں کے امتزاج سے ھندستانی تہذیب کو استحکام پہنچتا رھا اور اس میں حیات بخش عناصر جذب ھوتے رھے اسي طرح اس وقت ایک نئي تہذیب جس کي نشو نما بالکل مختلف حالات میں ھوئي تھي بطور ایک چیلنج کے ملک کے سامنے آئي - اور چوں کہ وہ تہذیب ایک حکمراں قوم کی تہذیب تھي اس لیے اس میں قوت اور اثر کرنے کي صلاحیت تھي اور اس نے رفتہ رفتہ باوجود قدامت پسندوں کي مخالفت کے ھندستانیوں کی ذھنیت اور ان کے عادات و اخلاق ان کي بود و باش پر اثر ڈالنا شروع کیا اور جب اس تحریک کے ساتھہ اقتصادي ضروریات بھی شامل ھوگئیں تو اس کا اثر اور وسیع ھوتا گیا - سرکاری نوکریوں کے لیے انگریزي زبان سیکھنا اور انگریزی مدارس میں تعلیم پانا لازمي ھوگیا - حکمران قوم کي نگاہ میں عام لوگوں کي پوزیشن کا معیار یہہ

هو گیا کہ وہ کس حد تک انگریزی بود و باش اور طرز زندگی کو قبول کرتے ہیں ۔ اس صورت حال کا اثر وہی ہوا جو ہونا تھا ۔ ایک طرف اپنی تہذیب کا نظام روال آمادہ ہو چکا تھا ۔ دوسری طرف ایک نئی تہذیب اپنے نئے اور انوکھے خیالات سے ؟ اور دنیاوی فائدوں کی ترغیب سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی ۔ ردّ عمل ہونا ضروری تھا ۔ ملک میں ایک کافی بڑی جماعت ایسی پیدا ہو گئی جس نے زیادہ تر مغربی تہذیب کے صرف بیرونی اور نمائشی پہلوؤں سے خیرہ ہو کر اس کی اندھی تقلید شروع کردی اور اپنی قومی روایات اور تاریخی تہذیب کو نہ صرف فراموش کر دیا بلکہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگی اس میں کچھ اثر اس بالارادہ پروپیگنڈا کا بھی تھا جو مدرسوں کی تعلیم اور ہندستان کی تاریخ کے متعلق غلط بیانیاں کر کے طلبا میں پھیلایا گیا ۔ لیکن اس کی وجہ زیادہ تر یہی تھی کہ نئی نسل کے نوجوان اپنی تاریخ سے ناواقف رہے اور مغرب کی تہذیب اور اس کے فائدوں سے سطحی طور پر مرعوب ہوگئے تھے ۔ یہہ زمانہ وہ ہے جب نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں بالعموم ؟ انگریزی لباس ؟ انگریزی طرز معاشرت انگریزی زبان کا شوق خبط کے درجے کو پہنچ گیا تھا ۔ یہاں تک کہ وہ اول تو اپنی زبان کو بولنا ہی ہتک سمجھتے تھے اور اگر بولتے بھی تھے تو اس میں انگریزی الفاظ کی بھر مار ہوتی تھی اور بعض اوقات اردو کے الفاظ کو بھی بگاڑ کر اس طرح تلفظ کرتے تھے جس طرح ناواقف غیر ملکی اپنے ہندستانی نوکروں سے زبان سیکھہ کر بولتے ہیں ۔ یہہ وہی طبقہ تھا جس کا مذاق اکبر الہ‌آبادی نے اپنے مخصوص اور ناقابل تقلید انداز میں جا بجا اپنی نظموں میں اڑایا ہے :—

مگر وہ جرگہ جسے چڑ گئی ہے انگریزی

نہ واں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار !

هندستانی ذہنیت پر یہہ ملمع بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا ۔ مغربی تہذیب کے تعلق اور تصادم نے بہت سی ایسی قوتوں اور تحریکوں کو بیدار کر دیا تھا جو دوبارہ ایک نیا رد عمل پیدا کر رہی تھیں اور "قومیت" کے احساس کو از سر نو ابھار رہی تھیں ۔ یہہ احساس محض سیاسی نہ تھا بلکہ اس میں تہذیب و تمدن ، تعلیم و معاشرت کا خیال بھی شامل تھا ۔ اپنی حالت کی خرابی کا احساس ، مغرب کے سیاسی خیالات کا مطالعہ ، تہذیب مغرب کی سطحی چمک کا زائل ہونا اور اس کی کمزوریوں اور نقائص کا اظہار ، تمدن قدیمہ کا تاریخی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور اس کی اہمیت کی پہچان اور سب سے زیادہ سیاسی بیداری اور احساس قومیت کا احیا ، ان سب چیزوں نے مل جل کر مغرب پرستی اور تقلید کے دور کو جلد ہی ختم کر دیا اور خود موجودہ تعلیم پائے ہوئے طبقہ نے اس رجحان کی مخالفت کی جو بیسویں صدی کے آغاز تک ہندستانیوں کو ہندستانی تہذیب سے دور ہٹاتا چلا جارہا تھا ۔ اس کا اظہار زمانہ حال کے بہت سے صاحبان فکر کے خیالات اور تقریروں اور تصانیف میں ملے گا جس میں مہاتما گاندھی ، ٹیگور ، اقبال جیسے مختلف نقطہ نظر کے لوگ شامل ہیں ۔ اس جدید ترین تحریک کا بہترین اظہار اس خواہش کی شکل میں ہوتا ہے کہ ہندستان اپنی حقیقی اور اصلی روح کو دوبارہ پائے اور اپنی قومی نجات اور مستقبل کی تشکیل کے لیے ایک فقیر کی طرح دوسروں کی دریوزہ‌گری نہ کرے ، اقبال اس مطلب کو جا بجا اپنے اشعار میں خوبی کے ساتھہ ادا کرتا ہے :—

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست

تجلیٔ دگرے در خورِ تقاضا نیست !

اس میں شک نہیں کہ اس " حقیقی اور اصلی روح " کے صحیح مطلب میں لوگوں کو اختلاف ہے اور اس اختلاف کا قائم رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں - کیونکہ قومیت کی تعبیر ہر شخص کے مخصوص نقطۂ نظر اور فلسفہ زندگی پر منحصر ہے اور جب تک زندگی کی اہم قدروں کے متعلق لوگوں میں اختلاف رہے گا وہ اجتماعی زندگی کے نصب العین کو بھی مختلف صورتوں میں پیش کریں گے - تاہم بجائے خود اس اصول کا تسلیم ہو جانا ایک اہم بات ہے کہ ہر قوم کی ترقی اور نجات خود اپنی مخصوص صلاحیتوں اور امکانات کی تربیت میں پوشیدہ ہے - دنیا میں مجموعی ترقی تہذیب و تمدن کے لیے یکسانیت کی ضرورت نہیں فطری اختلافات کو نشو و نما کرنے کی ضرورت ہے اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر قوم اپنی مخصوص روح اور اپنی مخصوص جینیس (Genius) کو تلاش کرے اور تعلیم اور اداروں کی تنظیم کے ذریعہ ان کو مکمل بنانے کی کوشش کرے - یہہ اصول ابھی تک دنیا میں تمام قوموں نے تسلیم نہیں کیا یعنی اس معنی میں کہ ان کے سوا دوسری قوموں کو بھی یہہ حق ہے کہ اپنے اپنے راستوں پر چل کر اپنی تہذیب کی نشو و نما کریں - اگر یہہ اصول تسلیم کرلیا جاتا تو غالباً وہ تمام کوشش جو ایک تہذیب دوسری تہذیب کو مغلوب کرنے کے لیے بالارادہ کرتی ہے وقوع میں نہ آتیں - بہر حال کم از کم نظری طور پر کوئی انصاف پسند اور سلیم العقل انسان اس اصول سے انکار نہیں کر سکتا - عملاً اس کو رہبر زندگی بنانے میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں اور بہت سی قدیم اور مضبوطی کے ساتھہ جمی ہوئیں جبلّتوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے - اور جوں جوں اس کوشش میں کامیابی اور قوموں میں مناسب رواداری اور انصاف پسندی پیدا ہوگی یہہ اصول زیادہ مضبوطی کے ساتھہ بین الاقوامی تعلقات میں اپنی کار فرمائی دکھاوے گا -

هندستان میں اس تحریک کے حامیوں نے بعض اوقات اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور یہہ کوئي تعجب کي بات نہیں کیوں کہ ہر ردّ عمل کے ساتھہ مبالغہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے - مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستانیوں کو چاہیے کہ وہ اپني قومي تہذیب اور مستقبل کے اداروں اور نظام زندگي کي تشکیل میں نہ داھني طرف دیکھیں نہ بائیں طرف - بلکہ اپني نظر کو قدیم ترین ہندستاني تہذیب مثلاً ویدک تہذیب کي طرف پھیر دیں اور ایک گم شدہ زمانے کو دو بارہ زندہ کرنے کي کوشش کریں - بعض نے اُس تحریک کے اثر میں آ کر یہہ کوشش کي ہے کہ ماضي کي ہر چیز کو کسی نہ کسی طرح صحیح یا غلط "" علمي تحقیق "" کے ذریعہ اچھا کر کے دکھائیں اور تاریک گوشوں کو اپنے قابلانہ علمي دلائل کی روشني سے منور کردیں - ایک گروہ ایسا ہے جو عہد جدید کي تمام ایجادات اور ترقیوں کو اس بنا پر رد کرنا چاہتا ہے کہ وہ انسان کی روحاني ترقی میں سد راہ ہوتی ہیں اور اس لیے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے درمیان کوئي مفید اور نتیجہ خیز سمجھوتہ قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے -

(۴)

ہم نے ابتدا میں ہندستانی ذہنیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس سے ایک نہایت اہم نتیجہ یہہ نکلتا ہے کہ ہندستانی دماغ اور فطرت دونوں بہت روادار اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں - ہندستانیوں کي طبیعت میں ابتدا سے یہہ صلاحیت رہي ہے کہ وہ بیروني اثرات اور بیروني خیالات وغیرہ کو اپنے میں ضم کر کے اُن کو اپنا بنا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو قومیں ہندستان پر حملہ آور ہوئیں اور اپني تہذیب کو بحیثیت ایک فاتح قوم کے اس ملک میں لے کر آئیں وہ کچھہ زمانہ گذرنے کے بعد خود اس ملک کي آب و ہوا میں

رس بس گئیں - اور ملک کي عام تہذیب کے ساتھہ مل کر ان کے امتزاج سے ایک نئي اور زیادہ وسیع اور گہری تہذیب پیدا ہوئي - سید راس مسعود صاحب (وائس چانسلر علیگڈھہ مسلم یونیورسیٹی) نے اپنے ایک تعلیمي خطبہ میں لکھا ھے کہ جاپانیوں نے گذشتہ سو سال کے عرصہ میں جو غیر معمولی ترقی کي اور خود کو مغربي قوموں کے دوش بدوش پہنچا دیا اس میں ایک حیرت انگیز اور قابل غور بات یہہ تھي کہ انہوں نے اهل مغرب کي تمام چیزوں کي اندھي تقلید نہیں کي بلکہ ان کي تہذیب و تمدن سے ان چیزوں کو انتخاب کر کے لیا جو ان کي طبیعت اور قومی روایات کے ساتھہ ہم آہنگ ہو سکتي تھیں - یہہ بالکل صحیح ھے لیکن فطرتاً اِس لحاظ سے ایک هندستاني کسي جاپاني سے گھٹا ہوا نہیں ھے - هندستانیوں میں بھي بدرجہ اتم یہہ صلاحیت ھے کہ وہ فراخ دلی اور وسعت نظر کے ساتھہ باہر کے خیالات اور تہذیب و تمدن کو قبول کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ اِس کو اس طرح ڈھالتے اور " اپناتے " ہیں کہ وہ بغیر کسي نا گواري کے ان کي اپني تہذیب کا جزو ہو جاتے ہیں - ممکن ھے اس خیال کي تردید میں میرا اوپر کا بیان پیش کیا جاے جہاں میں نے بتایا ھے کہ کس طرح ابتدا میں هندستانیوں نے انگریزی تہذیب کی تقلید بغیر سوچے سمجھے کي اور اپني تاریخ اور روایات کو پس پشت ڈال دیا - لیکن یہہ اِعتراض صحیح نہیں کیوں کہ وہ اِرتقاءي سلسلہ کي محض ایک عارضي منزل تھي جس میں سے گزرنا کوئي تعجب کي بات نہیں - قوموں کي زندگي میں ، خصوصاً بڑي بڑي قوموں کي زندگي میں ، تمام باتوں کے متعلق پہلے سے کوئي تفصیلي پروگرام نہیں بنایا جا سکتا جس کي پیروی کرنا سب افراد کے لیے ممکن ہو - چھوٹي اور بہت منتظم قوموں ایک حد تک ایسا پیش قدم ہو سکے کہ سوچ سمجھہ کر ایک قومي

پروگرام بنایا جاے اور اس پر بہت احتیاط کے ساتھہ عمل کیا جاے جیسا جاپان میں یا جرمنی میں کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن هندستان جیسے وسیع ملک میں ، جس کے ساتھہ نسل انسانی کے ایک پانچویں حصے کی قسمت وابستہ ھے ، ایسا نہیں ھو سکتا - اس کی مجموعی زندگی اور ارتقاء کی مثال ایک سمندر کی ھے جو آگے کو بڑھتے ھوے اپنے لیے جا بجا نئے اور مختلف قسم کے راستے نکالتا رهتا ھے - بہر حال اسی وجہ سے اول اول ، جب هندستان کو مغربی تہذیب سے سابقہ پڑا اور ابتدائی تعصب جو راہ میں حائل تھا دور ھو گیا تو نئی تعلیم یافتہ جماعت کا زور اور جوش ان کو ایک طرف بہا کر لے گیا اور انہوں نے اس کی تقلید اور اس کو اختیار کرنے میں اعتدال اور سلامت روی کے حدود کو بھلا دیا - لیکن اب جب کہ هم اس منزل سے نکل گئے هیں اور ردّ عمل کا اثر شروع هوگیا ھے همارا فرض ھے کہ هم رواداری اور خود داری کے ساتھہ فیصلہ کریں کہ اس نئی تہذیب میں ، جو بعض لحاظ سے همارے بنیادی اصولوں اور قدروں کو چیلنج کر رهی ھے ، کیا چیزیں اس قابل هیں کہ هم ان کو قبول کریں اور کن چیزوں کو مسترد کرنا چاهیے -

بیان بالا سے یہہ نہیں سمجھنا چاهیے کہ میں موجودہ دور کی مغربی تہذیب کو ، بعض صاحبان فکر کی طرح ، بالکل ناقابل قبول سمجھتا هوں میرا اعتراض محض اس اندھی تقلید کے خلاف ھے جو ابتداً هندستانیوں نے مغربی تہذیب کی اختیار کی تھی - اور یہہ طریقۂ عمل کسی قوم کے لیے بھی مفید یا پسندیدہ نہیں ھو سکتا - لیکن اس کے ساتھہ ھی یہہ بھی یاد رکھنا چاهیے کہ کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے مسترد کر دینا بھی هندستانی ذهنیت کے منافی ھے - مغربی تہذیب اگرچہ ایک مختلف اور اجنبی ماحول میں پیدا هوتی ھے لیکن اس میں ایسے مفید اور قابل‌قدر عناصر موجود هیں جن

سے سبق حاصل کرنا ، جن کو سمجھنا ، اور اپنے میں جذب کرنا بہت ضروری ہے - مجھے معلوم ہے کہ ملک میں ایک موقر فرقہ ایسا موجود ہے جو اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتا - اس فرقہ کا سر گروہ غالباً مہاتما گاندھی ، کو سمجھنا چاہیے اور ان کی رائے بوجہ ان کے خلوص اور قوت فکر و تدبیر کے اس قابل ہے کہ اس پر احتیاط کے ساتھ غور کیا جائے - سنہ ۱۹۰۹ ع میں "جو اپنے عقیدہ کا اعتراف" انہوں نے شائع کیا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں -

"مغربی یا یورپی تہذیب کوئی چیز نہیں ہے - البتہ ایک تہذیب موجودہ زمانہ کی ضرور ہے جو سراسر مادی ہے - جب تک مغرب کے لوگوں پر موجودہ تہذیب کا اثر نہیں ہوا تھا ان میں اور اہل مشرق میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں ہندستان پر انگریزی قوم کی حکومت نہیں ہے بلکہ موجودہ تہذیب کی حکومت ہے جو ریلوے اور تار برقی ، ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ حکومت کرتی ہے مشرق و مغرب کا امتزاج صرف اس حالت میں ہو سکتا ہے جب مغرب موجودہ تہذیب کو تقریباً یک سر مسترد کردے - بظاہر ان کا ملاپ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ مشرق موجودہ تہذیب کو اختیار کرے - لیکن وہ ملاپ ایک طرح کی مسلح صلح ہوگی جیسی کہ انگلستان اور جرمنی کے درمیان آج کل ہے جب کہ وہ دونوں "موت کی گھاٹی" میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس اندیشہ سے کہ کہیں ایک دوسرے کو نگل نہ جائے... یہہ بات بطور ایک عام اصول کے بیان کی جاسکتی ہے کہ مادی ضروریات اور آسائشوں کے زیادہ ہونے سے اخلاقی نشوو نما کو مدد نہیں ملتی... ہندستان کی نجات اس امر پر منحصر ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں ہندستان نے جو کچھہ سیکھا ہے اس کو بھول جائے - ریلوے ، تار ، اسپتال ، وکیل ، ڈاکٹر اور اس قسم کی سب چیزوں کو ختم کر دینا

چاهیے اور ان لوگوں کو جو اعلی طبقے کے کہلاتے هیں بالارادہ ، سوچ سمجھ کر اور مذهبي خلوص کے ساتھ کسانوں کي سادہ زندگی کي طرف رجوع کرنا چاهیے اور یہہ یقین رکھنا چاهیے کہ یہي ایک زندگي هے جو سچي خوشي کا سرچشمہ هو سکتي هے ..عقلمند تھے پرانے رشي جنھوں نے زندگي کي تنظیم اس طرح کي تھي کہ لوگوں کی مادي زندگي اور ضروریات محدود رهیں..اسي میں نجات هے... مجھے معلوم نہیں کہ ایسا عظیم‌الشان انقلاب ان لوگوں میں هو سکتا هے یا نہیں جو خوشي اور اطمینان کو موجودہ زمانے کی مجنونانہ دوڑ دھوپ اور یورش میں تلاش کر سکتے هیں - ""

ان الفاظ پر ، جیسا کہ میں نے کہا هے غور کرنے کي ضرورت هے نہ صرف اس لیے کہ وہ ایک نہایت دور رس اور روشن دماغ سے نکلے هیں بلکہ اس لیے بھی کہ وہ هندوستانی ذهنیت کے ایک رخ کو ، اور ایک اهم رخ کو ، بہت وضاحت سے بیان کرتے هیں اس خیال کے مطابق مغربي تہذیب کي بنیاد مادي خواهشات پر هے اور اس کا انتہاءی کمال مادي آسائشوں میں اضافہ کرنا اور نئي نئي چیزوں کي ایجاد - یہہ تمام نئي ایجادیں اور اشیا نہ صرف همارے بازاروں کو بھر دیتي هیں بلکہ هماری روحانی ترقی کے راستہ میں بھی حارج هوتي هیں اور هماري خوشي اور اطمینان کے معیاروں کو بدل کر خراب کردیتي هیں - هم اپني زندگي کي تکمیل اور مسرت کو ان خارجی اشیا میں تلاش کرتے هیں اور فطرت کي اٹل اور دائمی قوتوں اور مناظر ، اور خود قلب انساني کي گہرائیوں اور بلندیوں کو بھول جاتے هیں اور روح ان مادي بھول بھلیوں میں پڑ کر اپنے سیدھے راستہ سے بھٹک جاتي هے - لہذا همیں اس ، جال سے بچ کر دوبارہ اس زمانہ کي طرف رجوع کرنا چاهیے جب هماري ضروریات کم اور زندگي سادہ تھي اور هماري توجہ اضافي اور عارضي

چیزوں کے بجائے دائمی اور اهم مسائل اور حقائق پر رهتی تهی -

اِس میں شک نہیں که اگر مغربی تہذیب کے اِس وقت تک کے رجحان کو دیکھا جائے اور اُس کے سطحی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو اِس زبردست الزام اور تنقیص میں بہت کافی صداقت ھے - لیکن کسی تہذیب سے تعلق پیدا کرتے وقت یہ دیکھنا کافی نہیں که اِس کے تاریک پہلو کس قدر تاریک هیں کیونکه هم اِس کو تمام وکمال جذب کرنا نہیں چاهتے - همیں یہه بهی دیکھنے اور سوچنے کی ضرورت ھے که بحیثیت مجموعی وہ کس قدور کی حامل ھے اور دنیا کے سامنے کن قابل قدر چیزوں کو پیش کرتی ھے - اِس امر پر تو موجودہ زمانہ میں نه صرف مشرق کے صاحبان فکر کا اتفاق ھے بلکه مغرب کے مفکرین بهی اِس امر کے قائل هیں که اُن کی تہذیب پر مادیت کا رنگ غالب آگیا ھے اور آسائش جسمانی اور قوت کے حصول کی کوشش میں گزشته سو برس میں انھوں نے اِس قدر جد و جہد کی ھے که دوسری اهم اور اعلیٰ تر قدور فرو گذاشت هو گئی هیں اور اگر اِس میلان کا انسداد نه کیا گیا تو اندیشه ھے که انسانی زندگی بالکل مشینی هوکر رہ جائے گی - میں اِس خیال کی تائید میں ٹیگور کی چند سطریں پیش کرتا هوں :—

"مغربی سیرت کا جو رخ مغرب اور مشرق کے باهمی تعلقات میں سب سے زیادہ نمایاں هوا ھے وہ نه صرف همارے لیے شدت آمیز ھے بلکه خود مغرب کی توهین ھے - انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات اور کچھه نہیں هوسکتی تهی - کیونکه دراصل مختلف قوموں کے باهمی تعلقات اور میل ملاپ کا نتیجه همیشه یہه هونا چاهئے که کسی بہت بڑی حقیقت کا انکشاف هو جو همیشه کے لیے یادگار رهے جیسا که زمانه قدیم میں هندستان اور چین کے باهمی ارتباط کا نتیجه هوا تها ....
هم اهل ایشیا کے لیے سب سے زیادہ بڑی بدنصیبی یہه ھے که همارے براعظم

تہذیب مغرب کے ورود کے ساتھہ ساتھہ نہ صرف سائنس آئي ھے جو حق کا اظہار ھے اور جس کا ھم خیرمقدم کرتے ھیں بلکہ خود غرضي اور نفس پرستي کے مقاصد کے لیے سائنس کا ناجائز استعمال بھي جو اِس کو ایک تباہ کُن قوت بنا دیتا ھے - جن ملکوں میں اِس کا زور ھے وھاں ایک ایسي غلط دھنیت پیدا ھو رھي ھے جو اخلاقي اعیان کو مسترد کرتي ھے اور انھیں ایسے لوگوں کے لیے غیر مناسب سمجھتي ھے جن کو حکومت کرنے کي تمنا ھے یا جن کو محض تنازع للبقاء کے لیے تیاري کا جنون ھے - وہ یہہ نہیں سمجھتے کہ زندگي کا یہ فلسفہ جو شیروں کي دنیا کے لیے موزوں ھے انسانوں کي زندگي میں سواے تباھي و بربادي کے اور کوئي نتیجہ پیدا نہیں کرتا - وہ اِن لوگوں سے سخت ناراض ھو جاتے ھیں جو اِس خیال کي مخالفت کرتے ھیں کیونکہ انھیں یہہ خوف ھے کہ مبادا اِس مخالفت کي وجہ سے اِن کي حیوانیت میں کمي آجائے جس کو وہ دائمي طور پر زندہ رکھنا چاھتے - "

اِس تنقید میں جو کافي وضاحت سے مغربي تہذیب کے ایک مخرب رخ کو ظاھر کرتي ھے اِس بات کو بھي تسلیم کیا گیا ھے کہ یہہ مغربي تہذیب کا صرف ایک رخ ھے اور ھم اھل مشرق کو اِس سے احتراز کرنے کي ضرورت ھے - لیکن اِس کو مغربي تہذیب کي مکمل تصویر سمجھہ لینا ایسي ھي غلطي ھے جیسي انگریز اور امریکن سیاح کرتے ھیں - جب وہ هندستان یا چین کے لوگوں کي زندگي کا کوئي تاریک یا قابل اعتراض پہلو دیکھہ کر تمام تہذیب و تمدن کے متعلق ایک راے قائم کر لیتے ھیں - جہاں ھمارے صاحبان فکر پر یہہ فرض ھے کہ وہ ھم کو اِن خطرات سے آگاہ کریں جو مغربي تہذیب کے تعلق کي وجہ سے پیدا ھوے ھیں وھاں اِن کو یہہ بھي لازم ھے کہ وہ اِس کي عمدہ اور سبق‌اندوز باتوں کو بھي سمجھائیں تا کہ مستقبل کے تمدن اور معاشرت کي تعمیر میں ھم

اِن سے فائدہ اُٹھا سکیں ۔ موجودہ زمانے کی سائنٹیفک ایجادوں اور مکان و زمان کی تسخیر نے دنیا کو غیر معمولی سرعت کے ساتھ ایک بدل دیا ھے ۔ ملک اور قومیں جو پچاس سال پہلے تک باھمی فاصلوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے بالکل علحدہ راستوں پر اور اب تک حد تک ایک دوسرے کے مسائل اور کامیابیوں اور کارناموں سے ناواقف اپنی اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کر رھی تھیں اب تار برقی ٹیلیفون اخباروں ، موٹروں اور ریلوں ، ھوائی جہازوں وغیرہ کی وجہ سے ایک انوکھے طریقہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ھوگئی ھیں اب کوئی قوم یہہ نہیں کر سکتی کہ بین الاقوامی تحریکوں کی طرف سے منہہ موڑ کر بالکل تنہائی اور علحدگی میں اپنی سیاسی یا عملی زندگی کی نشو ونما کرے علم ، خیال ، سائنس سب چیزوں کے پر لگ گئے ھیں اور جو علمی تحقیق آج دنیا کے ایک گوشہ میں ھوتی ھے اِس کی خبر کل اخباروں کے ذریعہ دنیا کے ھر گوشہ میں پہونچ جاتی ھے ۔ اِس لیے نہ یہہ ھمارے لیے ممکن ھے نہ مفید کہ ھم از سر تاپا مغربی تہذیب کے عطیّوں کو مسترد کر دیں اور اپنی اِس پرانی ذھنیت کو بھول جائیں جس نے ماضی کے مختلف زمانوں میں اِن تمام تہذیبوں سے عناصر حاصل کیے اور جذب کیے جو آریوں کے زمانے سے لے کر آج تک ھندستان میں آتی رھیں ۔

(۵)

اب ھم مختصراً یہہ دکھانا چاھتے ھیں کہ اپنی بہترین شکل اور اظہار میں مغربی تہذیب کن عمدہ اور مفید خیالات کی تر جمان ھے اِس ضمن میں غالباً سب سے پہلے مغرب کی سائنٹفک ترقی کا ذکر کرنا چاھیے ۔ دور حاضرہ میں سائنس کی ترقی کا سہرا مغرب کے سر رکھنے کے یہہ معنی نہیں کہ ھم دوسری قوموں کی تاریخی کوششوں کا اعتراف نہ کریں یا یہہ بھول جائیں کہ سائنس کی ترقی اِن بے شمار شخصوں کی کوششوں کا ثمر ھے

جنہوں نے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں اکثر گم نامی اور مفلسی کی حالت میں محض تلاش حق کے جذبہ سے متاثر ہو کر عملی تحقیق و تفتیش میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں -

ایسی احسان ناشناسی روح سائنس پر ایک صریح ظلم ہے - لیکن اس میں شک نہیں کہ گذشتہ دو سو برس میں سائنس کی جو باقاعدہ اور منظم ترقی ہوئی ہے اس کی سرکردگی اور اس میں سب سے زیادہ جد و جہد یورپ ہی نے کی اور اب بھی یورپ اور امریکہ ہی اس میں پیش پیش ہیں - اگر سائنس کو محض انفرادی قوت کے بڑھانے کا ایک ذریعہ سمجھا جائے تو اس کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدور میں شمار کرنا غلطی ہوگی - لیکن سائنس در اصل انسانی طبیعت کے اس پیچیں جذبہ کی پیداوار ہے جو اپنے ماحول کی تمام قوتوں کو تسخیر کرنا چاہتا ہے جو خدا کے اس مقصد میں معین اور آلہ کار ہے کہ انسان تمام عالم فطرت پر حاوی ہوکر اس کو اپنے اعلیٰ ترین روحانی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے - اگر مشیت الہی کا مقتضا یہہ ہوتا کہ جہاں تک ہوسکے انسان اپنے ماحول سے بے تعلق اور الگ تھلگ رہے تو اس کی روح کو جسم کے ساتھہ مربوط اور اسکی زندگی کو قوانین فطرت اور عالم فطرت کے ساتھہ مشروط نہ کرتا - سائنس کی ترقی بجائے خود انسان کی روحانی ترقی ہے اور معرفت الہی کو زیادہ کرتی ہے-یہہ ایک علحدہ بات ہے کہ اس کے غلط استعمال کی وجہ سے اس نے انسان کو مصیبتوں اور جرائم میں پھنسا دیا ہے - مغرب کے بہترین دماغ خود اس بات کے قائل ہیں کہ گذشتہ دو سو سال میں سائنس کی ترقی اس قدر حیرت ناک سرعت کے ساتھہ ہوئی ہے کہ انسان اپنے روحانی ارتقاء اپنے سماجی نظام اور اپنے احساس تعاون کو اس کے ساتھہ ہم آہنگ نہیں کر سکا - اس کی وجہ سے باصبر اور عاقبت ناشناس انسان کے ہاتھہ میں بعض

بہت زبردست قوتیں آگئی ھیں جن کے جائز استعمال کے لیے مناسب ذهنیت اس میں پیدا نہیں هوئی - ضبط نفس، رواداری، باهمی اخوت اور انحصار کا احساس، اخلاقی اصولوں کی پختگی، یہہ سب چیزیں جب تک بہت زیادہ عام هوکر قوموں کی سیرت کا جزو نہ بنیں اُس وقت تک هم کو یہہ اطمینان نہیں هو سکتا کہ قومیں بیوقوف بچوں کی طرح اس هتیار سے خود اپنے هاتهہ نہ کات لیں گی - لیکن اس صورت حال کو تعلیم اور معلمین کے لیے ایک بیدار کن چیلنج سمجهنا چاهیے - ان کو چاهیے کہ مدرسوں اور اعلیٰ ترین تعلیم گاهوں میں اس قسم کی ذهنیت پیدا کریں کہ آئندہ نسلیں سائنس کی قوتوں کا صحیح استعمال کریں - اِس سے یہہ نتیجہ هرگز نہیں نکالنا چاهیے کہ چونکہ سائنس کی ترقی سے جنگ بہت زیادہ مہلک اور نقصان دہ هوگئی هے اس لیے همیں سائنس سے دستبردار هو جانا چاهیے - قابل اعتراض وہ ذهنیت هے جو چیزوں کی ماهیت کے علم کو بارود بنانے میں صرف کرتی هے وہ ذهنیت نہیں جو ماهیت دریافت کرتی هے - علاوہ بریں بقول پیغمبر اِسلام صلعم کے علم و حکمت (جس میں سائنس اور فلسفہ وغیرہ سب شامل هیں) ایک ایمان والے کی کهوئی هوئی پونجی هیں - جہاں کہیں بهی وہ ملیں ان کو حاصل کرنا چاهیے؟ ان چیزوں میں مشرق و مغرب کی تمیز کوئی معنی نہیں رکهتی کیونکہ سائنس (اِنسانی حدود کے اندر ایسے یقینی اور منتظم علم کا نام هے جس کا اطلاق هر جگہ اور هر موقع پر هو سکتا هے - وہ ابدی حقائق کی حامل هے اور هم کو اس سے فائدہ اُتهانے کا اتنا هی حق اور هم پر اس کی خدمت کرنے کا اتنا هی فرض هے جس قدر اهل مغرب پر - زمانہ ماضی میں بعض علوم میں هندوس نے خواہ کتنی هی ترقی اور جد و جهد کی هو اور اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں؟ جب باقی تمام دنیا میں علمی تاریکی چهائی هوئی تهی؟

مسلمانوں نے سائنس کی خواہ کچھہ بھي خدمت اور علمبرداري کي ہو، اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں ہمارے ملک میں سائنس کي طرف سے بہت غفلت کي گئي ہے - اس کا ایک دلچسپ ثبوت یہہ بھي ہے کہ اگر ہمارے ملک کا کوئي ماہر سائنس کوئي علمي تحقیق کرکے اہل مغرب سے خراج تحسین وصول کرتا ہے جیسے بوس یا رامن تو ہم اور ہمارے اخبار فخر کے مارے پھولے نہیں سماتے - گویا خود ہمیں تعجب ہے کہ ہمارے یہاں ایسے آدمي کیونکر پیدا ہو گئے! اور ہم یہہ نہیں سمجھتے کہ دوسرے مغربي ملکوں میں جہاں کي آبادي نسبتاً بہت کم ہے لیکن ہمارے ہي جیسے انسان بستے ہیں سیکڑوں آدمي ایسے ہیں جو اس قسم کي علمي تحقیقات کرتے ہیں اور اعلیٰ ترین اسناد اور اعزاز حاصل کرتے ہیں - قوم کي علمي زندگي میں سائنس کے عنصر کي کمی کي وجہ سے ہماري ذہنیت میں بھي ایک مخصوص کمزوري اور نقص پیدا ہوگیا ہے - تنقید، صحت عمل، ہر اسراد معاملات کے ہر پہلو کو سوچنا غور کرنا اور تولنا، جذبات اور ذاتي میلانات کو علم اور دماغ کے تابع کرنا، - یہہ تمام علمي صفات جو ایک مکمل سیرت کے لئے ضروري ہیں ہمارے ہاں بحیثیت مجموعي اور مقابلۃ کم ہوتي جا رہي ہیں - نئي تعلیم جو ہندستان میں قومي ضروریات کے لحاظ سے متشکل ہوگي وہ عام تعلیم میں سائنس کو ایک اہم جگہ دےگي اور اعلیٰ تعلیم میں اس ذہنیت کي صحیح قدر کو تسلیم کرےگي جو سائنس کے صحیح اور پُر احترام مطالعہ سے پیدا ہوتي ہے -

دوسری قابل قدر خصوصیت مغربي تہذیب کي یہہ ہے کہ اس نے سائنس کو انساني مفاد کے حصول کے لیے استعمال کیا - اور مختلف اقتصادي، صنعتي، طبعي اور آمد و رفت وغیرہ کے مسائل کو حل کرنے اور آسان کرنے کے لیے اس سے فائدہ اٹھایا - علم اور حق کي تلاش

محض تلاش کي خاطر بھي ايک نہايت ضروري چيز ھے اور اکثر خصوص
گذشتہ - زمانوں میں علمي ترقي انھیں لوگوں کی بدولت ھوئی ھے
جنھوں نے بغیر کسي فائدہ یا دولت کے خیال کے اپني زندگي تلاش
حق کے لیے وقف کردي تھي - بقول پروفیسر میکنزي کے :—

" بالخصوص ھم دنیا کي تمام چیزوں کے متعلق صحیح علم حاصل
کرنا چاھتے ھیں نہ صرف اس لیے کہ علم قوت ہے ، نہ صرف اس لیے
وہ دوسري چیزوں کے حصول کا ذریعہ ھے بلکہ اس لیے
ھماري فطرت میں یہہ بات شامل ھے کہ ھم تلاش حق کریں
اور بغیر جانے کے ، بغیر علم کے خود یابي ممکن نہیں - اور شاید اس
وجہ سے بھی ، کہ ھم کو یہہ پختہ عقیدہ ھے کہ یہہ عالم جس میں ھم
رھتے ھیں ، باوجود اپنی بہت سي مشکلات اور خرابیوں کے اس قابل
ھے کہ ھم اس کو سمجھیں اور جانیں - "

لیکن سائنس کی ترقی ، محض بطور ایک کتابي علم کے ، کافی
نہیں - اس کا تعلق دنیاے آب و گل سے ھے اور اس کی طرف اس کو
اپني توجہہ پھیرني چاھیے ، اس کي حالت کو بہتر بنانے کے لیے اس کو
اپني قوتیں صرف کرنی چاھئیں - اھل مغرب نے جہاں سائنس کا استعمال
بارھا اور جا بجا محض تخریبی یا خود غرضانہ طریقے سے کیا ھے وھاں
یہہ بھی تسلیم کرنا لازمی ھے کہ انھوں نے اس کو مفاد عامّہ کے لیے
انساني زندگي کي تکلیفوں کو کم کرنے کے لیے ، اس کي آسائشوں کو
بڑھانے کے لیے بھی استعمال کیا ھے - اقتصادي پیداوار کے طریقوں
اور صنعت و حرفت کے نظام میں انقلاب بیدار کر کے انھوں نے اس
امکان کو ظاھر کر دیا ھے کہ اگر سماجی زندگي کي صحیح تنظیم کی
جاے تو فرصت اور اس کے تہذیبي مشاغل نہ صرف دولتمندوں کی
زندگی کا جزو بن سکتے ھیں بلکہ دنیا کے ھر غریب مزدور کے حصہ میں

آ سکتے ھیں - وسائل آمد و رفت اور تبادلۂ خیالات کی تکمیل کر کے انھوں نے اس خیال اور جذبہ کي پرورش کے لیے ماحول مہیا کر دیا ھے کہ تمام نسل انسانی بمنزلہ ایک خاندان کے ھے اور اس کي اجتماعي ترقي کے لیے سب کا اشتراک عمل ضروری ھے - بہت سي بیماریوں اور متعدي امراض کے لیے چیلي علاج دریافت کر کے انھوں نے لاکھوں انسانوں کو ایک ایسي زندگی سے نجات دلا‌ئي ھے جو موت سے بدتر تھی - شہروں قصبوں اور گاؤں ميں صفائي اور حفظان صحت کا بہتر انتظام ، طباعت کی آسانیوں اور کفایت کی بدولت علم اور علمي ذخیروں کو معمولی استطاعت کے لوگوں تک پہنچانا ، قدرتی ذرائع کو انسان کا محکوم بنانا اور قدرتي تباھیوں سے انسان کي حفاظت ، یہہ سب باتیں سائنس کے صحیح اور جائز استعمال سے حاصل ھوئي ھیں - اور ھم لوگوں کو جن کے سامنے ایک وسیع اور عظیم‌الشان ملک کی تنظیم کا مسئلہ درپیش ھے اپنے اکثر مسائل کے حل کے لیے سائنس کي طرف رجوع کرنا پڑے گا ھندستان کے افلاس کا ایک بہت بڑا سبب یہہ ھے کہ ھم اپني قدرتي دولت اور ذرائع سے پوري طرح فائدہ نہیں اٹھاتے ، ھمارے جنگلوں اور کانوں اور پہاڑوں اور بہتے ھوئے دریاؤں اور زر خیز زمین میں جو خزانے دولت کے پوشیدہ ھیں وہ سر بمہر رکھے ھوئے ھیں ، ھم ان کو استعمال نہیں کرتے ، اس کے لیے جس قسم کي صنعت و حرفت اور انجینیری وغیرہ کی تعلیم کي ضرورت ھے وہ ھمارے ھاں بہت کم ھے - اس طرح ھمارے دیہات کی ناگفتہ بہ حالت ، ھمارے صحت کي خرابیاں اور روز بروز جسمانی قوت اور مدت حیات کا کم ھونا یہہ سب مسائل اس بات کے محتاج ھیں کہ ھم بہت وسیع پیمانے پر سائنس کو قومي ضروریات اور قومی زندگی کی بہتری کے لیے استعمال کریں - ماحول کو بہتر بنانا اور مادي اور جسمانی آسائشیں فراھم کرنا بجائے خود کافي

نہیں - لیکن جو لوگ موجودہ فلسفہ اور خیال کی روش سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جسم اور دماغ ، مادہ اور روح بالکل جداگانہ یا متضاد چیزیں نہیں ہیں اور زندگی میں اعلی قدور کو راہ دینے کے لیے اس کے مادی ماحول کا بہتر بنانا بھی ایک ضروری امر ہے - اگر انسان کی تمام توجہ اور وقت اپنے مریض جسم کی نگہداشت میں صرف ہو یا گرد و پیش کی کیفیت اور راصاف فضا کسی شہر یا قصبہ کی تمام آبادی کی صحت خراب کردے یا صنعت و حرفت کے نئے طریقوں سے ناواقفیت آبادی کے ایک بڑے حصے کو ایسے تھکانے والے کاموں میں مصروف رکھے جو زیادہ عمدگی اور کفایت سے مشین کے ذریعہ ہو سکتے ہیں تو ہم کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ وہ قوم علمی ، اور اخلاقی اور تمدنی جد و جہد میں اپنی قوتوں کو استعمال کر سکے گی ؟

تیسری چیز جو ہم کو مغربی تہذیب سے اخذ کرنی ہے وہ ان کا نظم و نسق ہے - یہہ کہنا کہ خود ہمارے عہد ماضی میں ، مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے علحدہ علحدہ بھی ، اور مشترک طور بھی ، ملکی نظم و نسق میں بہت بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں میرے خیال کی تردید نہیں ہے - - اس میں شک نہیں کہ ہم کو اپنے ماضی کے کارناموں سے عبرت اور ہمت دونوں چیزیں حاصل کرنی چاہئیں اور ماضی کی مثالوں سے قوت اور سبق لینا چاہیے - لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ ہم کو بہت زیادہ فائدہ ان قوموں کے ملکی اور معاشرتی انتظام کے مطالعہ سے ہوگا جو آج کل کے حالات میں اور کم و بیش ہمارے جیسے مسائل میں گھرے ہوئے بہت بڑے پیمانے پر اپنی اجتماعی تنظیم کر رہی ہیں - میرا خیال ہے جیسا کہ میں آگے چل کر زیادہ وضاحت کے ساتھہ ذکر کروں گا ، کہ ہمیں اپنے لیے نصب‌العین اور اخلاقی اصول تلاش کرنے کے لیے کسی اور ملک یا تہذیب کی طرف رجوع کرنے کی

ضرورت نہیں - کچھہ تو اس وجہ سے کہ ان کا تعلق قومی خصائص سے اس قدر گہرا اور قریبی ہے کہ ان کو کہیں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا - وہ قومی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ساتھہ ساتھہ نشوونما پاتے ہیں - اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ ہندستان میں جن تہذیبوں کا امتزاج ہوا ہے ان کے بنیادی اصولوں اور اعمال میں ایسے اٹل اخلاقی اصول اور نصب‌العین موجود ہیں جو ہمارے آئندہ زندگی کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے ہیں - مگر اُصولوں کو بحیثیت اصولوں کے تسلیم کرنا اور اُن کا احترام کرنا اور چیز ہے اور ان کو افراد کی روز مرہ زندگی میں اور قوم کی مجموعی زندگی میں عملی شکل دینا اور بات ہے ہماری ایک بڑی کمزوری یہہ ہے کہ ہم اپنے اکثر اصولوں اور خیالات کو متفقہ کوشش کے ذریعہ عملی جامہ نہیں پہنا سکتے - اور اس کے لیے جس نظام کی ضرورت ہے وہ مہیا نہیں کر سکتے - ہر باقاعدہ اور کامیاب "نظام" کے لیے ، جیسا کہ اس کے اصطلاحی معنوں سے ظاہر ہے ، نظم و ترتیب کی ضرورت ہے - افراد میں "ضبط نفس" کی ضرورت ہے - اور یہہ ضبط نفس جس کو انگریزی میں ڈسپلن کے لفظ سے ادا کرتے ہیں ہماری انفرادی اور قومی زندگی میں بہت کچھہ مفقود ہو گیا ہے - ذاتی خواہشات اور مفاد کو مفاد عامہ کا تابع کرنا ، سماجی زندگی کے لیے باہمی رعایت اور رواداری ، اشتراک عمل کی صلاحیت ، تجاویز اور اور پالیسی پر استحکام کے ساتھہ عمل کرنا اور وقتی ناکامی سے شکست نہ کھانا ، یہہ وہ صفات ہیں جو قوموں کو طاقتور اور منتظم بناتی ہیں - اور ہمیں تعلیم کے ذریعہ ان صفات کی نشوونما کرنی ہے - جب تک یہہ صفات قومی سیرت کا جزو نہ بنیں گی ہم کسی بڑے پیمانے پر اپنے اصولوں اور نصب‌العین کو حاصل نہیں کر سکتے - اسلام نے دنیا کو سب سے پہلے اخوت اور مساوات کا سبق نہایت صاف اور واضح الفاظ

میں بڑھایا اور اپنے ابتدائی دور میں ان اصولوں کو جمہوریت کے سیاسی جامہ میں ملبوس کر کے دکھا دیا - لیکن بعد میں آنے والوں نے اس اصول کو سیاسی زندگی کا رہبر نہیں بنایا اور خود مختار خاندانی بادشاہیاں قائم کر دیں - برخلاف اس کے یورپ کے پاس اخوت اور مساوات کا اصول اپنی موجودہ سیاسی شکل میں انقلاب فرانس اور اس کے نعقلی بیس رو اور ابخروں کے پاس سے آیا تھا اور اس کی بنیاد کسی مستحکم مذہبی یا عقیدت یا گہرے اندرونی احساس پر قائم نہ تھی - تاہم یورپ اور امریکہ نے رفتہ رفتہ اس کو موجودہ سیاست کی سب سے زیادہ زوردار اور منظم قوت بنا دیا اور اس کے لیے مناسب ادارے اور قوانین بنا دیے جنھوں نے اس کو ایک پائدار شکل دے دی - اگرچہ یورپ میں کہیں کہیں اس جمہوریت کو نا کامی ہوئی ہے اور بعض لوگ اس کے عقائد سے منحرف ہیں تاہم اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ موجودہ زمانہ کی نہایت زبردست سیاسی قوت ہے -

اسی طرح ہندوؤں کے مذہب میں اور مسلمانوں کے مذہب میں نہایت وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ اقتصادی زندگی کی ہدایت کے لیے ایسے اصول وضع کیے گئے ہیں جن سے امیروں اور غریبوں کے درمیان ایسے تعلقات قائم نہ ہوں جو انسانیت کی شان کے خلاف ہیں اور سماجی نظام کو درہم برہم کر دیں دولت کو ایک امانت بتایا گیا ہے جس کو بہت ذمہ داری اور سمجھ کے ساتھ صرف کرنا چاہیے - اس میں سے غریبوں کا حصہ نکالنا چاہیے اور ہر طرح کے بے بس اور بیکس لوگوں کی امداد کرنی چاہیے - امیروں کو بھی کبھی کبھی دولت اور دنیاوی عیش اور آسائشوں کے معاملہ میں ضبط نفس اور ریاضت سے کام لینا چاہیے - ان امور کی تاکید دونوں تہذیبوں کے اصولوں کا جزو ہے - یہاں تک کہ ہندو مذہب

میں اس نے دان پن کی وہ مبالغہ آمیز شکل اختیار کر لی ہے جو مستحق اور غیر مستحق میں بھی تمیز نہیں کرتی اور سماجی زندگی کے مصلحتوں کو ناراض کرتی ہے - اسی طرح اسلام نے زکوۃ اور خمس اور خیرات کے نہ صرف اصول بیان کیے بلکہ ان کی عملی شکلوں کو بھی واضح اور معین کردیا تا کہ رود فراموش اور کمزور انسانوں کو آسانی کے ساتھ ان چیزوں کو بھولنے کا موقع نہ ملے - لیکن اجتماعی زندگی کے انتشار نے اسلامی جماعتوں میں اس مفید اور قابل قدر نظم کو قائم نہیں رہنے دیا اور تمام ہندوستان میں بالعموم کوئی ایسے ادارے، وسیع اور قومی پیمانے پر قائم نہیں ہیں، جو مختلف قسم کے محتاجوں، اپاہجوں، بوڑھوں اور بے بسوں کی نگہداشت کریں، افراد اپنی اپنی جگہ پر غیر منتظم طریقے سے کوشش کرتے ہیں لیکن وہ اس عظیم الشان مسئلہ کا خاطر خواہ حل نہیں کر سکتے - اس کے لیے جس متحدہ قومی پالیسی اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے وہ ناپید ہے - برخلاف اس کے مغربی ممالک میں، زیادہ تر اقتصادی اور عملی مشکلات سے مجبور اور ایک عام انسانی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہوکر، اس معاملہ کو بہت زیادہ اہتمام اور کامیابی کے ساتھ اٹھایا گیا ہے حکومت، یعنی قوم بحیثیت مجموعی بے روزگاروں کو روزگار سے لگانا اپنی ذمہ لیتی ہے - بیواؤں اور بوڑھوں کو پنشن دیتی ہے، بچوں کی تعلیم کا نہ صرف انتظام کرتی ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ان کے اور اخراجات کو برداشت کرتی ہے اور مختلف طریقوں سے اقتصادی زندگی کی بے انصافیوں اور مظالم کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے - یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کی، دوررس اور عالم گیر تحریکوں اور سودمند تجاویز کی کمی کی ذمہ داری بڑی حد تک گورنمنٹ پر عاید ہوتی ہے جو قومی گورنمنٹ نہیں ہے - لیکن ملک اور قوم بھی بہ حیثیت مجموعی اس الزام اور

ذمہداري سے بري نہيں هو سکتي کہ ان مسائل کو حل کرنے کي کوئی بہت کامياب اور متحدہ کوشش نہيں کي گئی - اور يہ امر بھي ياد رکھنا چاهيے کہ علاوہ ان جزوي انتظامات کے ؛ جو اقتصادي نا همواريوں کو درست کرنے کے ليے مغرب ميں کيے گئے هيں ؛ جو منظم تحريکيں موجودہ نظام سرمايہداري کے مد مقابل هوکر آج کل دنيا ميں اپنا اثر پيدا کر رهي هيں مثلاً سوشلزم يا روس کا اقتصادي نظام وہ بھي زيادہ تر مغرب کے خيالات اور قوت تنظيم کا نتيجہ هيں - اور جب تک هماري تعليم اجتہاد اور جدت خيال کی قوت اور اس کے ساتھہ ساتھہ "فعاليت" پيدا نہيں کرے گي اس وقت تک هم اپنے کو بہ حيثيت ايک قوم کے دنيا کے نئے حالات اور ماحول کے ساتھہ همآهنگ نہيں بنا سکيں گے -

(۲)

اميد هے کہ مندرجہ بالا بيان سے يہ خيال پيدا نہيں هوگا کہ ميں مغرب کي اندھي تقليد کا قائل يا مغرب کي هر چيز کا معترف هوں ميں اب تک يہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ قومي سيرت کي تشکيل جو همیں درپيش هے دنيا کے موجودہ حالات اور واقعات سے جاهل رہ کر نہيں هوسکتي بلکہ هم کو عمداً يہ سوچنے اور غور کرنے کي ضرورت هے کہ کن لحاظ سے همیں اپنے کيرکٹر کو خاص طور پر مضبوط کرنا چاهيے - اس غور و فکر سے معلوم هوتا هے کہ موجودہ زمانے کي ضروريات کے خيال سے هم کو بعض ان خصائص پر توجہ کرني چاهيے جو آج کل مغرب کي ترقي يافتہ اقوام ميں زيادہ نماياں هيں يعنی سائنس کا حصول اور اس کے ذريعہ فطرت کي تسخير ؛ انساني مسائل کے حل کے ليے سائنس کا استعمال ؛ عمليت اور نظم و نسق جو بڑے پيمانے پر قوم کي منتشر قوتوں کو ايک شیرازہ ميں پرو دے اور اجتماعي تحريکوں کو اٹل بنا دے - ليکن ان کے ساتھہ ساتھہ همیں بعض ان قدرو کو دوبارہ زندہ کرنے کي

ضرورت ہے جو زمانہ ماضی میں ہماری خصوصیات میں شامل رہی ہیں لیکن اب کچھہ مغرب نے خراب اثرات کے اور کچھہ عام انتشار کی وجہ سے قومی زندگی سے مفقود ہو گئی ہیں یا ہونی جاتی ہیں -

ان قدروں میں ایک اہم حیثیت علم کو حاصل ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی تہذیب میں ہمیشہ ایک مقدس اور روحانی ترکہ سمجھا گیا ہے - اور اس کو ہمیشہ مذہب اور مذہب کے معلمین سے ایک خاص قریبی تعلق رہا ہے - یہاں تک کہ بعض مذہب مثلاً ہندو مذہب میں ہر علم کو صرف مذہبی پیشواؤں یعنی برہمنوں کی جماعت تک محدود کردیا گیا تھا بر خلاف اس کے اسلام نے ہر علم کو خواہ وہ دینی ہو یا دُنیوی انتہائی اہمیت اور عزت دی اور بتدر انتظامات اس کا حاصل کرنا ہر شخص پر فرض کر دیا لیکن اُس زمانہ میں لوگ علم کو علم کی خاطر حاصل کرتے تھے یعنی اس کی اتنی قدر کرتے تھے کہ اس کے حصول میں عمریں صرف کردیتے تھے - ملکوں ملکوں ماہرین علم کو تلاش کرتے پھرتے تھے - اور ان کو صرف ضروری یا مفید باتیں بتانے والا ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ در حقیقت ان کو اپنا گُرو یا مرشد مانتے تھے اور ان کا غیر معمولی حد تک احترام کرتے تھے - یورپ میں از منہ متوسط کے بعد، مختلف سیاسی اور معاشرتی اثرات کی وجہ سے تعلیم کا تعلق رفتہ رفتہ مذہب سے ٹوٹ گیا - دُنیوی علم اور دینی علم میں بہت وضاحت کے ساتھہ تمیز کی گئی اور علم کا افادی یا اقتصادی پہلو غالب آنے لگا - جب مغربی تعلیم ہندستان میں رائج ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان قرار پائی تو یہی خیالات زیادہ نمایاں شکل میں یہاں بھی پھیلنے لگے -

اول تو عربی، فارسی، سنسکرت جو تہذیب و تمدن اور مذہب و علوم کی زبانیں تھیں اور لوگوں کے ذہن میں ان کا مذہبی احترام تھا وہ رفتہ رفتہ تعلیم کے نظام سے کم ہونی شروع ہوئیں اور ایک غیر ملکی

زبان جس کے ساتھہ کوئی ایسے عقیدہ یا احترام کے تعلقات قائم نہیں تھے ان کی جگہ پر مسلط ہو گئی - دوسرے اس نئی تعلیم کے حاصل کرنے کا مقصد، بلکہ اس کا اعتراف شدہ نصب‌العین یہی تھا کہ نئی حکومت کے لئے سرکاری ملازم اور عہدہ‌دار تیار کرے جو مختلف طرح کے دفتری کاموں کو انجام دے سکیں - نتیجہ یہہ ہوا کہ علم اور تعلیم دونوں محض افادی اور دنیوی ہوکر رہ گئے اور عام طور پر لوگوں کے ذہن اور دل سے یہہ بات محو ہو گئی کہ تعلیم کے اصل مقاصد اور اعیان اس سے بہت بلند ہیں اور علم کا حاصل کرنا بجائے خود ایک قدر مستقل ہے جس کو فراموش کرنا نہایت مہلک غلطی ہے .. یہی وجہ ہے کہ جو تعلیم ہمارے مدارس میں دی جا رہی ہے اس کا کوئی دیر پا اثر قومی اخلاقی اور قومی سیرت پر نہیں پڑتا - اور ملک کا علمی معیار کم ہوتا چلا جاتا ہے یہہ صورت حال اصلی ہندستانی ذہنیت کے منافی ہے اور اس کا تدارک کرنا ماہرین تعلیم کا فرض ہے -

دوسرے ہندستان کے تعلیمی اور سماجی نظام کی یہہ خصوصیت رہی ہے کہ حصول علم میں افلاس کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا - طلب صادق اور استقلال اور قابلیت کا ہونا کافی ہے - جو طالب علم ان صفات کو لے کر علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلتا تھا اس کے لیے ہر طرف دروازے کھلے ہوتے تھے - بڑے بڑے اساتذہ اپنی اپنی جگہ، بالعموم عبادت گاہوں میں درس دیتے تھے اور وہ چشمہ سب علم کے پیاسوں کے لیے کھلا ہوتا تھا - فیس، داخلہ، عمر کی قید، اس قسم کی رکاوٹیں نہ ہوتی تھیں - لیکن جوں جوں تعلیم زیادہ منتظم ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے راستے میں بندشیں پیدا ہوتی جاتی ہیں - چنانچہ اس وقت ہندستان میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے بچوں کی ملے گی جن کو نہ صرف آگے تعلیم پانے کی خواہش ہے بلکہ دماغی قابلیت کے لحاظ سے وہ

اس کے اهل بهي هيں ليکن مفلسي کي وجه سے وه اپني خواهش کو پورا نهيں کر سکتے بلکه بعض مرتبه تعليم شروع هي نهيں کر سکتے - اس ميں شک نهيں که تعليم کو عام کرنے کي کوشش کي وجه سے بهت سي دقتيں اور مسائل پيدا هو گئے هيں جن کي وجه سے بعض تکاليف سے بچنا نا ممکن هے - ليکن مدرسوں کي تعليم کو محض ايک اقتصادي خريد و فروخت بنا دينا تعليم کے روحاني عنصر کو نظر انداز کرنا هے - اگر اس کے ساتهه يه بهي خيال رهے که معمولي مدارس کے مدرسين کي تنخواهيں کس قدر قليل هيں اور ان کي سماجي حيثيت کس قدر کم سمجهي جاتي هے تو يه بات ظاهر هوجائے گي که نه صرف موجوده نظام تعليم بهت سے ذهين طلبا کو اپنے حلقهٔ اثر سے باهر رکهتا هے بلکه جن طلبا کو داخل بهي کرتا هے ان کے ليے بهي بهت سستي قسم کي تعليم فراهم کرتا هے - همارے ماهرين تعليم کو ايسے ذرائع اختيار کرنے پڑيں گے که وه نظم و نسق کي پيچيدگيوں کے باوجود تعليم کي قدر روحاني کو قائم رکهيں اور ذهن اور علمي لحاظ سے مستحق طلبا کو تعليم کے کسي درجه سے بهي محروم نه کريں -

تيسري خصوصيت جس کا ذکر ضمناً اوپر آچکا هے تعليم اور مذهب کا قريبي تعلق هے - يه مسئله هميشه صاحبان فکر کے درميان اختلاف کا باعث رها هے که تعليم کا مذهب سے کيا رشته هونا چاهيے - اور بالعموم مذهبي اور ملکي حکام ميں جو کشمکش اس بارے ميں رهي هے اس کا نتيجه گذشته سو سال ميں ملکي حکام کے حق ميں هوا هے - دنيا کے بيشتر ممالک ميں اس وقت تعليم؟ تمام تر يا زياده تر؟ مذهبي گروه کے هاتهه سے نکل کر حکومت کے هاتهه ميں چلي گئي هے - يهه امر ايسا نهيں جس پر افسوس کيا جائے کيوں که زمانه ماضي ميں بسا اوقات ايسا هوا هے که مذهب کے پيشواؤں نے تعليم کو اپنے قبضه ميں لاکر ذهني

آزادي کو مقيد کرنے کي کوشش کي هے اور وہ علم کي ترقي کے راستے میں حائل هوئے هیں - لہٰذا اصولاً یہي بہتر هے که تعلیم مذهبي گروه کے غلبه اور تصرف سے آزاد رهے - لیکن یه بات اس معني میں صحیح هے جس معني میں یہه کہنا صحیح هے که تعلیم کو سیاسي اثر سے آزاد رهنا چاهیے یعنی کسی خاص حکومت یا پارٹي کو یہه حق حاصل نہیں که وه تعلیمی وسائل اور ذرائع کو ان کے اصل مقصد سے هٹاکر اپنے محدود مقاصد کے لیے استعمال کرے جیسا اکثر تاریخ میں موجود هے - اس کے یہه معني نہیں که تعلیم کو روح مذهب سے، مذهبي نقطه نظر سے کوئی تعلق نہیں هونا چاهیے - تعلیم اور مذهب میں اس طرح کا تفرقه پیدا کرنا کسی قوم کے لیے مفید نہیں هو سکتا اور خود دانایان مغرب جنہوں نے بہت کوشش سے تعلیم کو پادریوں کے اثر سے نکالا تها اب یہه محسوس کر رهے هیں که تعلیم کا رشته مذهب سے منقطع کر دینا ایسا هے جیسا کسی طوفاني سمندر میں کشتي کے رسوں کو کاٹ دینا یا اس کے قطب نما کو ضائع کر دینا - اس کا اثر یہی هوگا که کشتی بالکل بے مہار هو کر هچکولے کهانے لگے گي - زندگي کو کسی مستقل فلسفه اور نصب‌العین کے ساتهه وابسته کرنے کے لیے لازم هے که معلم مذهب کی روح کو سمجهے اور مطالعه کرے اور وه احترام اور ابدي قدرو کے ساتهه وابستگي جو مذهب کا مخصوص عطیه هے اپنے طلبا میں پیدا کرے - پروفیسر میکنزي اپني کتاب زندگي کے بنیادي مسائل" میں مذهب اور زندگي کے تعلق سے بحث کرتے هوئے لکهتے هیں :—

"در اصل یہه نا ممکن هے که هم دنیا میں انساني زندگي کے بنیادي مقاصد کو سمجهے بغیر سماجي زندگي کے مسائل کو خوبي کے ساتهه حل کر سکیں - انساني زندگی کے تمام مسائل ایک دوسرے سے مربوط هیں اور ان میں سے کسي کو بهي هم اچهی طرح نہیں سمجهه

سکتے جب تک یہہ نہ سمجھیں کہ انسان کیا ہے؟ کیا ہونا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے - انسانی زندگی ایک تلاش ہے بہترین چیزوں کی؟ خواہ ہم اس کو اچھی طرح سمجھہ کر کریں یا پوری طرح نہ سمجھیں" - یہہ سوال کہ ہم کیا ہیں؟ کیا بننا چاہتے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں ایسے ہیں کہ ان کا تشفی بخش جواب صرف سائنس یا فلسفہ سے نہیں مل سکتا - اس کے لیے انسان کو اس وجدانی احساس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جو اس کو مذہب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے - کیونکہ کسی سمجھہ دار انسان کے لیے یہہ ممکن نہیں کہ وہ کائنات کے دو مکمل تصور بناوے ایک علمی اور دوسرا مذہبی اور وہ ایک دوسرے سے بالکل علحدہ اور مختلف رہیں - پروفیسر اشپرانگر جو برلن یونیورسٹی میں تعلیم اور فلسفہ کے استاد ہیں اپنی معرکۃالآرا تصنیف "نفسیات عنفوان شباب" (مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب) میں لکھتے ہیں :—

"نفس انسانی کا جو نقطہ تصور کائنات کا جزو ہے وہی معرفت الہی کا سرچشمہ بھی ہے - فلسفہ کے حقائق و معارف اصل مذہب تو نہیں لیکن مذہب کی داخلی بنیاد ضرور ہیں - نظام عالم کے مقصد و منشاء کا احساس؟ خواہ وہ ہمارا دائمی سرمایہ حیات ہو یا کبھی کبھی بجلی کی طرح چمک کر ساری کائنات کا بھید ہم پر کھولے؟ مذہبی واردات کی جڑ ہے - اور چونکہ یہی احساس مافوق الطبعیات کا سرچشمہ بھی ہے اس لیے مافوق الطبعیات بھی مذہبی ہی پر مبنی ہے - یہہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے ذہن میں دو تصور کائنات ہوں ایک مذہبی اور ایک علمی - بلکہ جب کبھی علم آخری اور یقینی نتائج تک پہونچتا ہے تو مذہبی وجدان سے علمی تفکر؟ اور علمی تفکر سے مذہبی وجدان پیدا ہوتا ہے - وہی ایک چیز ہے جس میں اگر

ایک عنصر غالب ھے تو مذھب کہلاتي ہے اور دوسرا غالب ھے تو مافوق الطبیعیات،" ۔

"نظام عالم کے مقصد و منشا کا احساس" پیدا کرنا اور انسان اور اس کي زندگي کو اس عظیم‌الشان مقصد سے مربوط کرنا ھي مذھب کا کام ھے اور اگر تعلیم کا تعلق مذھب سے اس معني میں توت جاۓ کہ طالب علموں میں یہہ احساس پیدا نہ ھو اور وہ اپني انفرادی زندگي کو اس کے وسیع تر ماحول کائنات کے ساتھہ ربط نہ دے سکیں تو تعلیم کا کام محض یہہ رہ جاتا ھے کہ وہ بعض ھنر مثلاً لکھنا پڑھنا، اور بعض علوم مثلاً تاریخ و جغرافیہ طلبا کو پڑھا دے - ایسي تعلیم قومي سیرت پر کوئي عمدہ اور مستقل اثر نہیں ڈال سکتي، کیونکہ وہ نوجوانوں کو ان قدور سے رو شناس نہیں کرتي جو زندگي کي ھدایت اور رھنمائي کر کے اس کو بلندی کي طرف لے جاتي ھیں - یہي وجہ ھے کہ اگرچہ انگریزي تعلیم سو برس سے زیادہ سے رائج ھے لیکن اس نے قومی سیرت کي تشکیل میں کوئي قابل ذکر حصہ نہیں لیا ۔ بلکہ یہہ کہنا چاھیے کہ اس نے لوگوں کے ذھن میں تعلیم کو محض اقتصادي مفاد اور نفس پروري کے مقاصد کے ساتھہ متعلق کر کے قومی سیرت پر بہت برا اثر ڈالا ھے ۔ گذشتہ زمانے کي تعلیم اب سے کم منتظم تھی اور مقابلتاً تھوڑي تعداد لوگوں کي اس سے بہرہ یاب ھوتي تھي ۔ لیکن لوگوں کے دل میں اس کي خاص وقعت تھي جو موجودہ تعلیم کي نہیں - اور یہہ وقعت اس وقت تک پیدا نہیں ھو سکتي جب تک اقتصادي ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھہ ساتھہ موجودہ تعلیم مذھب، قومی تمدن، قومي ادب اور قومي فلسفۂ زندگي کي مستحکم بنیادوں پر قائم نہ ھو اور اپنے لیے انھیں سر چشموں سے ھدایت اخذ کرے ۔

ایک اور قابل قدر عنصر هندستانی تہذیب میں اس کا جذبۂ خدمت رہا ھے اور وہ مروت اور باھمي رواداری، جو اپني سب سے زیادہ مضبوط اور عمدہ شکل میں خانداني زندگي کے اندر ظاهر هوتي تهی - ایک فقیر جو خود باوجود فاقہ‌کشی اور ضروریات زندگي سے محروم هونے کے سر راہ بیٹھہ کر مسافروں کو پاني پلانا اپنا فرض سمجھتا ھے، خاندان کا ایک کمائي کرنے والا فرد جو اپني محدود کمائي کو صرف اپنے نفس تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس کو خاندان کے ان تمام افراد کے لیے صرف کرتا ھے جو رشتہ داري یا مخص نا داري کي وجہ سے اس کے ساتھہ متعلق هیں، ایک عالم یا مُعلم جو ریاضت اور نفس کُشي کي زندگي بسر کرتا ھے لیکن اپنے علم کي روشني سے طالب علموں کے دیے جلاتا رهتا ھے، یہہ سب اُس تہذیب قدیم کي قابل احترام یادگاریں هیں جو اب روز بروز مٹتي جاتي هیں - منشي پریم چند نے اپنے قابل قدر ناول "چوگان هستي" میں جو سیرت سور داس کي دکھائي ھے یا اپنے دوسرے ناول "توشہ عافیت" میں بریم شنکر کي دکھائي ھے اس سے معلوم هوتا ھے کہ اس تہذیب کے بہترین نمونے کس قدر اعلی اخلاقي معیار رکھتے تھے اور اُن میں خدمت نوع کا جذبہ کس قدر سچا اور مضبوط تھا کہ اس کو نہ اپنوں کي احسان نا شناسي دبا سکتي تھي، نہ بیگانوں کي مخالفت، نہ ناکامي اس کو شکست دے سکتي تھي، نہ حکومت کي تمام قوتیں! اور هندستان کي گذشتہ سو برس کي تاریخ میں بھي جو لوگ خدمت کا ایسا هي سچا اور مضبوط جذبہ لے کر پیدا هوے مثلاً حالي، سر سید وہ تہذیب قدیم کي گود میں پلے تھے اور اس کي روایات کے حامل تھے - موجودہ دور میں اس جذبہ کا پیکر مجسم مہاتما گاندھي کي ذات ھے

لیکن اس میں بھي یہہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ اُنھوں نے تعلیم انگریزي پائي ہے لیکن ان کي سیرت کي تشکیل جن اثرات میں ہوئی وہ تقریباً سب کے سب گذشتہ تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ خود اپني ہدایت کا سرچشمہ قدیم مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت گیتا ، بائبل اور قرآن شریف کو بناتے ہیں اور اپنے لیے گذشتہ تاریخی روایات سے روشنی تلاش کرتے ہیں - قابل افسوس ہے یہہ امر کہ موجودہ تعلیم کي بدولت یہہ جذبۂ خدمت لوگوں میں آئے دن کم ہوتا چلا جاتا ہے---مقابلہ کے امتحانات ، نوکریوں کے لیے جد و جہد خانداني مراسم اور مراعات میں کمی ، خدمت نفس کی فکر ، یہہ سب چیزیں اس اخلاقی کمزوری کے شواہد ہیں جس نے قوم میں سب سے زیادہ خرابیاں پیدا کي ہیں - جب زندگی کا مقصد محض تن پروری اور انفرادی آرام اور آسائش قرار پا جاءے تو قوم میں یک جہتی ، سلوک ، رواداري کا پیدا ہونا نا ممکن ہے کیوں کہ پھر کوئی ایسا اصول زندگي باقي نہیں رہتا جو مختلف جماعتوں اور افراد کو ایک مرکز پر لاکر جمع کر دے - ہندستان میں آج کل چند جماعتیں ایسي ہیں جو خدمت کے نصب‌العین کو پیش نظر رکھہ کر کام کر رہي ہیں - لیکن ان کي تعداد اور ملک کي آبادي کو دیکھتے ہوئے - بہت ہي تھوڑي ہے - اور دوسرے ان میں بھي اکثر نفساني اغراض شامل ہو جاتے ہیں جو اصل مقصد کو ضائع کر دیتے ہیں - علاوہ بریں اصل خرابي تو یہہ ہے کہ یہہ جذبہ عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کي اخلاقی اور علمي قدور میں شامل نہیں اور ان کي زندگي پر اثر نہیں ڈالتا - مقابلۃً گاؤں کے قابل لوگ آپس میں زیادہ میل جول ، رواداري اور باهمي خدمت گذاري کے ساتھہ زندگي بسر کرتے ہیں - اور تعلیم یافتہ لوگ اپنا تمام وقت ذاتی اغراض کے لیے جد و جہد یا ایک دوسرے سے

جنگ و جدال میں صرف کرتے ہیں - وہ یہہ نہیں جانتے کہ زندگی ایک بہت بڑی امانت اور عطیہ ہے اور ہم اس کی قیمت اسی طرح ادا کر سکتے ہیں کہ اپنی تمام قوتوں کو بنی نوع کی خدمت کے لیے وقف کر دیں - اس خدمت کے لیے یہہ ضروری نہیں کہ انسان لازماً کسی بڑے عہدہ پر ہو یا خاص اثر اور رسوخ رکھتا ہو - خدمت ایک ایسا نصب العین ہے جس کو ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ؟ اپنے اپنے مخصوص حلقۂ اثر میں پورا کر سکتا ہے - گذشتہ زمانے میں تمام قوموں اور ملکوں میں جو مصلح اور پیغمبر ہوئے ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو خدمت قوم کے لیے وقف کر دیا تھا "قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے" اور اسی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی بدولت انہوں نے اثر پیدا کیا اور قوم کے اخلاق اور سیرت کو بہتر بنایا - بر خلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر وہ شخص جو روپیہ جمع کر لیتا ہے یا جوڑ توڑ یا خوش قسمتی یا اتفاق سے کسی اونچی جگہ پہونچ جاتا ہے وہ لازماً قابل احترام سمجھا جاتا ہے اور ہر معاملہ میں اس کو گوشہ نشین لیکن سچے خادموں پر ترجیح دی جاتی ہے - یہہ نظریہ جو مغرب کے موجودہ دور مادیت سے ہندستان میں آیا ہے - ہندستان کی اصلی روح کے سراسر منافی ہے - اور ہمیں اس کو قطعاً مسترد کرنے کی ضرورت ہے - کیوں کہ دولت کو خدمت پر مقدم قرار دینے سے ہمارا سارا نظام قدور درہم و برہم ہو رہا ہے اور ہو جاے گا اور انجیل مقدس کے الفاظ میں "کیا فائدہ ہے اس سے کسی انسان کو کہ وہ اپنی روح کھو بیٹھے اور تمام دنیا کو پاے -

ایک اور نہایت بلند اور مقدس اصول جو ہندستان نے اپنے گذشتہ زمانے میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ احترام حیات کا اصول تھا - یعنی جان یا زندگی خدا کا عطیہ ہے اور کسی انسان کو یہہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس عجیب و غریب عطیے کو کسی دوسرے شخص سے

چھین لے کیوں کہ یہی ایک ایسي چیز ھے جس کو انساني کوشش حاصل نہیں کر سکتي - اس اصول کا اطلاق نہ صرف انسانوں کي جان تک تھا جو اصولاً تقریباً تمام متمدن مذاھب میں قابل احترام شمار کي جاتي ھے بلکہ چھوٹے سے چھوٹے حیوان مثلاً مچھر اور ھوا اور پانی کے جراثیم کي زندگي بھي اس اصول کے ماتحت متدس سمجھي جاتي تھی ھندو مذھب اور اس سے زیادہ بدھہ مذھب اور جین مذھب نے اس امر پر زور دیا - یہاں تک کہ بہت سے لوگ ؟ خصوصاً جین مت کے پیرو اب بھی منھہ پر کپڑا باندھے رکھتے ھیں تاکہ جراثیم ھوا کے ساتھہ ان کے منھہ میں جاکر تلف نہ ھو جائیں ! اور وہ موذي جانوروں کو مارنا بھي جائز نہیں رکھتے - یہہ قرین عقل ھے کہ ھم کو اس خیال کي ان انتہائي شکلوں سے اتفاق نہ ھو اور ھم احترام حیات کے اصول میں تو اس قدر غلو نہ کریں - لیکن ان باتوں کے بنیادی اصول پر ھنسنا اور اس کا مضحکہ اُڑانا ایک نہایت اھم اور قابل قدر نصب‌العین کي توھین ھے - اور اس کے اثرات نسل انساني کے لیے بہت خطرناک ھیں - موجودہ زمانے میں "کشمکش حیات" اور "تنازع‌للبقاء" (Struggle for existence) جیسے الفاظ کي آڑ میں جو ذھنیت اور تصور زندگي پیدا ھو رھا ھے اس کے اندیشہ‌ناک نتائج دنیا ایک حد تک جنگ عظیم میں دیکھہ چکي ھے اور اگر اُن کو روکا نہ گیا تو ابھي اس سے زیادہ ھولناک مستقبل دنیا کے لیے آنے والا ھے - یہہ اصرار کہ ایک دوسرے کي جان اور مال اور حقوق کو تلف کرنا ؟ اور زندگي کو مقابلہ اور جنگ و جدل اور رقابت کے اصول پر چلانا قوانین فطرت میں شامل ھے فطرت اور انساني طبیعت دونوں کے ساتھہ نا انصافي ھے - ان حیوانات میں بھی جہاں فطرت کے قوانین کي کار فرمائي بغیر کسي روک ٹوک کے جاري ھے اور تعلیم و تمدن نے طبائع پر کوئي فرق نہیں

ڈالا ایسي مثالیں بہت کم ھیں کہ ایک ھي نسل کے جانور ایک دوسرے کو جان سے ماریں اور کھائیں - اور ان میں جہاں ضروریات زندگي کے اُصول کے لیے باھمي کشمکش کا نقشہ نظر آتا ھے وھاں باھمي اشتراک عمل ، امداد اور تقسیم کار بھي موجود ھے - اگر دو گدھے ایک مکان میں نہیں سما سکتے تو ھزاروں چیونٹیاں مل جل کر امن و امان سے زندگي بسر کرتي ھیں اور ایک دوسرے کے خون کي پیاسي نہیں ھوتیں - لیکن انسان کو اپنے لیے شاھراہ عمل اور اصول قائم کرنے کے لیے کم تر حیوانات کی زندگي سے سبق لینے کي ضرورت نہیں - اس میں سیکھنے ، نشو و نما پانے ، زندگي کو اخلاقي اصول اور قدور کے ماتحت منتظم کرنے کي صلاحیت و ودیعت کي گئي ھے اور اس کا فرض ھے کہ وہ اپني جبلّتوں کے نیچے لےجانے والے میلانوں کو زیر کرکے بلندي کي طرف پرواز کرتا رھے - اس کے لیے باعث ننگ ھے یہہ بات کہ وہ زندگي کو محض نفساني اغراض کے حصول کے لیے استعمال کرے اور ان کی طلب میں باھمي مروت ، محبت ، اشتراک عمل اور حیات انساني کے احترام کو بھول جائے - مختلف اثرات کے ماتحت ھندستاني کیرکٹر سے یہہ چیزیں کم ھوتی جا رھي ھیں اور خود ھم لوگ وہ سبق بھول گئے ھیں جو ھم نے دوسروں کو پڑھایا تھا اور عجیب بات یہہ ھے کہ وہ لوگ جو اب بھي اس اصول کی لفظي اور ظاھری پیروي کرتے ھیں مثلاً مکھیوں اور مچھروں اور بھنگوں کي جان لینے سے احتراز کرتے ھیں اس کے اصل معني اور روح کو بُھلا بیٹھے ھیں - اور ذرا سے پروپیگنڈے یا جذبات کي یورش سے بے قابو ھو کر اپنے ھم وطنوں سے لڑنے لگتے ھیں یہانتک کہ بعض اوقات ان مجنونانہ جنگوں میں جن کو اجتماعی خود کشی کہنا بےجا نہ ھوگا اکثر جانیں تلف ھو جاتی ھیں - ایک لحاظ سے یہہ بات حیرت انگیز نہیں بھي ھے - فطرت انساني کا تقاضہ ھے کہ وہ اکثر روح مذھب سے غافل

هو در محض اس کی رسوم اور علامات یعلی اس کے جسد بے جان سے تعلق پیدا کر لیتی ہے لیکن تعلیم کا یہہ فرض ہے کہ وہ اس جسم میں دو بارہ روح پیدا کرے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ پر لائے جہاں ان کا دماغ اور ان کے جذبات اور ان کے بہترین آئیڈیل سب ہم آہنگی کے ساتھہ کام کریں - دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لیے اور موجودہ تخریبی ذہنیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ قوموں میں احترام حیات کے احساس اور عقیدہ کو مستحکم کیا جائے تاکہ ہر شخص نہ صرف اپنی زندگی اور اپنے مفاد کو عزیز اور قیمتی جانے بلکہ اور سب کی جانوں اور مفاد کو بھی احترام اور رواداری کی نظر سے دیکھے - ہندستانیوں پر بالخصوص یہہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس اصول کو دوبارہ صحیح معنوں میں مضبوطی کے ساتھہ پکڑ لیں اور خود کو اپنی کوشش سے اور دنیا کو اپنی مثال سے ایک بہت بڑے خطرہ سے نجات دلائیں -

(۷)

اس مضمون میں هم نے یہہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ هندستانیوں کی قومی سیرت کی تشکیل میں بہت سے اثرات اور تہذیبوں کا حصہ ہے هندستانی طبیعت کا یہہ خاصہ رہا ہے کہ وہ بیرونی اثرات کو قبول کر کے ان کو اپنا بنا لیتی ہے اور اب بھی همارا فائدہ اسی میں ہے کہ هم اس اصول کو هاتھہ سے نہ دیں - لیکن قبول کرنے کے یہہ معنی نہیں کہ هم بغیر غور اور فکر کے ؛ بغیر تنقید اور تبصرہ کے ؛ بغیر انتخاب کے ان اثرات کو جذب کرلیں - همیں اپنی بہترین قدور اور اعیان کو زندہ اور اپنے فلسفہ زندگی کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ هم کو یہہ بھی غور کرنا چاهیے کہ موجودہ زمانہ کی ؛ جس میں بہت سے لحاظ سے زبردست تبدیلیاں هوئی هیں مخصوص ضروریات

کیا ھیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے ھمیں قومي سیرت میں کن چیزوں پر خاص طور پر توجہ کرنے اور زور دینے کی ضرورت ھے - ماحول کي تبدیلي، جو خود بڑی حد تک انسانی جد و جہد کا نتیجہ ھے، انساني تعلیم و تربیت میں ترمیم اور تبدیلي چاھتی ھے اور ھمیں اپني آئندہ نسلوں کو اس نئے ماحول کے لیے تیار کرنا ھے - اس تیاري میں عام سماجي اداروں اور تمدني انتظامات کا بھي دخل ھے جو اپنے غیر محسوس اثر سے لوگوں کے مزاج اور طبیعت کو آھستہ آھستہ بدلتے اور ڈھالتے رھتے ھیں - لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ھمارے پاس سب سے زبردست اور موثر ذریعہ تعلیم ھے جو بچپن اور بلوغ کے پُر شوق اور ولولوں اور اُمنگوں سے بھرے ھوئے زمانے میں دی جاتی ھے - قومي سیرت اور قومی زندگي کي تشکیل تو اسي طرح ھوسکتی ھے کہ ماھرین تعلیم ایک طرف بچہ کے مخصوص رجحانات اور جبلتوں کو سمجھیں اور دوسري طرف تہذیب و تمدن کے عالي شان نظام کا مطالعہ کریں اور ان میں مدرسہ کے ماحول اور مشاغل کے ذریعہ اس قسم کا نتیجہ خیز تعلق پیدا کریں کہ بچہ تعلیم کي منزل سے گذرنے کے بعد تمدني زندگي میں مکمل طریقہ سے حصہ لے سکے - اگر زندگي کے جدید مسائل اس بات کو چاھتے ھیں کہ ھم مغرب سے سائنس کو لیں تو ھمیں اس سے باک نہیں ھونا چاھیے - اگر دنیا میں ترقي کرنے کے لیے بچوں میں جدت، اجتہاد اور عملیت پیدا کرنے کي اور قسمت پرستي اور قناعت کے اصولوں میں ترمیم کرنے کي ضرورت ھے تو تعلیم کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاھیے - اگر دنیا کو باھمي جنگ و جدال اور رقابت کے خطرناک نتائج سے بچانے کے لیے ھمیں احترام حیات اور خدمت کے قدیم اور دائمي اصولوں کے ساتھ از سر نو رشتہ جوڑنے کي ضرورت ھے تو ھمیں ماضي کي طرف رجوع کرنا چاھیے اور تعلیمي نظم و نسق کے ذریعہ

اس نصب العین کو عملی جامہ پہنانا چاہیے - کہیں تعلیم کا کام زمانہ کے رجحانات کو امداد دینے کا ہے اور کہیں اس کا فرض ہے کہ ان رجحانات سے دنیا کو محفوظ اور مامون کرے کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے انسان بجائے اتفاق کی قوتوں کا تابع ہوجانے کے ان کو اپنے ارادہ اور عقل کے راستے پر چلا سکتا ہے -

موجودہ زمانہ نے انسان کے سامنے جو مسائل اور ماحول پیدا کر دیے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم کو کس قسم کی سیرت اور ذہنیت تیار کرنے کی ضرورت ہے ؟ اس سوال کا جواب ضمناً بیان بالا میں آچکا ہے - یہاں ہم مختصر اور صاف الفاظ میں ان نتائج کو پیش کرتے ہیں جو اس بیان سے نکلتے ہیں اور جن پر ماہرین تعلیم کو دیر یا سویر غور کرنا پڑے گا اگر وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم اور حیات قومی میں کوئی ربط ہو اور اس کے معنی محض نوشت و خواند یا واقفیت حاصل کرنے تک محدود نہ سمجھے جائیں -

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سائنس نے دنیا میں نہایت زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے - اور یہ انقلاب نہ صرف مادی دنیا تک محدود ہے بلکہ ہماری علمی اور اخلاقی زندگی پر بھی اس کا بہت گہرا اثر پڑا ہے - ہمارے بہت سے پرانے قرینے اور خیالات جو کم علمی پر مبنی تھے بالکل باطل ثابت ہو چکے ہیں اور علمی تحقیق و تفتیش جو برابر جاری ہے آئے دن نئے اور بعض مرتبہ انقلابی حقائق کا انکشاف کرتی جاتی ہے جن کی طرف سے منہہ موڑ لینا یا غفلت برتنا نہ صرف ذہنی خودکشی ہے بلکہ قومی ترقی کے لیے نہایت زبردست رکاوٹ ہے - اس لیے سائنس کی ترقی میں حصہ لینا ہمارا قومی فرض ہے اور ہماری تعلیم اس کو نظر انداز نہیں کرسکتی - لیکن سائنس جو صحیح معنوں میں انکشاف حقائق کا نام ہے ایک خاص ذہنیت کی طالب ہے - تعصب؟

جمود، توہم پرستی کا اور سائنس کا ساتھ نہیں ہو سکتا - اس کے لیے ایسے دل و دماغ کی ضرورت ہے جو صداقت اور محض صداقت کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور مصلحت، رر پرستی، پرانے لیکن غلط خیالات، قدیم تعصبات کو صداقت کی خاطر ترک کرنے کے لیے تیار ہو - جو کسی شخص کو اس لیے قابل دار نہ سمجھے کہ وہ کہتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے حالانکہ تمام دنیا کا یہ عقیدہ ہے کہ سورج دنیا کے گرد گھومتا ہے - جو کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ نئے حقائق کا استقبال کرے اور اپنی غلطیوں کا ایمانداری سے اعتراف کرے اور ان کو اتار پھینکنے کے لیے تیار ہو خواہ وہ مصاحبت کی وجہ سے کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو گئی ہوں - یہ ذہنیت دنیا کے کسی ملک میں بھی عام نہیں - متمدن امریکہ میں انتہائی ذہنی تعصب اور سچ کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کی مثالیں حال ہی میں فاش ہو چکی ہیں ہمارے ملک میں اس قسم کی ذہنیت خاص طور پر مفقود ہے - ہم اپنی معاشرتی اور علمی زندگی دونوں میں پرانے بتوں کو پوجتے ہیں عام اس سے کہ ہمیں ان سے کوئی فیض پہنچتا ہے یا نہیں - اور جب کوئی صاحب نظر شخص کے قائم شدہ رواج یا ادارہ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو تمام قوتیں جو رسم و رواج کی پابندی کے ساتھ وابستہ ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہیں لہذا سائنس کی تعلیم دینے سے مقصد صرف یہی نہیں کہ لوگ طبیعیات اور کیمیا اور علم نباتات اور علم حیوانات وغیرہ پڑھ لیں بلکہ اس سے زیادہ اہم اور قومی سیرت کے لیے زیادہ فوری ضرورت یہہ ہے کہ لوگوں میں یہ سائنٹفک نقطہ نظر پیدا کیا جاے - اس کوشش میں کامیابی کا اثر محض ہماری علمی زندگی تک محدود نہ ہوگا بلکہ اس کا ردّ عمل ہماری معاشرتی اور تمدنی زندگی، ہمارے سیاسی مسائل پر بھی نمایاں ہوگا -

ہم بیان کرچکے ہیں کہ سائنس نے انسان کے قبضہ قدرت میں بے انتہا قوت دیدی ہے جس کے جائز استعمال کے لیے بےحد ضبط نفس اور احساس ذمہ داری کی ضرورت ہے - سائنس کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ انسان میں ابھی تک یہہ احساس پوری طرح پیدا نہیں ہوا اس وجہ سے وہ بسا اوقات قدرت کی ان مہیب قوتوں کے ساتھہ اس طرح کھیلتا ہے جس طرح کوئی نادان بچہ کسی خطرناک ہتھیار کے ساتھہ جس کے خطرہ کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھتا - اس کی مادی اور اخلاقی نشوونما میں توازن اور ہم آہنگی نہیں - اس صورت حال سے جو خوفناک نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ تمام دنیا کو معلوم ہیں اور خود مغرب کے صاحبان فکر جانتے ہیں کہ ان سے کہیں مہلک نتائج آئندہ چل کر پیدا ہوسکتے ہیں اگر سائنس کی دریافت کی ہوئی طاقتوں کو انسانی بہبود کے بجائے باہمی ہلاکت اور تخریب کے لیے استعمال کیا گیا - اس لیے تعلیم پر یہ ذمہ‌داری عاید ہوتی ہے کہ وہ صلح پسندی اور امن جوئی کی خواہش قوموں میں پیدا کرے - ان کو مادی علمی اشتراک عمل کے فوائد اور باہمی مخالفتوں اور رقابتوں کے نتائج سے آگاہ کرے اور ان اخلاقی اور روحانی اُصولوں کی سلطنت کو مستحکم کرے جو متمدن مذاہب کی بنیاد ہیں، جو سائنس کی غیر محدود تخریبی قوت کو روکنے اور قابو میں لانے کا تنہا ذریعہ ہیں - یہ موقع نہیں کہ میں بتاؤں کہ اس اعلیٰ اور مشکل مقصد کے حصول میں معمولی ابتدائی ثانوی مدارس کس طرح مدد دے سکتے ہیں لیکن ماہرین نفسیات اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ جو طبیعت اور رجحانات بچپن کے زمانے میں مدرسہ اور گھر کے روز مرہ مشاغل سے پیدا ہوتے ہیں ان کا مجموعی اثر آئندہ عمر میں بہت دور تک پہنچتا ہے -

سائنس نے صنعت و حرفت اقتصادی نظام اور پیشوں اور کام کی نوعیت میں جو انقلاب پیدا کیا ہے ان کی وجہ سے بھی قومی سیرت کی تشکیل اور تعلیم کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے ۔ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں بہت زیادہ، اور ہندستان میں مقابلۃً کم، کام کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی ہے ۔ دستکاری کے بجائے مشین کے کارخانے، چھوٹے چھوٹے دستکاروں کی برادری کے بجائے بڑے پیمانے پر خرید فروخت، اشیا کی تیاری اور پیداوار، شہروں میں مزدوروں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کا اجتماع، تخلیقی کام کے بجائے محض مشین کے پرزوں کی طرح گھنٹوں ایک مقررہ حرکت کا انجام دینا ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہاتھہ سے کام کرنے والوں کے لیے اپنے کام میں کوئی دلچسپی یا تعلیمی مواقع یا جدت کے اظہار کا امکان نہیں رہا اور ان کی حیثیت مکمل انسانوں کے بجائے محض مشین کے پرزوں کی سی ہوگئی ۔ اب تعلیم پر یہہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کمی کی تلافی کرے اور ان میں زندگی سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرے ۔ ان کو ان کے کام کی وسیع تر معاشرتی اور قومی اہمیت سے واقف کرنا، محنت کی عظمت اور اثرات سمجھنا، اقتصادی نظام میں ان کی حیثیت سے ان کو آگاہ کرنا تعلیم کا کام ہے ۔ اس کے ساتھہ ساتھہ ان کو اس طرح تربیت کرنی چاہیے کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں تہذیبی مشاغل اور دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ہو سکیں ۔ ان کی زندگی کولھو کے بیل جیسی نہ ہو جس کو نہ کچھہ دکھائی دیتا ہے، نہ سمجھہ میں آتا ہے، جو ہر وقت ایک چکّر میں گھومتا رہتا ہے اور فرصت کے وقت کو محض گھاس اور چارہ کھانے میں گذارتا ہے ۔ تہذیب جدید کا ایک نہایت نقصان اور مضر اثر یہ ہوا ہے کہ اس نے لوگوں کے کام کو اس قدر روح فرسا حد تک "میکنیکی"

بنا دیا ہے کہ آٹھہ یا دس گھنٹے تک اس میں مصروف رہنے کے بعد
ان میں اعلیٰ قسم کی انسانی دلچسپیوں، آرٹ، فطرت، تہذیب
معاشرت" کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی ۔
وہ اپنی فرصت کے وقت نہایت ادنیٰ درجے کی دلچسپیوں میں گذارتے
ہیں جو کسی طرح سیرت اور مذاق کو بہتر نہیں بنا سکتیں ۔ معاشرت
اور صنعت و حرفت کے منتظمین کا یہ فرض ہے کہ وہ جہاں تک ممکن
ہو کام کی نوعیت میں تبدیلی کریں تا کہ اس میں کام کرنے والوں کو اپنی
شخصیت اور اپنی ذہنی اور جذباتی دلچسپیوں کی تربیت کا موقع
ملے ۔ اور تعلیم کی یہہ ذمہ داری ہے کہ وہ طلبا کو ایسے
شوقوں اور مشاغل سے روشناس کرے جو آئندہ زندگی میں ان
کی فرصت کے رفیق اور اظہار خوشی کا ذریعہ ثابت ہوں ۔ لیکن یہہ
ظاہر ہے کہ دنیا کے کام کا ایک کافی حصہ ایسا غیر دلچسپ او
" میکانیکی " ضرور رہے گا اس میں معلم یا مصور یا کسی چابکدست
کاریگر کے کام کی طرح اظہار خودی اور شخصیت کی تربیت ممکن نہ
ہوگی اس لیے انسانی روح کی عظمت اور احترام کا تقاضہ ہے کہ مدرسے
ہر فرد میں تخیل کی نشوونما کریں اور تخلیق کے جذبہ کو فروغ دیں
اور فرصت کے مشاغل کے ذریعہ جہاں تک ممکن ہو، شخصیت ا
سیرت کی تشکیل کریں ۔ " ہم اس دن کا خواب دیکھتے ہیں جب
ہم ان کے جسم اور دماغ اور روح کی اس طرح تربیت کریں گے کہ ہم ان ک
اطمینان خاطر اور بے خوفی کے ساتھہ دنیا کی کشمکش میں حصہ
لینے کے لیے جاتا دیکھیں گے اور ہر نو عمر کام کرنے والے میں انفرادی
قوت کا ایک ایسا پوشیدہ چشمہ ہوگا جس کو نہ صنعت و حرفت
مشینی نظام خشک کر سکے گا نہ زندگی کی نا انصافیاں خراب
کر سکیں گی ۔ خواہ اس کا کام محض یہہ ہو کہ وہ زمین میں ہل

چلائے لیکن اس کا دماغ دنیا کے دور دراز حدود تک پہنچیگا - خواہ مادر گیتی کو کھودنے اور اُس کا سینہ چیرنے میں اپنی عمر صرف کرے لیکن اس کے تخیل کی رسائی ستاروں تک ہوگی - مشینوں کا شور اور تجارت کی منڈیوں کی چیخ پکار اس کے کانوں کو موسیقی کی شیریں اور خوبصورت الفاظ کے ترنم کی طرف سے بہرا نہ کر سکےگی اگر ہم ان چیزوں کو اس کی زندگی کا تانا بانا بنادیں" - یہہ اندرونی قوت جو انسان کو بجائے خود ایک عالم خیال بناتی ہے اور اس کو ایک حد تک شخصیت کو مغلوب کرنے والے اثرات سے محفوظ اور سوسائٹی کے غلبے سے بے نیاز کردیتی ہے - تہذیب نفس اور تربیت کامل کے لیے لازم ہے اور اس دور میں جب کہ چار طرف مشینوں، بڑے پیمانے پر کاروبار، ادنی اور سستی قسم کے اسباب تفریح اور جمہوریت کے ہموار کرنے والے اثرات کا زور ہے اس قوت کی خاص طور پر ضرورت ہے - کوئی فلسفہ تعلیم جو قومی سیرت کی تشکیل کو ضروری سمجھتا ہے اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا -

موجودہ دور کا تیسرا رجحان جو ہندستان میں بہت واضح طور سے ظاہر ہو رہا ہے جمہوریت ہے - یہاں موقع نہیں کہ میں اس کے ارتقاء یا اس کے فوائد اور کمزوریوں سے بحث کروں - ہمارے لیے اس وقت صرف یہہ غور کرنا کافی ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں یہہ فلسفہ سیاست اپنا سکہ جما چکا ہے اور اگرچہ آج کل بعض ملکوں مثلاً اٹلی اور روس میں مختلف وجہ سے اس کی مخصوص شکل مسترد کر دی گئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس خیال اور طریقہ نظم کا نشو و نما جاری ہے اور مشرق کے اکثر ملکوں مثلاً چین، ترکی، ہندستان وغیرہ میں یا تو جمہوریت قائم ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے - بہر حال خواہ دوسرے ملکوں کی سیاسی تاریخ کوئی صورت اختیار

درے اس امر سے کسي شخص کو انکار نہ ہوگا کہ ہندستان کا سیا
مستقبل جمہوري نظام حکومت کے ساتھہ وابستہ ہے - ممکن ہے کہ بہ
صاحبان فکر اپنے نقطہ نظر سے اس نظام حکومت کو ملک کے لیے بہتر
نظام تصور نہ کریں لیکن عملی سیاست دانوں کا اس امر پر اتفاق
کہ اور کوئی طریقہ نہ قابل عمل معلوم ہوتا ہے نہ لائق ترجیح -
لیے موجودہ زمانہ میں جو تعلیم رائج کی جائے اس کے لیے ضر
ہے کہ وہ نئي نسل کو ان فرائض اور ذمہ داریوں کے لیے تیار کرے
بحیثیت جمہوری شہریوں کے اس پر عائد ہونے والي ہیں - اس لح
سے تعلیم کا سیاسي نظام سے بہت گہرا تعلق ہے - جو خوبیاں
قومي سیرت کے خصائص ایک مطلق العنان بادشاہ کي حکومت •
مفید ہوں گے وہ ایک خود مختار جمہوری حکومت میں مفید نہ
ہو سکتے - وہاں سب سے بڑي خوبی یہہ سمجھی جاےگی کہ
باشندہ حکام بالا کے سامنے ہر معاملہ میں سر تسلیم خم کر د
سیاسي اور ملکي معاملات میں اپني شخصیت کو بالکل حکومت
ماتحت بنا دے اور مشین کے پرزے کي طرح دوسرے پرزوں کے سا
مل کر کام کرے تاکہ مشین چلانے والوں کے جو مقاصد ہوں وہ کامیا
کے ساتھہ پورے ہو جائیں - بر خلاف اس کے ایک آزاد جمہوري شہ
میں دوسری قسم کی صفات درکار ہوں گي - اس میں غور و فکر
صلاحیت ہوني چاهیے ؟ ملکی معاملات کو سمجھہ کر ان پر رایے د
اور اس رایے کي ذمہ داري کو قبول کرنے کے لیے آمادگي ہوني چاهی
جدت اور اجتہاد عمل اور اُپج ہوني چاهیے تا کہ وہ خود سوچ کر ای
تدابیر نکالے اور دوسروں کے سامنے پیش کرے جو اجتماعي ترقی •
معین ہوں - مختصر یہہ کہ جمہوریت کے لیے فعالّیت کي ضرورت ہ
مجہولیت کي نہیں - ہندستاني سیرت میں ان خصائص کا پ

کرنا لازمي هے - اس میں غلط قسم کی قناعت ؛ غلط قسم کی تقدیر پرستی ؛ هاتهه پر هاتهه دهرے بیٹهے رهنے کي عادت ؛ حوصله اور همت کي کمی جو پیدا هو گئي هے اس کي اصلاح کي ضرورت هے - جمہوري ذمه داری کا احساس ایک طرف تو ذهني بیداري چاهتا هے اور دوسري طرف عملی قوت کا طالب هے اور تیسري طرف جذبات کی ایسي تربیت که هر شخص اپنے مفاد کو عام ملکي مفاد کا جز و سمجھے ؛ ان کا رقیب نه خیال کرے - اور هر تدبیر اور کام کے متعلق یهه سوچے که علاوه میری ذات کے ؛ دوسرے لوگوں کي زندگي اور حقوق پر اس سے کیا اثر پڑے گا - هندستانی سیرت ان تینوں پہلوؤں سے توجه کے قابل هے- تعلیم کي کمي کي وجه سے لوگوں میں عام طور پر اتني ذهني بیداری نهیں هے که وه ان مسائل کو سمجهه سکیں جو ملک کو در پیش هیں گذشته دس سال میں سیاسي تحریکوں نے بڑی حد تک عوام‌الناس کو بیدار کیا هے لیکن ابهي وه منزل مقصود بہت دور هے جب هر بالغ آدمي معاملات کے عام پہلوؤں کو سمجهه کر ان کے متعلق راے دے سکے گا - جذباتي رخ اس سے بهی زیاده توجه کا محتاج هے - وه انسانیت "جو تپیدن از تپ همسائگاں" کے هم معنی هے هم میں سے بحیثیت قوم کے بہت کم هو گئي هے - اور هم اکثر بجاے قومي مفاد کے اپنے ذاتي یا جماعتی مفاد کو مشعل هدایت بنا لیتے هیں اور یهي وجه هے که هندستانیوں میں باهمي اختلافات چهوٹي باتوں میں پیدا هو جاتے هیں اور قوم کي قوتیں اکثر بڑے بڑے تعمیري کاموں میں صرف هونے کے بجاے ان اختلافات کی نذر هو جاتي هیں - لیکن شاید سب سے زیاده کمي همارے قومي سیرت میں قوت عمل کي هے - هم نے یهه بهلا دیا هے که انساني کوشش اور محنت کس قدر زبردست چیز هے اور وه اس دنیاے آب و گل میں کیسے عظیم‌الشان انقلاب

پیدا کر دیتی ہے - ہم میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تقدیر کو غلط معنی پہنا کر اپنی سستی اور غفلت کو ایک گمراہ کن فلسفہ کی آڑ میں چھپاتے ہیں - قوم میں حوصلہ ، ہمت ، اپج ، بڑے بڑے کاموں کو کرنے کا جوش اور ولولہ پیدا کرنا چاہیے تا کہ ہمارے اوپر مثلاً بدنامی کا یہہ ٹھپکہ نہ رہے کہ کوہ ہمالیہ پر چڑھنے کے لیے بھی غیر ملکی بہادروں کی ضرورت پڑی - خود ہمارے سیّاحوں میں اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ اپنے ملک میں پوری طرح سیّاحت کرتے اور جان جوکھوں میں ڈال کر علم کی خدمت کرتے - ہمارے ہاں علمی قابلیت یا تکلیفیں سہنے کی قوت کی کمی نہیں - صرف حوصلے اور ہمتیں افسردہ اور پست ہیں - اور جب تک ان میں زندگی اور حرارت پیدا نہیں ہوگی جمہوری حکومت پوری کامیابی کے ساتھہ نہیں مل سکتی ہندوستانیوں کو ایک ایسی قوم کی ضرورت ہے جس میں ہر شخص کی انفرادیت کی پوری طرح نشو و نما کی گئی ہو اور وہ خندہ پیشانی اور بے خوفی کے ساتھہ ان تمام ذمہ داریوں کا بوجھہ اپنے شانوں پر اٹھانے کے لیے تیار ہو جو اس کے حصہ میں آئیں - جو اپنے خیالات کو خلوص اور قوت کے ساتھہ دوسروں کے سامنے پیش کر دے اور اپنے عقائد اور اصولوں کے لیے قربانی کرنے کو تیار ہو - جس میں اپنی روح اور اپنی شخصیت کی عظمت کا احترام ہو لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ دوسروں کی روح اور شخصیت کا احترام بھی ہو اور اس بنیاد پر وہ ان کے ساتھہ مل جل کر کام کرنے یا ان کے دکھہ درد اور خوشیوں کو بٹانے کے لیے تیار ہو - یہہ نصب‌العین الفاظ میں نہایت مشکل اور شاید ناممکن‌الحصول معلوم ہوتا ہے لیکن نصب‌العین کو ہمیشہ اتنا بلند ہونا چاہیے کہ اس کی طرف اٹھنا ممکن ہو اس تک پہنچ جانا ممکن نہ ہو - اور تعلیم اگر قوم کے ہر فرد میں یہہ صفات پیدا

نہیں کر سکتی تو اتنا ضرور کر سکتی ہے کہ بحیثیت مجموعی یہہ رجحانات قوم میں پیدا ہو جائیں اور اس کی سیرت میں نسبتاً معاملات پر جرأت اور ایمانداری کے ساتھہ غور اور اظہار خیال کرنے کی، ذاتی اغراض کو بلند تر قومی اعراض میں جذب کرنے کی، اور ہمت اور دلیری کے ساتھہ اپنے پُر خلوص عقائد پر عمل کرنے کی زیادہ صلاحیت نمایاں ہو جاوے - ایسی سیرت کا خوبی اور وضاحت کے ساتھہ نقشہ کھینچنے کے لیے میں ڈاکٹر جیمز وارڈ کی چند سطریں نقل کرتا ہوں جنہوں نے تھوڑے سے الفاظ میں آزاد جمہوریت کے ایک مکمل شہری کی صفات بیان کر دی ہیں :—

"کوئی مرد یا عورت جس کا دماغ تعصبات سے پاک ہو، جس کا فیصلہ آزادانہ ہو، جس میں اخلاقی جرأت ہو، جس کو دلائل کے ذریعہ قائل کرنے کی ضرورت ہو لیکن خوشامد اس پر کوئی اثر نہ کر سکے، جو عقل کے سامنے سر تسلیم خم کرے، دنیوی وجاہت کے سامنے نہ جھکے، جس کو محض یہہ کاوش ہے کہ وہ سچائی اور حق پر رہے اور یہہ فکر نہ ہو کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے، جو خود اپنی ذات سے سچا اور پُر خلوص ہو اور اس لیے کسی کے ساتھہ بھی دھوکہ یا جھوٹ کا برتاؤ نہ کرے، ایسے ایک مرد یا عورت کی قدر کا اندازہ لگانا نا ممکن ہے - اگر ایسے افراد کی کوئی قوم ہو تو وہ تمام دنیا کو نئی زندگی بخش سکتی ہے" -

ایک مکمل تعلیم یافتہ انسان کی اگر ہم تعریف کرنا چاہیں تو مندرجۂ بالا عبارت تقریباً اِس مقصد کو پورا کرتی ہے - اور ہمیں جس آئیڈیل کو سامنے رکھہ کر ہندستان کی قومی سیرت کی تشکیل کرنی چاہیے اس کو تقریباً واضح کر دیتی ہے - تقریباً، لیکن پوری طرح نہیں ! اِس لیے کہ اس تعریف میں انسان کے انفرادی پہلو پر زور دیا گیا ہے اور بحیثیت ایک

آزاد اور بے بہار روح رکھنے والے کے اِس میں جو صفات ہونی چاہئیں اُن کو پیش کیا گیا ہے - لیکن اِس کے معشرتی تعلقات اور فرائض کی پوری اہمیت کو بیان نہیں کیا گیا اِس میں شک نہیں کہ ہندستان جیسے ملک میں، جہاں صدیوں کی رسوم اور قدیم اداروں نے جکڑبند نے شخصیت کو مقید کر رکھا ہے اور لوگ ایک دوسرے کی نقل بن کر رہ گئے ہیں، انسانی سیرت کے اس رخ کو نمایاں کرنے کی کافی ضرورت ہے - لیکن ہم یہہ نہیں چاہتے کہ گزشتہ صدی کی تاریخ یورپ کا اعادہ کریں اور انفرادیت کے رجحان پر کسی قسم کی روک ٹوک نہ کریں یہاں تک کہ وہ نفسی نفسی کی کیفیت قوم پر طاری کردے اور لوگوں کو اپنے سیلاب میں بہا کر لیجائے - ہماری قومی سیرت میں اِس وقت خاص طور پر دوش بدوش کام کرنے کی اتفاق کی قوت سے مشکلات کو زیر کرنے کی، اتحاد عمل اور یک جہتی کی کمی ہے اور اِس عنصر کو اہمیت دینے کے لیے ہمیں خدمت اور احترام حیات کے قدیم اصولوں کو دوبارہ مضبوطی کے ساتھہ پکڑنا چاہیے تاکہ ایک طرف تو ہم میں امن پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جو صرف دوسری قوموں سے جنگ نہ کرنے هی کا نام نہیں (کیوں کہ وہ تو محض ایک نفی عمل ہے) بلکہ اِس سے یہ مراد ہے کہ ہم اپنی تمام قوتوں کو اسی جوش اور تنظیم کے ساتھہ امن کی فتوحات حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں جس طرح اِن کو جنگ کے مہلک اور تباہ کُن مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں - دوسرے ہم یہ محسوس کریں کہ کوئی زندگی اپنے پورے کمال اور خود یابی کو نہیں پہونچ سکتی جب تک اِس کا مقصد محض اپنی ذات تک محدود ہو اور وہ خودی کے محدود تصور سے گزر کر دوسروں کو بھی اِس میں شامل نہ کرے - گزشتہ سو سال میں جو تعلیم یافتہ طبقہ ہندستان میں پیدا ہوا ہے اس کے متعلق یہ شکایت ہے اور بجا شکایت ہے کہ اس نے خدمت کے نصب العین کی صحیح اہمیت کو نہیں سمجھا

اور اپنے ملک کے کم نصیب لوگوں تک اِس روشنی کو پہونچانے کی کوشش نہیں کی جو تعلیم کے ذریعہ اِن کو حاصل ہوئی تھی نہ وہ اُن کے دکھہ درد ؟ اُن کے روز مرہ کے مسائل اور مشکلات ھی میں شریک ہوئے نہ انہوں نے اُن کی اقتصادی اور معاشرتی حالت کو درست کرنے کی کوشش کی لوگوں نے فرداً فرداً کہیں کہیں اِس قسم کی کوشش ضرور کی اور گزشتہ بیس سال میں تعلیم یافتہ طبقہ نے مقابلتاً ملک کی عام حالت کی طرف زیادہ توجہ بھی کی - لیکن انفرادی کوشش اِس امر کا بدل نہیں ہو سکتی کہ تعلیم نے اِس اعلی نصب العین کو قومی سیرت کا جزو نہیں بنایا - موجودہ تہذیب کو خواہ وہ ہندستان کی ہو یا انگلستان کی ؟ چین کی یا امریکہ کی ؟ زندگی کی اعلی ترین قدور پر ایمان نہیں رہا - اِس لیے اِس کے پاس ایسے محرکات موجود نہیں جو جذبات کو اُبھاریں اور قوت عمل کو جوش میں لائیں - جو انسانی زندگی کی غیر محدود اہمیت اور قیمت اور انسانی روح کے بہترین امکانات کا احساس ہر فرد میں پیدا کر سکیں - اِس زمانہ کا سب سے بڑا مطالبہ یہی ھے کہ لوگوں کی سیرت اِس طرح تشکیل کی جائے کہ اُن کا ایمان تازہ ہو اور وہ سمجھیں کہ اُن کے ہر کام اور ہر خیال کی ایک غیر فانی زندگی ھے جس کا اثر اُن کے بعد قائم رہےگا ؟ کہ اِنسان کی زندگی نہ ایک سراب ھے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی ؟ نہ ایک غول بیابانی ھے جو اندھیرے میں چمکتا ھے اور چمک کر غائب ہو جاتا ھے نہیں اِنسان دنیا میں خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ھے تا کہ وہ خود کو اخلاق الہی کے ساتھہ متصف کرے اور اپنے تمام امکانات کو نشو و نما دے کر اُن کو آزادی کے ساتھہ مشیت الہی یعنی تکمیل اعلی ترین روحانی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرے - اور یہہ یاد رکھے کہ اگر نیک نیتی کے ساتھہ اور اصول معاشرت اور اصول اخلاق کو مد نظر

رکھہ کر وہ سائنس کی ترقی ، فطرت کی تسخیر ، اور حصول ذرائع کے لیے کوشش کرے گا تو یہہ تمام "دنیوی" جد و جہد بھی انہیں "روحانی" مقاصد کے حصول میں مدد دے گی - اور اگر وہ زندگی اور مذہب کا باھمی رشتہ منقطع کر کے دنیا کی جد و جہد اور معاملات سے منھہ موڑ کر ، محض تارک الدنیا اور راھب بن جائے گا اور عبادات میں اپنی زندگی بسر کرے گا تو اُس کو نہ صرف دنیا ھی حاصل نہ ھوگی بلکہ وہ اپنے پیش نظر مقصد میں بھی کامیاب نہ ھوگا - زندگی ، اپنی گونا گوں مشکلات اور امکانات ، کامیابیوں اور نا کامیوں ، بلندیوں اور پستیوں ، روحانیت اور حیوانیت کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہم میں سے ھر ایک سے سوال کرتی ھے : کیا تم مجھے لینے کے لیے ، مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ھو ؟ جو لوگ اِس چیلنج سے خوف زدہ ھوکر اپنا منھہ پھیر لیتے ھیں وہ شکست خوردہ ھیں اور مستقبل کی تشکیل میں حصہ نہیں لے سکتے - جو لوگ اِس چیلنج کو مردانہ وار قبول کرتے ھیں اُن کا فرض ھے کہ اپنی تہذیب و تمدن ، اپنے اخلاق و مذھب کے بہترین اصولوں کی روشنی میں اِس زندگی کو بہتر اور خوب تر بنائیں تا کہ وہ امکانات جو اِس میں پوشیدہ ھیں روز بروز ظاھر ھوتے چلے جائیں اور مشیت الٰہی پوری ھو -

مشو نومید زیں مشت غبارے ٭ پریشاں جلوۂ نا پائیدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را ٭ تمامش می کند در روزگارے!

اداریہ

اکیڈیمی

پانچویں صدی قبل مسیح، یونان کی تاریخ میں اِنتہائی اقتدار اور عظمت کا زمانہ ہے - جب کہ شہر ایتھنز کی ریاست جمہور کے ہاتھوں میں ہے، ہر شہری بلا لحاظ دولت و پیشہ، حکومت کے اداروں کا ذمہ دار رکن بننے کی حیثیت رکھتا ہے - ایک روز اگر وہ رسّا بٹانے میں مشغول ہے، تو دوسرے روز فوج کا اعلیٰ کماندار منتخب ہو سکتا ہے، آج مشعلچی ہے، تو کل کسی جہازی بیڑے کا امیرالبحر - ہر شہری کو اپنے شہر کی عزت اور حرمت کا احساس اور ہر مرد اور عورت کا دل اس کی خدمت کے ولولے سے سرشار ہے - ایتھنز کی حکومت ایک بڑی سلطنت میں پھیلی ہوئی ہے، ایشیاءے کوچک اور بحر اسود کے سواحل پر، بحیرۂ روم میں پھیلے ہوئے جزیروں اور بندرگاہوں میں ایتھنز کے عمّال اِنتظام حکومت کر رہے ہیں اور ماتحت ریاستوں سے خراج وصول کرتے ہیں -

ایتھنز دولت، علم و ادب اور فنون کا مرکز بنا ہوا ہے، شہر عالیشان عمارتوں اور خوبصورت بتوں سے سجا ہوا ہے اور مصوّروں، مورخوں، شاعروں اور ڈرامانویسوں کے کارناموں کے باعث دنیا سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے - عین اِسی زمانۂ عروج میں اپنے رقیب سپارٹا سے اس کی لڑائی چھڑ جاتی ہے - اور جنگ میں اپنے سرداروں کی بےعنوانیوں اور دشمنوں کی کثرت کے باعث ایسا پسپا ہوتا ہے کہ اس کی وسیع سلطنت چشم زدن میں سپارٹا کے قبضے میں چلی جاتی ہے، زوال اس قدر تیزی کے ساتھ آیا ہے کہ طاقت اور حکومت تھوڑے ہی دنوں میں افسانہ

هو جاتي هے اور سپارٹا سے شکست کھانے کے نصف هي صدي کے اندر ایتھنز آزادي تک سے هاتھ دھو بیٹھتا هے -

ایتھنز کي تاریخ میں اس زوال کي ابتدا سے ایک دوسرا مگر پہلے سے بھي زیادہ شاندار دور شروع هوتا هے - اب تک ایتھنز کا اِنسانوں کے جسموں پر تسلّط تھا؛ اب اُن کي ذهنیتوں پر اس کي حکومت و فرمانروائي هے - پہلي حکومت عارضي اور چند روزہ تھي دوسري دائمي اور همیشہ قائم رهنے والي هوتي هے -

ایتھنز سے چار میل کے فاصلے پر قیفیسوس ندی بہتي هے اُس کے کنارے اکاڈیموس کا باغ تھا - ایتھنز کے انحطاط کے زمانہ میں شہر کے هنگاموں سے بچنے کے لیے افلاطون اس باغ میں پناہ لیتا هے ، اور اپني طولاني عمر کے پچاس سال اپنے رفیقوں اور شاگردوں کے ساتھہ حقیقت کي تفتیش میں گذار دیتا هے - یہیں وہ مکالمے تیار هوتے هیں جن میں اِنسان کي روح اور ذهن ، عالم کي اِبتداء و اِمکان کے متعلق دین و دنیا کے تمام مسئلوں پر ایسی سنجیدہ اور پُر مغز بحثیں ، هیں کہ آج تک دنیا اُن کے سامنے سر تسلیم خم کرتی هے - یہی وہ علمی صُحبت تھی جس کے فیض سے ارسطو کا دماغ منور هوتا هے اور آئندہ وہ " اُستاد زماں " کا لقب حاصل کرتا هے یہي وہ پہلي اکیڈیمي هے جس کا تتبع دو هزار برس سے یورپ کا هر ملک اور دنیا کی هر قوم آج تک برابر کر رهي هے افلاطون نے اُس کي بنیاد کچھہ ایسے طور پر رکھی کہ نو برس تک یہہ اکیڈیمي قائم رهي اور کم سے کم سِسرو کے وقت تک اس کے زاویۂ نگاہ میں اور اس کے فلسفہ کے بنیادي اصولوں میں ایک خاص شان نظر آتي رهي -

یونان کے شہروں پر جب روم کا قبضہ هوا تو یوناني فیلسوف اور ادیب اٹلي پہونچے اور اهل روما ان کے شاگرد هوئے - یونانیوں نے اپنے فاتحوں کو مفتوح کیا - اور یونانی تہذیب کا تسلط سلطنت روما کے وسیلہ سے مغربي

دنیا پر بحر اوقیانوس سے دجلہ و فرات تک قائم ہوگیا آخر اس سلطنت کا آفتاب بھی ڈھلا اور یورپ کی تہذیب چھٹی صدی عیسوی میں طوائف الملوکی فلاکت اور جہل کی تاریکی میں روپوش ہو گئی ۔ ایسے زمانہ میں عرب کی زمین سے ایک سر چشمۂ حیات جاری ہوا جس نے وادیء سندھ سے وادیء الکبیر تک کے ممالک کی آبیاری کی اور علم و ادب کی بجھی ہوئی شمع کو از سر نو روشن کیا ۔ قرطبہ ، اشبیلیہ ، طلمسان ، قاہرہ ، دمشق ، بغداد ، بصرہ وغیرہ میں علوم کے چرچے پھیلے ۔

ہندستان اور یونان کی علمی کتابوں کا ترجمہ ہوا قیصر جسٹینین کی عصبیت سے اکیڈیمی کے اراکین شہر بدر کردئے گئے اور افلاطونی اکیڈیمی تباہ و برباد ہوگئی ۔ لیکن عربوں کی رواداری کی بدولت ان یونانی فلیسوفوں نے عربی علوم کی ترقی میں بہت حصہ لیا شاگرد بھی اُستاد سے فہم و ذکا میں کم نہ تھے ۔ فارابی ، ابن سینا اور ابن رشد نے ارسطو کے گُم شدہ فلسفے کو دوبارہ زندہ کیا ۔ ابن خلدون اور البیرونی نے فلسفۂ تاریخ اور مذہب پر حیرت انگیز مقالے لکھے ۔

الخوارزمی ، قزوینی ابن ہشام نے ریاضی پر اور ابوالفدا ، مسعودی ، ادریسی وغیرہ نے جغرافیہ پر کتابیں تصنیف کیں ، یورپ کی قومیں جو پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک عالم تاریکی میں حیران و سرگرداں تھیں اس زمانہ میں عربوں کے علمی اداروں سے بہرہ‌ور ہوتی رہیں ۔ آخر کار جب اسلامی تہذیب زوال پذیر ہوئی تو اُنھوں نے اُس شمع علم کو جسے اپنے اُستادوں سے حاصل کیا تھا سنوارا اور فروغ دیا ۔ اٹلی کے علم دوست ، عیش پسند ، حسن پرست ، اور شوخ طبیعت باشندے یورپ کے اس نشاۃالثانیہ کے عَلَم بردار بنے ۔ فلارنس کے میڈیچی خاندان کے حکمرانوں نے اکیڈیمیا پلاتونیکا (افلاطونی اکیڈیمی) کو قائم کیا ۔ اور یہہ اکیڈیمی اٹلی کی علمی تحقیق اور ادبی سرگرمی کا ماوا اور

ا ٹھہري - فرانس کي دیکھا دیکھي اور شہروں اور ملکوں میں بھي
سمیوں کا قیام ھوا - سترھویں صدي میں فرانس نے اندروني جھگڑوں
مذھبي فسادوں سے فراغت حاصل کي، ملک میں امن و امان
حکومت کو استحکام حاصل ھوا - تہذیب کو زمانہ کي ھوا راس
- ریشلو کا سا غیر معمولي صاحب مصلحت وزیر بر سر کار ھوا - اس
فرانس کي مشہور ایکیڈیمي کي بنیاد ڈالي اور سنہ ۱۶۳۵ع میں
ڈیمي فرانسیز کو زبان کي اصلاح کے لیے قائم کیا شاھي سند میں اس
غرض یہہ بیان کي کہ فرانسیسي زبان، عوام کي بولیوں، وکیلوں کي
بیوں، درباریوں کي بے عنوانیوں اور پادریوں کي ملمع زوریوں سے
ا ھے اور اسے پاک و صاف کرنے کے لیے لغت صرف و نحو علم بیان و
ے کي کتابیں تیار کرنے کي ضرورت ھے -

سنہ ۱۷۸۹ع کے انقلاب کے بعد ایکیڈیمي کي دوبارہ تنظیم ھوئي
ب اس کي آمدني سرکاري اور غیر سرکاری ذرایع سے اس قدر ھے کہ
کے انعامات کی چار دانگ عالم میں دھوم ھے -

خانہ جنگیوں کے خاتمے پر جب بادشاہ فریڈرک اعظم نے اپني
ئت اور چیرہ دستي کے ذریعہ پروشیا کو بین‌الاقوامي برابري کا
دار ثابت کردیا تو ملکي احتشام اور سلطنت کے اقتدار کے اعلان
غرض سے اپنے باپ کي قائم کي ھوئي ایکیڈیمي کو فروغ دیا -
لي کے پایہ تخت برلن میں اس نظام کي بنیاد پڑي جو آج تک
ادب کا مرکز ھے -

فرانس کي نقل انگلستان نے کي - سنہ ۱۶۶۱ع میں سیاسي اور
بي خانہ جنگییں سے قوم کو فرصت ملي اور دوبارہ بادشاھت قائم
ي تو چارلس دوم نے سائنس دانوں کی جماعت کو شاھي سند

عطا کی اور اس طریقے سے رائل سوسائٹی کی سنہ ۱۶۶۲ع میں ابتدا ہوئی اور سنہ ۱۹۰۲ع میں برٹش ایکیڈیمی خاص طور پر ادبیات و لسانیات کی ترقی کے لیے قائم کی گئی ۔

اس تھاری ہزار برس کی تاریخ سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ ایکیڈیمی کا قیام قوموں کے نشو و نما میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ ہر قوم کی تاریخ میں ایک زمانہ آتا ہے جب رہنمایان قوم کو یہہ احساس ہوتا ہے کہ علم و ادب کی سر پرستی قومی مفاد کی حفاظت کے لیے ضروری ہے جذبۂ قومیت کے مظاہرہ کے لیے علم و ادب ایک ذریعہ ہے اس لیے جذبۂ قومیت کی استواری کے ساتھہ علم و ادب کی ترقی بھی وابستہ ہے ۔ قوم کی شان صرف آبادی کے ہجوم و دولت کی کثرت تجارت و صنعت کی گونا گونی پر منحصر نہیں ہے ۔ بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ علم و ادب اور فن کے ارتقا میں نمایاں ہوتی ہے ۔ اُن سے قوم کی ظاہری بر و مندی اور اس طرح اس کے روحانی خودداری کا اظہار ہوتا ہے ۔ ہر قوم ایک شخصیت رکھتی ہے جس میں اس کی زندگی کا راز پنہاں ہوتا ہے ۔ اس شخصیت کو متعین کرنا اور قائم رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ گلدستۂ اقوام کی شگفتگی اور بوقلمونی اور عالم انسانی کی آراستگی کا باعث ہو ۔ علم ادب اور فن وہ وسائل ہیں جن کے ذریعہ حسن و صداقت کے متلاشیان قوم کے افراد کی ذہنیتوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرتے ہیں ان مظاہروں میں ایک گرمی ہے جو اختلاف سوز اور ایک نور ہے جو یگانگت انگیز ہے ۔ مشہور انگریزی ادیب کارلائل کا قول ہے اگر مجھہ سے پوچھا جاے کہ سلطنت برطانیہ ایک طرف اور شیکسپیر دوسری طرف ہو اور سوال ہو کہ ان دونوں میں سے ایک باقی رہے اور دوسرا فنا ہو جاے تو میں بلا تامل کہونگا کہ سلطنت کا تلف ہو جانا مجھے منظور ہے لیکن شیکسپیر کا نہیں ۔

علم و ادب اور فن کی حفاظت و اشاعت، قوم کی ان ضرورتوں کو پورا کرتی ہے ۔ جن پر اس کے قیام و بہبود کا انحصار ہے ہندستان کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جس جس زمانہ میں ہماری قوم کا نیر اقبال بام فلک پر درخشاں ہوتا ہے اُسی زمانے میں ہماری تہذیب کا نور دنیا کی آنکھوں کو چکاچوندھ کردیتا ہے ۔

موریہ خاندان کی حکومت کا زمانہ ہے سو ورشلوں کی تنظیم، فلسفہ میں انہماک، اور اجنتا، ایلورا، سانچی بھاگھہ اور بھرہُت کے شاہ کار، مصوری، بت تراشی اور تعمیر کی ترقی کا پتہ دیتے ہیں ۔ گپتا خاندان کا عہد زریں ہے تو کالی داس کے ناٹکوں، سار ناتھہ اور امراوتی کے بے نظیر ستوپاؤں میں فن کی کرشمہ سازی کا نشان ملتا ہے ۔

مغلیہ خاندان کی شمشیر ہیبت زا اور تدبیر جہاں بانی، ہند کی پراگندہ قوموں کو بدخشاں اور بخارا کی سرحد سے دکن کی گھاٹیوں تک ایک چھتر کے سایہ میں جمع کرنے میں کامیاب ہوتی ہے اور یہی وہ زمانہ ہے کہ بےپایاں دولت و ثروت کی کشش فرنگستان کے تاجروں کو سات سمندر عبور کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور صوبہداروں کے درباروں میں تجارت کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے عرض‌داشتیں گذارنے اور نذریں پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے ۔ قومی زندگی کی ہما ہمی اور دلوں کے اُبھار کا اس سے بڑھہ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ تلسی داس، سور داس، کبیر اور کیشو شاعری کے دریا بہاتے ہیں اور اپنے انمول رتنوں سے ادب کو مالا مال کرتے ہیں ۔ اہل فن اور کلاونتوں میں دسونتھہ، بساون اور عبدالصمد، کے سحر نگار قلم، حسن کے مجسمے تیار کرتے ہیں تان سین موسیقی میں وہ دلربا راگ الاپتا ہے جو آج تک دلوں کو مست کرتے ہیں ۔ تعمیرات میں ہندستان کا کوئی صوبہ نہیں، کوئی بڑا شہر

نہیں جو مغلوں کے ذوقِ سلیم کا شاهد نہ هو صرف ایک تاج محل اس داستان کو بقاے دوام بخشنے کے لیے کافی هے - اس علم و ادب اور فن کا مدار ملک کے حکمرانوں اشوک، چندر گپت، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی سرپرستی اور تمدن نوازی پر تھا - اور اس سرپرستی کا راز قومی ضروریات کا احساس تھا - اورنگ زیب کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھرا وہ طلسم جس پر خیالستان تہذیب کا قیام تھا ٹوٹا، دل بجھے، همتیں پست هوئیں لیکن عهد رفتہ کی یاد، ان تصورات کو سیان کی اس خاموش لحد میں سلا نہ سکی جہاں سے صداے باز گشت بھی نہ آے -! زمانہ کی سرد مہری اور زندگی کی تلخ کامی کی ٹیس میر اور غالب کو تڑپاتی هے ان کے دلوں سے جو آہ و فغاں نکلتی هے اس کی پر حزن آواز اس وقت تک همارے کانوں میں گونجتی رهےگی جب تک هندستانی زبان دنیا میں باقی هے - اٹھارویں صدی کا آخری حصہ اور انیسویں صدی کے پہلے پچاس سال هندستان کی تاریخ میں ایسے گزرے میں جن کے بیان میں مورخوں کے قلم خون کے آنسو بہائیں‌گے - لیکن "" بر سر اولاد آدم هر چہ آید بگزرد "" - زمانہ پلٹتا هے - انگریزی تعلیم نئے خیالات اور نئے جذبات سکھاتی هے قومیت کا نیا احساس پیدا هوتا هے - ملک میں ایک نئی روح سرایت کرتی هے - بیسویں صدی کا آغاز هوتا هے - قدیم کارناموں کی یاد، جاپان کی حیرت انگیز فتوحات، یوروپ کی خانہ جنگی، هندستان کے نصف النهر پر امیدوں کے لامتناهی منظر کی جھلک نگاهوں کو لطف اندوز اور دلوں کو امنگوں سے سرشار کردیتی هے قوم کی عزت و وقار اور قومی شخصیت کے تعین کے خیالات ذهنوں میں موجزن هوتے هیں - قدرتی طور پر لوگوں کے دل، قومی زبان اور ادب کی ترقی کی جانب مائل هوتے هیں اور ایسے ادارہ کی ضرورت محسوس هوتی هے جو اس غرض کے پورا کرنے میں مددگار اور معاون هو -

هندستان میں اردو اور هندي زبانوں میں انیسویں صدی کي ابتدا سے مغربي تاثرات کے باعث روز افزوں ترقي رهي هے - دونوں زبانوں میں ادب کا معتدبه ذخیرہ جمع هو چکا هے - مصنفین کي ایک خاص جماعت اِس خدمت میں مصروف هے که علم و ادب کے هر شعبے کو تصنیفات سے پُر کردے - لیکن ابهي تک علوم کي بہت سي شاخیں ایسي هیں جن میں کتابیں نہیں هیں اور جو کتابیں موجود هیں اُن کي تعداد کم هے اُن کا معیار اتنا بلند نہیں جتنا که هونا چاهیے - ادب کی ضروریات سے هندي اور اردو سے دلچسپي رکھنے والا هر شخص خوب واقف هے - زبان کے بارے میں یہه صحیح هے " که گیسوے اُردو ابهي منت پذیر شانه هے " اُردو اور هندي میں ایسے ناولوں ڈراموں افسانوں کي کمی هے جو اَدبي حیثیت سے ممتاز درجه رکھتے هوں - تنقید و تاریخ اور نثر کي صنفیں بهي بالکل تشنه هیں - نظم کي حالت یہه هے که گو غزل ، مرثیه ، مثنوي اور قصیدہ میں کافي اور اعلیٰ مایه کا مواد موجود هے - لیکن اِس کي بنا پر یہه نہیں کہا جاسکتا که زمانے کے مذاق کے مطابق نظم هماري نئي زندگي کي ترجماني میں کامیابي حاصل کر چکی هے -

ملک کي آبادی کا خیال کرتے هوے یہه کہنا نا مناسب نه هوگا که ایک نہایت محدود دائرہ علم و ادب کی اشاعت و توسیع میں دلچسپي لیتا هے - همارے کروروں اهل وطن علم سے بے بہرہ هیں اور ادب کی روحاني مسرت سے بے خبر - مگر اسے بهول نه جانا چاهیے که قومي زندگی کا انحصار انهیں غریب جفاکش صبر کیش انسانوں پر هے جو اس وقت ان کے فیضان سے مستفید نہیں هو سکتے جلد وہ زمانه آنے والا هے جب وہ اصرار کرینگے که انهیں علم و ادب سے لطف اندوز هونے کا وهی فطري حق حاصل هے جو معدودے چند انسانوں کو اس وقت هے - اور ان کا مطالبه انفرادي اور مجموعی مفاد کے لحاظ سے بالکل حق بجانب هوگا -

هندستانی اکیڈیمی کے قیام کی غرض ان ضرورتوں کا پورا کرنا ھے -
یعنی مختلف علوم پر کتابیں تحریر کرانا ؛ ادب کی کمیوں کو
پورا کرنا اور اس قسم کی تصانیف کا ملک کے سامنے پیش کرنا جو
عوام کی تعلیم کا ذریعہ بن سکیں - یہاں یہہ سوال پیدا ہوتا ھے کہ
منتظم جماعتوں کے ذریعہ سے ادب کی ترقی ہو سکتی ھے یا نہیں -
بعض اصحاب کا خیال ھے کہ ادب کا تعلق روح کی آزادی سے ھے -
اس کی تخلیق کسی مصنوعی ترکیب سے نہیں ہو سکتی - یہہ
ممکن نہیں کہ بیرونی اسباب ذہن میں وہ کیفیت پیدا کر سکیں
جن کا نتیجہ شعر و سخن کا حسن لطیف ہو - شاعر اور ادیب
بنائے سے نہیں بنتے قدرت ان قوانین کے مطابق اُنھیں پردۂ مستور سے عالم
ظہور میں لاتی ھے - یہہ ایک حد تک صحیح ھے - لیکن اس کا
ایک دوسرا پہلو بھی ھے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاھیے - ادب جن
احساسات اور تخیلات کا حامل ھے وہ تمام انسانوں میں کم و بیش
پائے جاتے ہیں - ایسا نہ ہوتا تو ادب کی سلطنت عالمگیر نہ ہوتی -
اس کی تاثیر چند انسانوں تک محدود ہوتی - ان احساسات جذبات
اور تخیلات کے اظہار کی قابلیت البتہ محدود ھے -

لیکن یہہ حدود اتنے تنگ نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ھے -
ترغیب کی کمی کی وجہ سے بہت سے انسان جن میں یہہ قابلیت
موجود ھے اس کے اظہار سے معذور نہیں - اس کی مثالیں ہر زمانہ
اور ہر ملک سے مل سکتی ہیں اور تفصیل کی محتاج نہیں -
اردو اور ہندی کی تاریخ خود اس کی گواہ ھے - گو اردو اور ہندی میں
شاعری کم از کم چار سو برس پیشتر سے ہو رہی ھے - لیکن دونوں زبانوں
میں گلکرائسٹ کے وقت سے پہلے جو نثر موجود تھی اس کی حالت
ہرگز ادبی کہلانے کے مستحق نہ تھی - مگر گلکرائسٹ کی سر پرستی

میں پانچ سات برس ہی میں وہ نثر پیدا ہوئی جس پر ہمیں آج تک ناز ہے۔ اس کی کوششوں سے للو لعل، بہادر مصر، لطف علی بیگ، میر شیر علی افسوس، میر امن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری وغیرہ ایسے ادیب کلکتہ میں جمع ہوئے جن کے شاہکاروں کے لیے ہندستان ہمیشہ اُن کا رہین منت رہے گا اگر عصر موجودہ میں ایک ایسی جماعت ہو جسے علم و ادب کی ضرورتوں کا پورا احساس ہو۔ جس کے ارکان کا نصب‌العین ایک، مذاق صحیح اور نظر وسیع ہو، جن کا دل ادبی تعصبات سے خالی اور اہل فن و ہنر کی ہمدردی سے مملو ہو، جو ادب کی خدمت کے لیے نیک نیتی کے ساتھ مستعد ہو، علم و ادب کی توسیع کے لیے کافی آمدنی کے ذرائع رکھتی ہو تو یہ ممکن ہے کہ یہ جماعت وہ کام کر سکے جو کلکتہ‌اسکول نے آج سے سو برس پہلے انجام دیا تھا۔

کسی کا قول ہے کہ جماعت میں کرامت ہے۔ اکیڈیمی کو بھی حسن خدمت کی توفیق ہو سکتی ہے اس حالت میں جب کہ اس میں جماعت کی خوبیاں پائی جائیں۔ یعنی یہ کہ وہ محض چند انفرادی ہستیوں کا مجمع نہ ہو جن میں کوئی خصوصیت مشترک نہیں یا جن میں ہر شخص کا زاویہ نگاہ مختلف ہو جماعت اسی وقت تک جماعت کہلانے کی مستحق ہے جب کہ اس کے افراد ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہوں ان کی ذہنیتیں ایک آئیڈیل کے تابع کام کرتی ہوں اور ان کی متفقہ اور لگاتار کوششوں کا مقصد ایک ہو۔ جس طرح مختلف پردوں کے چھیڑنے سے اور مختلف سُروں کے میل سے ایک سُریلا راگ نکلتا ہے اسی طرح ایک اکیڈیمی کے مختلف طبائع کے اراکین کے ملنے سے ایک لطیف ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے جن پر مذاق صحیح اور حسن ادب کی بنیاد قائم ہو۔

ھندستانی اکیڈیمی کی کامیابی کا اندازہ کرنے کے لیے مقالات اور مطبوعات کی کثرت یا انعاموں اور عطیوں کی افراط صحیح معیار نہیں بلکہ یہہ دیکھنا ہوگا کہ کہاں تک اس نے افلاطون کی ابتدائی اکیڈیمی کی طرح ادبیات کے بارہ میں ایسے اصول قائم کیے جو امتداد زمانہ کے ساتھہ وسعت پذیر ہوں لیکن جن کی بنیادیں ھل نہ سکیں کہاں تک فرانسیسی اکیڈیمی کی طرح زبان کے سنوارنے اور ادب کی آرائش میں ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے ایک طرف تصنع اور تنگ نظری اور دوسری طرف بے ضابطگی و بے اصولی سے بچ کر ادب میں روح قومی کے اظہار اور تعین کی صلاحیت پیدا ہوئی اور کہاں تک اس کی کوششوں کی وجہ سے ہمارے دلوں کے سامان انبساط اور ذھن کی قوت پرواز میں اضافہ ہوا۔

تارا چند

گورنمنٹ صوبہ و متحدہ نے ھندستانی زبان و ادب کی ترقی و حوصلہ افزائی کے لیے سنہ ۱۹۲۷ ع میں ھندستانی اکیڈیمی " قائم کی تھی جس کو کم و بیش ؟ تین سال ہو گئے ۔ اس قلیل مدت میں کسی اکیڈیمی کا اندازہ یا جائزہ لینا قبل از وقت ھے ؟ تمدن اور علمی تحریکوں کی عمریں ؟ دو چار سال سے نہیں ؟ بلکہ قرنوں اور صدیوں سے لگائی جاتی ہیں ۔ بایںہمہ اکیڈیمی نے اس مختصر دور میں جو عملی کار نامے پیش کیے ہیں (اور جو ایک رپورٹ کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں) اُن سے یہہ اندازہ ہو سکتا ھے کہ اکیڈیمی کا مستقبل کیا ہو گا ؟

ایکڈیمی کا تاریخی مفہوم کیا ھے ؟ اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں اور وہ کن حالات کے ماتحت ؟ عالم وجود میں آتی ھے ؟ ان اُمور کی تفصیل

ہمارے جنرل سکریٹری ڈاکٹر تارا چند صاحب ایم ۔ اے ۔ ڈی ۔ فل ۔ نے ایک مستقل مقالے کی صورت میں پیش فرمائی ہے جس کو ناظرین ، انہیں صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے ۔

اب صرف رسالہ " ہندستانی " اور اس کی حیثیت و نوعیت کے بارہ میں کچھہ عرض کرنا باقی ہے ۔ یہہ رسالہ ، ہندستانی اکیڈیمی کے شعبہ اردو کا آرگن ہوگا ۔ یہہ سال میں چار بار نکلے گا ۔ اس میں ادب و انشا ، لسانیات و تنقید ، آثار قدیمہ و تاریخ و نیز دیگر تحقیقی و علمی موضوعات پر مضامین ہونگے ۔

رہا اُردو زبان کا مسئلہ ، تو حقیقت یہہ ہے کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے اور " کثرت تعبیر " سے پریشان ، اس لیے فی الحال اس کے بارے میں ، کوئی صاف ، مکمل اور قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ۔

آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ نے (جو اکیڈیمی کے بھی ایک ذمہ‌دار ممبر ہیں) ۱۹۲۸ع کے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اُردو کے بارہ میں یہہ خیالات ظاہر فرمائے ہیں :—

" معمولاً جو زبان بولی جاتی ہے وہ بمقابلہ بلند ہندی کے ، بلند اُردو ہے ، اس کی وجہ تلاش کرنے کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ، عربی اور فارسی زندہ زبانیں ہیں جو عرب ، عراق عرب ، ایران اور افغانستان کے کچھہ حصوں میں بولی جاتی ہیں خالص سنسکرت زبان کہیں نہیں بولی جاتی ۔ یہہ صرف پنڈتوں کے حلقوں میں محدود ہے اُردو کو یہہ فائدہ حاصل ہے کہ وہ ہندستان کے ہمسایہ ممالک سے رشتۂ اتحاد رکھتی ہے ۔ بین‌الاقوامی تعلقات

اور همسایه ممالک کے لوگوں کے ساتھه آزاد میل جول یقیني هے اِن ممالک سے لوگوں کي مسلسل آمد و رفت، اُردو کی قوت میں اضافه، اور اس کی تدریجي ترقي میں اعانت کرے گي - هندستان، جس کا تعلق مغرب کے ایشیائي ممالک سے تمدني اور تجارتي دونوں حیثیتوں سے قریب تر هوتا جارها هے، درآمد میں وهاں کے الفاظ و لغت کو بھي اپني زبان میں لاکر جذب کرےگا - اس لیے یهه ایک خیالي اُمید نہیں هے که کچهه زمانه کے بعد هندستاني زبان، عربي، ترکي، فارسي، اور پشتو زبانوں کے الفاظ سے مالا مال هو جائیگی - یهه تمام فوائد، جو اُردو کو حاصل هیں اس کے اعتبار سے اردو، تمام هندستان کي "لنگوا فرینکا" هونے کي مدعي هو سکتي هے"

پنجاب اور دکن کی اُردو میں، فارسي اور عربي الفاظ کي کثرت و بهتات، بعید نهیں، اسي قسم کے خیالات کے باعث هو لیکن صوبهٔ متحده کي حالت مختلف هے یہاں بعض لوگ اُردو میں اگر فارسي اور عربي کا عنصر غالب دیکھنا چاهتے هیں تو بعضوں کا یهه بھي خیال هے که اُردو کو فارسي اور عربي سے نهیں بلکه اُسے ملک کي هندي بھاشا سے هم‌آهنگ هونا چاهیے -

ع - "هر سو هزار عقدهٔ مشکل نهاده اند"

اصل یهه هے که همارے ذهن میں اُردو کے متعلق، ابھي کوئي صاف اور قطعی پروگرام نهیں هے لیکن جس طرح مختلف ذهنوں اور دماغوں میں کسي چیز کا خاکه بار بار بنتا اور بگڑتا هے جو اس بات کا ثبوت هوتا هے که کسي پر سکون نقطے تک همیں یقیناً پهونچنا هے تھیک اسي طرح اردو کے آئنده پروگرام کے باب میں بھي، همیں، جلد یا بدیر، یهه

کرنا ہوگا کہ اس کو کس راستے اور کس طریقے پر چلنا چاہیے اور اُس کی منزل کیا ہے ؟ فی الحال تو مسئلۂ زبان کے بارہ میں -

"ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید"

زیادہ نہ ہم کو معلوم ہے اور نہ شاید اس سے زیادہ معلوم کرنے پر ہم تیار ہیں-

لیکن اردو زبان کے اِس وسیع تخیل سے قطع نظر، غالباً اِس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ زبان کی حیثیت و نوعیت، بہت کچھ مقامی اور اپنے مخاطبین کی حیثیت و نوعیت پر موقوف ہے جس کا اندازہ اکثریت کے طبعی رجحان اور اُن کے لب و لہجہ کے اختلاف سے بخوبی ہو سکتا ہے اسی کے ساتھ، ہر لکھنے والے کی یہہ آرزو ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ اِس کے گرد و پیش، انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد، اُس کے خیالات سے مستفید ہو سکے -

اِس لحاظ سے ہمارے صوبے کے اہل قلم، زبان کی سلجھیدگی و شگفتگی کو نقصان پہونچانے بغیر، اگر کسی قدر صفائی و سادگی کو گوارا کر لیں تو کیا جو افادہ اِس سے متصور ہے وہ اِس خفیف سے ادبی جرم کی تلافی نہ کر سکےگا ؟

کسی بلند نظر ادیب کے لیے زبان کی بلندی و پستی، لفظوں کی سختی و آسانی کوئی معنی نہیں رکھتی جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے ادبیت کا اصل راز یہہ بتایا ہے :—

"اصل میں یہہ خود زبان نہیں ہے جو صحیح، زوردار، پاکیزہ اور نفیس ہوتی ہے - بلکہ یہہ ذہن ہے جو اِس میں متشکل ہوتا ہے -"

بہر صورت ممالک متحدہ میں مفاہمے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی بیچ بیچ کا راستہ اختیار کیا جاے چنانچہ اکیڈیمی اور اُس کے کارکنوں کے نقطۂ نظر اور فرائض کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے،

سر ولیم میرس کی اُس تقریر کو پیش نظر رکھنا چاهیے جو موصوف نے اکیڈیمی کے افتتاح کے وقت بمقام لکھنؤ ارشاد فرمائی تھی - اُس کا خاص اقتباس یہہ ہے :—

"هر هندی لکھنے والے کے پیش نظر یہہ مقصد هونا چاهیے کہ وہ مسلمانوں کے پڑھنے کے لیے کتاب لکھہ رها هے اور اسی طرح مسلمانوں کو خیال رکھنا چاهیے کہ اُن کی لکھی هوئی کتاب کو هندو پڑھیں گے - ممکن هے یہہ امید پوری نہو لیکن میں یہہ امید کرتا هوں کہ اکیڈیمی کے اراکین اس پر بالکل تیار هونگے کہ وہ کسی زبان میں فرقہ وارانہ شان پیدا نہ هونے دیں گے اور زبانوں کو مخصوص جماعت کی زبان نہ هونے دیں گے - مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر اُردو لکھنے والے عربی جملے استعمال کریں جیسا کہ بعض پولیس کے روزنامچے لکھنے والے کچھہ دن پہلے کیا کرتے تھے یا هندو مصنفین سنسکرت کے الفاظ خواہ مخواہ اپنی عبارت میں بھریں تو یہہ لوگ دوهری مصیبت لا رهے هیں پہلا جرم یہہ هے کہ وہ خود بھی دوسرے فریق سے دور هوتے جاتے هیں اور اپنے ناظرین کو بھی اُن سے دور کرتے هیں اس طرح یہہ ادبی جرم سے زیادہ معشرتی جرم هے - اِس کے علاوہ اِس طریقے سے وہ اپنی کتابوں کو نا قابل فہم بناتے هیں جن کو عام آدمی نہیں سمجھتے اور یہہ ایک ایسا گناہ هے جو وہ اکیڈیمی کے مقاصد کے خلاف کرتے هیں اور مجھے امید هے کہ اکیڈیمی کے اراکین اس کا خیال رکھیں گے -"

———— ————

لیکن حقیقت یہہ ھے کہ ھندي اور اردو میں شاید اتنا اختلاف نہیں ھے جتنا ھندي اور اردو کے پرستاروں میں ھے اس لیے اس مسئلے کا حل، اردو اور ھندی کی کتر بیونت سے اتنا ممکن نہیں ھے جتنا اردو اور ھندي کے عام پرداروں کی ذھنیت کي اصلاح سے - یہہ نئی عجیب بات ھے کہ ھندستان کي تمام قومیں تو ھندستان کي ترقی میں متعدد قالب اور ایک جان ھو کر رہ سکتي ھیں لیکن ھندستان کي مختلف زبانیں اپنے اپنے مخصوص امتیازات کو قائم رکھہ کر ترقي نہیں کر سکتیں ! حالانکہ اردو اور ھندي، اپنی اصل کے اعتبار سے باھم اتنی مختلف بھي نہیں جتنی خود یہہ قومیں !

یہہ جو کچھہ عرض کیا گیا ممکن ھے اردو اور ھندي کے کلّي مسئلے کا اس سے حل نہ ھو سکتا ھو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقامي حیثیت سے عملاً اس کا حل اسي طرح اسفل اور اعلے کو برابر کرنے سے ممکن ھے - اس بنا پر بے محل نہ ھوگا کہ ھمارے رسالے کي پالیسي اور اس کا پروگرام انہیں لائنس پر ھو -

دوسرے شعبہ ھاے عامي کے مانند، ملکي لٹریچر کي نجات بھي ملک کي متحدہ ذھنیت کي تشکیل پر موقوف ھے - یہہ مبارک کام ھندستاني اکیڈیمي کے ماتحت (جس میں ھمارے صوبے کے بہترین دل و دماغ شریک ھیں) اگر انجام نہ پاسکا تو اس سے زیادہ ملک کي شامت اور بد بختي اور کیا ھو سکتی ھے ؟

رسالے میں جہاں ھر قسم کے عامي، ادبي، تنقیدي اور لسانیاتي مضامین کے نکالنے کا ارادہ کیا گیا ھے وھیں اس کا بھي لحاظ رکھا گیا ھے کہ ساتھہ کے ساتھہ تخلیقي لٹریچر کي بھي حوصلہ افزائي ھوتي رھے -

ضمن ذیل میں چونکہ افسانے اور نظمیں بھی آتی ھیں اس لیے اس کے بارہ میں بھی کچھہ عرض کر دینا غالباً بیجا نہ ھو :—

یہہ امر بے حد مسرت انگیز ھے کہ عام طور پر اردو میں ایسے لکھنے والوں کی کافی تعداد موجود ھے جو بدیع و جمیل انشا، اور خوبصورت طرز نگارش پر قدرت رکھتے ھیں لیکن اسی کے ساتھہ، علمی و ادبی چیز کے نام سے ایک ایسے "سراب" و "فریب" کی بھی روز بروز ارزانی ھوتی جا رھی ھے جس سے بچنا اور بچانا، ھر بھی خواہ اردو کا اولین فرض ھونا چاھیے - یہہ وہ "پریشان خیالی" و "ژولیدہ بیانی" ھے جسے عام طور پر آرٹ سے متّہم کیا جاتا ھے - اصل یہہ ھے کہ فکر و مطالعے کی زحمتوں سے بچ کر، اگر آسانی سے تحریروں کو بلند و رقیع کر کے دکھانا مقصود ھو تو عموماً اسی قسم کی ھوائی چیزیں تیار ھوتی ھیں - اسی لیے ادب کے ساتھہ ساتھہ ھمارے نوجوان طبقے کی زندگی بھی سر تا سر سطحی اور مصنوعی ھوتی جارھی ھے حالانکہ ایک ترقی یافتہ زبان کی حقیقی عظمت، سنجیدہ غور و مطالعہ اور پُر فکر شائستہ خیالی پر منحصر ھے بغیر اِس کے نہ صحیح ادبی ماحول تیار ھو سکتا ھے اور نہ اعلیٰ قسم کا شاعر و ادیب - یہہ صحیح ھے کہ اصلی شاعر و ادیب بنایا نہیں جاتا بلکہ وہ ھوتا ھے لیکن اِس باب میں ھم فطرت کی اِتنی اعانت ضرور کر سکتے ھیں کہ اِس کے لیے ایک اچھی زمین تیار کر دیں جس کے لیے سخت سے سخت احتساب از بس لازمی و ضروری ھے (چنانچہ اسی مصلحت سے اکیڈیمی نے اپنے یہاں ریویو کا خاص اھتمام کیا ھے) اسی طرح شعر و نظم کے بارے میں بھی ھمارا آئیڈیل یہہ ھے کہ نہ وہ کھتونی کی طرح بے کیف و بے روح ھو اور نہ پھر اِس درجہ پُر الم و رقیق کہ قدم قدم پر حرکت قلب بند ھونے کا احتمال ھونے لگے افلاطون نے اپنے آئیڈیل ریپبلک میں شاید اسی قسم کے شاعر و شعر کی گنجائش نہیں پائی تھی -

بہر صورت ہم احتیاطاً لیکن خلوص کے ساتھہ یہہ آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ نظموں اور افسانوں میں جب تک حقیقی تخلیقی شان نہو اُس وقت تک رسالے کو اِن چیزوں سے مامون و مصئون رکھنے کی ہماری انتہائی کوشش ہوگی -

---

عام علمی و ادبی مضامین کے زبان و بیان اور اُن کے طرز انشا کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر کیا ہوگا ؟ عرض ہے کہ اِس میں ہر ایسا مضمون درج کیا جاے گا جو معقول ہو، مفید ہو اور دلچسپ ہو - ہمارے نزدیک ہر اچھا مضمون معقول بھی ہو سکتا ہے اور مفید و دلچسپ بھی - مختلف طبائع مختلف قسم کی چیزیں پسند کرتی ہیں لیکن یہاں مختلف طبائع کے معنی ادنی اور بد مذاق طبائع کے نہیں ہیں -

ہمارا یہہ معیار بظاہر بہت مختصر اور پیش پا افتادہ معلوم ہوگا لیکن اِس سے غالباً کسی کو انکار نہ ہو کہ اِس کا نباہنا کافی مشکل اور دشوار ہے -

ایڈیٹر

تبصرے

عرب و ہند کے تعلقات

مصنفۂ جناب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی - تقطیع ۲۰×۲۶
صفحات ۳۰۹ - ٹائپ کی طباعت - کاغذ دبیز - شائع کردہ
ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد سنہ ۱۹۳۰ع - مجلد قیمت چار روپیہ -

(از ڈاکٹر زبید احمد پی - ایچ - ڈی - الہ باد یونیورسٹی)

یو - پی کی ہندستانی اکیڈیمی محتاج تعارف نہیں - اس نے اپنے چند سالہ زمانہ حیات میں اردو اور ہندی کی جو خدمت کی ہے وہ اس کے کارکنوں کے لیے باعث فخر اور اردو ہندی کے خیرخواہوں کے لیے موجب مسرت ہے - ایک طرف ملک کے قابل قدر اہل قلم کو صلائے عام ہے کہ کسی مفید مبحث پر سلیس و سہل زبان میں تصنیف و تالیف کرکے اردو ہندی کے سرمایہ میں قیمتی اضافہ کریں چنانچہ اکیڈیمی کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دوسری طرف ملک کے مایۂ ناز اصحاب علم و فضل کو دعوت دی جاتی ہے کہ ہندستانی اکیڈیمی کے سامنے اردو یا ہندی میں کسی اہم موضوع پر تقریر کرکے اپنے علمی تحقیقات کے نتائج سے قوم کو بہرہ‌مند کریں - چنانچہ اب تک اس قسم کی کئی ایک تقریریں ہو چکی ہیں اور ان کو اکیڈیمی نے آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے - منجملہ ان شائع شدہ تقریروں کے - کتاب زیر تبصرہ بھی ہے - جو مولانا سید محمد سلیمان ندوی کی پانچ تقریروں کا مجموعہ ہے - علامہ موصوف کی محققانہ و عالمانہ شخصیت اور موضوع کی تاریخی و افادی اہمیت اور پھر ہندستانی اکیڈیمی کی سر پرستی کتاب میں ان سب باتوں سے جائز طور پر بھی یہہ توقع کی جا سکتی تھی کہ

کتاب فی الواقع ایسی ہی پر مطبوع ہوئی - اور ہم خوش ہیں کہ یہہ کتاب موقع سے بہی کہیں زیادہ کامیاب بلکہ لاجواب تصنیف ہے اور خلوص دل سے فاضل مصنف، ہندستانی اکیڈیمی اور دنیاے اردو کو اس علمی کارنامہ پر مبارکباد دیتے ہیں -

کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے - پہلے حصہ میں آغاز تعلقات اور ہندستان کے عرب سیاحوں کا ذکر ہے اس میں ابتداءً بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی روایات میں عرب و ہند کا تعلق ہبوط آدم سے قائم ہے - اگرچہ یہہ روایتیں فن حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ ہیں - مگر مسلمانوں کی اس محبت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ ہندستان کو اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں" پھر عرب و ہند کے ابتدائی تجارتی تعلقات، لفظ ہند کی تحقیق، اور ہندستان پر عربوں کے حملہ کا ذکر ہے آخر میں - عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا ابن خرداد بہ المتوفی ۲۵۰ھ سے لیکر ابن بطوطہ سنہ ۷۷۹ تک مختصراً ذکر کیا گیا ہے - اور دوران ذکر میں بہت سی مفید اطلاعات درج ہیں -

دوسرے حصہ کا موضوع تجارتی تعلقات ہے اس میں خلیج فارس کے اور ہندستان کے مغربی بندرگاہوں - دریائی تجارتی راستوں اور ہندستان کی پیداوار اور بیوپار کا ذکر ہے اسی سلسلہ میں یہہ بتایا گیا ہے کہ زبان عربی بلکہ قران پاک میں کون کون سے ہندی الفاظ داخل ہیں - مثلاً عربی میں مسالوں اور اکثر خوشبوؤں اور کئی دواؤں کے نام - مانند قرنفل - فلفل - صندل - مشک - اطریفل ہندی الاصل ہیں - قران شریف میں تین ہندی لفظ زنجبیل، مشک اور کافور آئے ہیں - پھر ہندستان کی بحری در آمد کا ذکر ہے اسی موقع پر اس سوال پر بحث کی ہے کہ آیا اہل ہند بحری جہازران تھے - بعض انگریز مورخوں کا خیال ہے

کہ کُل ہندو تو نہیں - لیکن کم از کم سندھہ اور گُجرات کے لوگ ضرور جہازرانی کرتے تھے -

تیسرے حصہ کا مبحث عرب و ہند کے علمي تعلقات ھے - ابتداءً مصنف نے اپنے ماخذ کا ذکر کیا ھے پھر علمی تحقیقات کا آغاز برآمکہ سے کرتے ھیں - اسی ذیل میں برآمکہ کي اصلیت کي تحقیق کي ھے عام طور پر برآمکہ مجوسي‌الاصل سمجھے جاتے ھیں بلخ میں نو بہار نام آتش‌کدہ تھا - جس کے یہہ لوگ پیر مغاں تھے - مولوي عبدالرزاق صاحب نے تاریخ‌البرامکہ میں برمک کي اصل برمغ بتاءی ھے مگر مولانا ندوي کي تحقیق ھے کہ نہ یہہ لوگ مجوسي‌الاصل تھے اور نہ نو بہار آتش‌کدہ تھا - بلکہ وہ بودھوں کا مندر تھا - بودھوں کے معبد کو وھار کہتے ھیں - اسی وھار کي خرابي بہار ھے - اس میں کچھہ شک نہیں یہہ خیال سب سے پہلے مولانا نے نہیں بیان کیا - کیوں کہ جیسا کہ خود موصوف نے لکھا ھے - زخاو نے کتاب‌الہند کے انگریزي ترجمہ کے مقدمہ میں نوبہار کي اصل نو وھار قرار دي ھے - اور اسي طرح انسائکلوپیڈیا آف اِسلام کے مضمون برآمکہ میں اس کي طرف اِشارہ کیا گیا ھے - مگر اسي کے ساتھہ اس میں بھي کچھہ شک نہیں کہ مولانا ھي پہلے شخص ھیں جنھوں نے اس خیال کو نہایت خوبی کے ساتھہ پایۂ ثبوت کو پہونچایا ھے - اس کے بعد مولانا نے برآمکہ کي قدر داني و علم پروري کي بدولت سنسکرت سے عربي میں جو ترجمے ھوءے ان کا مفصل ذکر کیا ھے - اسي ذیل میں یہہ بھي بتایا ھے کہ تین چار سنسکرتي اصطلاحیں عربي میں جوں کي توں مستعمل ھیں - رقوم ھندیہ کي بابت لکھا ھے کہ مسلمانوں نے ھندوؤں سے لیں - اس موقع پر لفظ ھندسہ کي تحقیق کي ھے عام طور پر اس کا تعلق لفظ ھندسے بتایا جاتا ھے مگر درحقیقت یہہ فارسي لفظ اندازہ کا معرّب ھے - آخر

ہیں البیرونی کے علمی کارناموں کا اور پھر نرد و شطرنج کا ذکر ہے جو ہندوستان سے عرب پہونچے ۔

چوتھے حصہ کا عنوان عرب و ہند کے مذہبی تعلقات ہے ۔ مآخذ کا ذکر کر کے ایک نہایت دلچسپ اور بیش افروز بحث کی ہے ۔ وہ یہہ کہ مسلمان عرب فاتحین ترک و افغان و مغل فاتحین ہند میں بڑا فرق تھا ۔ آخرالذکر قوموں کو چونکہ مسلمان ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا ۔ بلکہ غیر مسلم کی ایک کافی تعداد اُن میں موجود تھی ۔ اس لیے وہ ہنوز اسلامی روح سے محروم تھیں جس کا یہہ لازمی نتیجہ تھا کہ یہہ لوگ اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھہ وہ اسلامی سلوک نہیں کرسکے جو عربوں نے اپنی مفتوح قوموں کے ساتھہ کیا ۔ عربوں نے جن قوموں کے ساتھہ معاہدہ کیا انکی مذہبی آزادی بر قرار رکھی اور ان کے مذہبی عبادتگاہوں کو تہس نہس ہونے نہیں دی ۔ ترک و افغان فاتحین نے ہندوؤں سے جزیہ تو لیا مگر اس کے عوض میں وہ حقوق نہیں دیے جو عرب مسلمان جزیہ لینے پر مفتوحین کو دیتے تھے ۔ محمد بن قاسم نے سندھہ فتح کیا تو اس نے سندھہ کے غیر مسلم لوگوں کو وہی حقوق دیے جو عربوں نے عراق و شام کے یہودیوں عیسائیوں اور پارسیوں کو دیے تھے اس نکتہ کو پیش نظر نہ رکھنے کا یہہ نتیجہ ہے کہ ان نو مسلم ترکوں ۔ افغانوں اور مغلوں کے طریقہ ملک گیری و حکمرانی پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ اسلام کے سر تھوپے جاتے ہیں حالانکہ ان کو اسلام سے کچھہ تعلق نہیں ۔

اس بحث کے بعد فاضل مصنف نے مسلمانوں کی تحقیقات ۔ ہندو مذہب کی تاریخ بیان کی ہے اور نہایت مفید دلچسپ معلومات پیش کیے ہیں ۔ اسی ضمن میں لفظ سمنہ کی تحقیق کی ہے اور بتلایا ہے کہ اس سے بودھہ مت کے لوگ مراد ہیں ۔ اور لفظ بت کی اصل بدھہ ہے ۔ پھر یہہ

بتلایا ہے کہ مختلف تجارتی - معاشرتی و سیاسی تعلقات کی وجہ سے سندھ، گجرات، کارو منڈل و جزائر بحر سند میں اسلام آہستہ آہستہ کیونکر پھیلتا چلا گیا - اسی ذیل میں یہہ ایک حیرتناک معلومات بیان کی ہے کہ آج سے ایک ہزار برس پہلے دیسی ہندو راجہ کے حکم سے ہندی یا زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا گیا تھا - ختم پر مسئلہ وحدۃالوجود کے ثابت لکھا ہے کہ ایسی کوئی بین دلیل موجود نہیں جس سے یہہ ثابت ہو سکے کہ یہہ تخیل مسلمانوں میں ویدانت سے آیا - ممکن ہے کہ یہہ افلاطونی فلسفہ کا اثر ہو - البتہ منصور جس وحدۃالوجود کا قائل تھا وہ متاخر صوفیوں کا وحدۃالوجود نہیں وہ حلول کا قائل تھا - ممکن ہے وہ یہہ عقیدہ ہندوستان سے لے گیا ہو - مولانا کا یہہ خیال صحیح ہے کہ ہندوؤں میں وحدت مذہبی کا جو تخیل پیدا ہوا وہ اسلام کے اثر سے ہے -

پانچویں حصہ کا موضوع سراسر تاریخی ہے - اس کا عنوان ، ہندوستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے ، ہے اور یہہ سب سے بڑا حصہ یعنی نصف کتاب سے کچھہ ہی کم ہے - شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوئیں - اس علاقہ میں نہ صرف یہہ ہوا کہ باہر سے مسلمان آکر آباد ہوئے بلکہ خود ملک کے باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا - یہہ اثر دو طرفہ کوششوں کا نتیجہ تھا ایک تو عرب تاجروں کی آمدورفت کا اور دوسرے سراندیپ کے نقش قدم کی زیارت کے لیے آنے والے صوفیوں اور درویشوں کی شرکت کا - پھر اسلام کے چھہ مرکز سرندیپ ، مالدیپ ، ملیبار ، کارومنڈل ، گجرات اور سندھ کی اشاعت اسلام کا مفصل بیان ہے - گجرات کے ذیل میں ابن بطوطہ کے سفر نامہ سے تمام ساحلی مقامات کا حال لکھا ہے - اور سندھ کے ذیل میں وہاں کی مسلمان حکومتوں کے مختصر حالات لکھے ہیں اور عربی کتب تاریخ و جغرافیہ کے مفید

دلچسپ اقتباسات کا ترجمہ دیا ہے - منصورہ کا مفصل تذکرہ ہے - عربی خاندانوں کی حکومتوں کے بعد سومری اور سمہ بادشاهوں کا حال ہے - اور پھر یہاں کے مشہور شہروں کا ذکر کیا ہے - اس کتاب کی زبان نہایت شگفتہ - دلکش اور اکیڈیمی کے نصب العین کے مطابق ہے یعنی مغلق عربی الفاظ اور ثقیل فارسی تراکیب سے خالی ہے - نہ بالکل خشک ہی ہے نہ شوخ و رنگیں -- جہاں موقع آجاتا ہے تو مولانا نہایت بے تکلفی سے ایسے جوہر قلم دکھا جاتے ہیں کہ بار بار ان سے لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے ذرا اس تشبیہ کی لطافت کو ملاحظہ کیجئے . —

"مکر فتوحات کا یہہ سلسلہ اس جہاز کی طرح تھا جو اپنے زور میں سمندر کے سینہ کو چاک کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے - لیکن جیسے ہی وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے پیچھے پانی سمٹ کر ایسا ہو جاتا ہے کہ پانی کی سطح میں اس غیر معمولی شگاف کا نشان بھی نہیں ملتا" "ایک جگہ اور لکھتے ہیں " دوسرا جل بل سمندر کا ایک ہاتھ اگر عرب کے ارض حرم کا دامن تھامے ہے تو اس کا دوسرا ہاتھ ہندوستان کے آریہ ورت کے قدم چھوتا ہے ــ"

مولانا نے لفظ "بندرگاہ" کو مؤنث استعمال کیا ہے - لفظ "بندر" تو یقیناً مذکر ہے مگر "بندرگاہ" کے بابت تامل ہے -- میں نے اپنے چند احباب و رفقائے کار سے دریافت کیا تو انہوں نے مذکر بتایا - فرهنگ آصفیہ میں اسے مونث لکھا ہے مگر نوراللغات میں مذکر ہونا درج ہے اور غالباً یہی صحیح معلوم ہوتا ہے - امید ہے کہ ڈاکٹر ی اور صاحب اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر مزید روشنی ڈالیں گے -

طباعت اس کتاب کی ٹائپ کے حروف میں ہے اور کشادہ کشادہ - مگر افسوس ہے کہ طباعت کی بے شمار غلطیاں رہ گئیں - اگرچہ آخر میں

پھر صفحوں کا صحت نامہ لگا ہوا ہے تاہم اور بہت سی غلطیاں ہیں لفظ سندھ عموماً "سندھہ" چھپا ہے - ابن خردادبہ ہر جگہ ابن خردازبہ (ز کے ساتھہ) ہے اول تو ذال ہی سے ہونا چاہیے تھا ورنہ زیادہ سے زیادہ ذال ہے - فہرست مضامین کو نہایت مفید طریقہ سے مرتب کیا گیا ہے البتہ اتنی قباحت ضرور ہے کہ متن کتاب میں حصوں کے علاوہ - جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں اُن کو فہرست میں جلی طور پر نہیں دکھلایا گیا - اس لیے اہم اور ذیلی مسائل میں کچھہ فرق سرسری نظر میں معلوم نہیں ہوتا -

اب میں چند باتیں مشورةً عرض کرتا ہوں:-

شروع میں ابن حوقل کا بنایا ہوا گجرات اور سندھ کا جو نقشہ دیا گیا ہے - وہ غلط حدود اربعہ قائم ہونے کی وجہ سے کسی قدر مضحکہ خیز ہوگیا ہے اگر مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کو باہم بدل دیا جائے تو یہہ زیادہ غلط نہیں رہتا "بحر ہند" ہندستان کے شمال مغرب میں ہے نہ کہ جنوب مشرق میں مولانا نے صفحہ ۳۷ اور ۳۹۷ پر اودھی قنوج کے علاوہ ایک اور قنوج کا سندھہ کے قریب ہونا بتلایا ہے بزمانہ قیام لندن مجھے بھی یہہ خیال ہوا تھا کہ شاید قنوج دو ہیں لیکن جب میں نے کچھہ جستجو کی تو یہہ خیال غلط نکلا کیننگھم وغیرہ کے قدیم جغرافیوں میں صرف ایک ہی قنوج کا ذکر ہے - ہندستان واپس آنے کے بعد معلوم ہوا کہ جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب قنوج کی تاریخ لکھہ رہے ہیں - ان کی "حیات جلیل" کے بعد ان کی تحقیق و کاوش کا کون قائل نہ ہوگا - اُن کے نزدیک بھی قنوج ایک ہی ہے - مولانا سید سلیمان ندوی نے دو حوالے دیے ہیں - ایک مسعودی کا اور دوسرا بشاری کا - آخرالذکر کی احسن التقاسیم یہاں الہ آباد میں نہ مل سکی - مروج الذہب مطبوعہ پیرس کو پھر دیکھا - مولانا نے صفحہ ۳۷۲ کا حوالہ دیا ہے - اس پر یہہ عبارت ہے :—

"ملك الهند البلهري ـ ملك قنوج من ملوك السند بوورہ هذا أسم كل ملك يلي القنوج وهنا مدينه يقال لها بوورہ باسم ملوكهم و قد صارت اليوم فی حیز الاسلام وهی من اعمال المولتان ....و بوورہ هذا الذي هو ملك القنوج هو ضد البلهري ملك الهند ـ"

ترجمه — هندستان کا بادشاہ بلهری ہے اور بادشاهان سنده میں سے قنوج کا بادشاہ بودرہ ہے - قنوج کے هر بادشاہ کو بودرہ کہتے هیں - اور یہاں ایک شہر ہے- جسے شاهان قنوج کے نام پر بوورہ کہتے هیں اور یہه شہر آج کل مسلمانوں کے قبضہ میں ہے اور ملتان کے متعلق ہے - بوورہ بادشاہ قنوج - هندستان کے بادشاہ بلهري کا مخالف ہے اس بیان سے صاف طور پر ظاهر ہے که مسعودی قنوج نام شہر کو نہیں ؟ بلکه بوورہ نام شہر کو مسلمانوں کے قبضه میں بتلاتا ہے - مولانا نے اس سے غلط نتیجه نکالا که قنوج دو تھے - مسعودي هندستان کے دو حصے کرتا ہے ؟ ایک شمالي - جسے وہ سندهه کہتا ہے - اور قنوج کے بادشاہ کو ؟ شاهان سندهه سے قرار دیتا ہے - دوسرا جنوبی - جسے وہ هند کہتا ہے اور یہاں کے بادشاہ کو بلهري بتاتا ہے - اور یہه کہتا ہے که ان دونوں بادشاهوں میں باهم سخت مخالفت و دشمني ہے چنانچه آگے چل کر بادشاہ قنوج کا ذکر کرتا ہے که اس کے هر چار سمتوں میں لڑنے کے لیے چار لشکر هیں - شمالي لشکر - والیء ملتان سے لڑنے کے لیے ہے اور جنوبي بلهري کي سر کوبي کے لیے - اب رها یہه که بلهري اور بوورہ در اصل کیا لفظ هیں - اس کي بابت الیٹ نے صفحه ۲۲ پر مفصل بحث کی ہے -

صفحه ۵۹ پر جابیه کے بعد بریکٹ میں عراق درج ہے - جابیه ؟ عراق میں نہیں شام میں ہے - (معجم البلدان یاقوت) -

صفحه ۱۵۷ پر شاناق کي بابت مولانا نے تحریر فرمایا ہے که خاص زهروں کے بیان میں اس کي اور کوئی کتاب بھي تھي - جو ساتویں

صدی هجری تک عربی میں موجود تھی - اس کتاب کا نام کتاب السموم ہے اور یہ اب تک موجود ہے - مجھے اس کے قلمی دو نسخوں کا پتہ معلوم ہے - ایک نسخہ برلن کے کتب خانہ میں ہے (دیکھو فہرست مخطوطات عربیہ برلن ۱۱۹۳ ء) اور دوسرا قاہرہ کے خدیویہ کتب خانہ میں (دیکھو فہرست جلد ششم مخطوطات المکتبة الخدیویہ) برلن والا نسخہ میں نے برلن میں دیکھا تھا - یہہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے ۸۴ صفحات پر شامل ہے -

دیباچہ میں ہے کہ ابتداء ابو حاتم بلخی نے خالد برمکی کے لیے ۲۰۰ ھ میں بزبان فارسی ترجمہ کیا اور پھر عباس بن سعید جوہر نے ۲۱۰ ھ میں اس کا عربی میں ترجمہ کیا - یہہ رسالہ چار مقالات میں منقسم ہے - پہلا مقالہ بطریق مقدمہ ہے - اس میں لکھا ہے کہ حکیموں نے مختلف قسم کے قاتل زہر بادشاہوں کی زندگی بچانے کے لیے بنائے ہیں - ان کا استعمال سوائے بادشاہ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں - دوسرا مقالہ مختلف قسم کے زہروں کے علامات کی بابت ہے - تیسرے مقالہ میں مختلف قسم کے زہر بنانے کے نسخے ہیں -

صفحہ ۲۵۹ پر صفاریہ حکومت کو سامانیہ حکومت کے بعد ہوتا لکھا ہے - یہہ صحیح نہیں ہے صفاریہ خاندان پہلے ہوا ہے -

المختصر یہہ کتاب مستطاب ادبیات اردو میں ایک بیش بہااضافہ ہے فاضل مصنف نے جس علمی تفحص و تنقیدی تجسس سے یہہ کتاب تصنیف فرمائی ہے حقیقت تو یہہ ہے کہ دنیائے اردو میں صرف انہیں کا حصہ ہے - مولانا کی اسی قبیل کی ایک اور تصنیف* ہے - جو فی الواقع اس کتاب کی طرح بے نظیر ہے - جس طرح وہ کتاب سر زمین قرآن پاک کی جغرافی و تاریخی معلومات کا بہترین ذخیرہ ہے اسی طرح یہہ تصنیف تعلقات عرب و ہند پر جامع ترین کتاب ہے -

---

* حاشیہ ذیلی - ارض القران -

روزنامچہ مقدس

مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھہ - ۱۵ جز - قیمت ایک روپیہ ۸ آنہ -

حاجی ایس - ابن علی صاحب ایڈیٹر و پروپرائٹر اخبار نیر اعظم مرادآباد نے سنہ ۱۰ ع میں فریضۂ حج و زیارت مقامات مقدسہ کے سلسلے میں سفر کیا تھا "روزنامچہ مقدس" انہیں سفر کے حالات پر مشتمل ہے -

سفر نامہ کی حیثیت تمام تر سیاح کے نقطۂ نظر پر موقوف ہے - حاجی ایس - ابن علی صاحب کا سفر چونکہ زیادہ تر مذہبی اخلاص و عقیدت سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس سفر نامے کے اکثر حصے دینی جذبات سے لبریز ہیں -

طرز نگارش قدیم ' مگر صاف ' سادہ اور دلچسپ ہے - کتاب میں ایک فہرست مضامین کی بھی ضرورت تھی ' تاہم اصل کتاب میں جلی سرخیوں سے اس ضرورت کو خفیف طرر پر پورا کر دیا گیا ہے - لکھائی چھپائی معمولی مگر سر ورق رنگین و دیدۂ زیب ہے -

---

لغات سعیدی

مرتبۂ مولوی عبدالعزیز صاحب - مطبوعہ مطبع مجیدی ' کانپور - حجم ۶۲۷ صفحات - قیمت درج نہیں -

ملنے کا پتہ — مطبع مجیدی ' کانپور -

یہہ ضخیم لغت عربی ' فارسی ' ترکی اور عبرانی زبانوں کے الفاظ کا مجموعہ ہے ان الفاظ کی تشریح سلیس اُردو زبان میں کی گئی ہے -

ترتیب میں ایک حد تک خوبی ملحوظ رکھی گئی ہے -
الفاظ پر اعراب لگا کر صحت تلفظ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے -
وہ الفاظ جو عام طور پر لکھنے پڑھنے میں رائج ہیں اس میں اکثر موجود ہیں - اس لیے یہہ کتاب طلباء کے لیے مفید ہو سکتی ہے -
البتہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے اس کو کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے -
کاغذ اچھا، لکھائی چھپائی دیدہ زیب اور تائیٹل رنگین ہے -

رسید کتب :

مخزن نجات - چہل حدیث کا ترجمہ مطبع معارف، اعظم گڈھہ — قیمت ۳ آنہ -

منتخبات هندی کلام - مرتبۂ ڈاکٹر جعفر حسین، پی - ایچ ڈی - حیدرآباد بک ڈپو - چادر گھاٹ، حیدرآباد دکن — قیمت دو روپیہ آٹھہ آنہ -

اعلان

هندستانی اکیڈیمی نے خاص خاص ماہرین فن کے ذریعہ کتابوں پر ریویو کرانے کا اہتمام کیا ہے، جن کتابوں پر ریویو کرانا مقصود ہو ان کی دو جلدیں اکیڈیمی میں روانہ کرنی چاہئیں - تا کہ ایک جلد اکیڈیمی میں رہے، اور دوسری تبصرہ نگار کے پاس بھیجی جاوے -

---

NATION... اسلامیہ ...

[illegible]

[illegible]

[illegible] کیا جائے گا۔

(۱) [illegible]

[illegible]

(ب) [illegible] کی [illegible] آزاد [illegible] کرنا۔

(ج) [illegible] اور علمی [illegible] ادیبوں [illegible] یا دوسرے ذرائع سے علمی ادبی اور تاریخی [illegible] یا ترجمہ کے کاموں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

(د) [illegible] کے [illegible] کو [illegible] کرنا۔

(ہ) [illegible] کتب خانہ قائم کرنا اور اس کا انتظام رکھنا۔

(و) [illegible] ارباب علم و فضل کو علمی مطالعہ کے لئے مدعو کرنا۔

هندستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ

کی مطبوعات

۱ — ازمنہ وسطیٰ میں ہندستان کی معاشرتی اور اقتصادی حالات ۔ از علامہ عبداللہ بن یوسف علی ۔ ایم اے ۔ ایل ایل ۔ ایم ۔ سی بی ۔ اے ۔ مجلد ۱ روپیہ ۴ آنہ ۔

۲— ایضاً غیر مجلد ۱ روپیہ ۔

۳ — اردو سروے رپورٹ از مولوی سید محمد ضامن علی صاحب ایم ۔ اے ۔ ۱ روپیہ ۔

۴ — مسلموں سے پہلے عرب اور ہندستان کے تعلقات ۔ از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ۔ ۴ روپیہ ۔

۵ — ناٹی (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمان صاحب ۔ ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ آر ۔ اے ۔ ایس ۔ ۲ روپیہ ۸ آنہ ۔

۶ — غریب عسل (ڈراما) مترجمہ بابو جگت سہائی لال صاحب ۔ رواں ۔ ۲ روپیہ ۔

۷ — کبیر صاحب ۔ مصنفہ پنڈت منوہر لال زتشی — ۲ روپیہ ۔

زیر طبع کتابیں

۱ — قرون وسطیٰ کا ہندستانی تمدن ۔ از رائے بہادر مہا مہوپادھیاے پنڈت گوری شنکر هیرا چند اوجھا ۔

۲ — ہندی شاعری ۔ از ڈاکٹر اعظم کریوی ۔

۳ — ترقی زراعت ۔ از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت ۔

۴ — عالم حیوانی ۔ از بابو برجیش بہادر صاحب بی ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی ایڈ

باهتمام ۔ رام چندر پرساد ورما ۔ کایستھ پاٹ شالا پریس ۔ الہ آباد

ناشر ۔ ڈاکٹر تاراچند ۔ ہندستانی اکیڈیمی ۔ الہ آباد

ہندستانی — اپریل سنہ ۱۹۳۱ء
ایڈیٹر: اصغر حسین۔

مجلس مدیران

۱ — ڈاکٹر تارا چند ایم، اے - ڈی، فل - صدر۔
۲ — پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی و فارسی یونیورسٹی الہ آباد۔
۳ — مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم - اے صدر شعبۂ فارسی و اردو یونیورسٹی لکھنؤ۔
۴ — منشی دیا نراین نگم بی - اے۔
۵ — مولوی اصغر حسین - سکریٹری۔

فہرست مضامین

MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI

ہندستانی

ہندستاني اکیڈیمي کا تماهي رسالہ

جلد ۱ | اپریل سنہ ۱۹۳۱ع | حصہ ۲

* رسم و رواج کا اثر زبان پر

(از مولوی نورالحسن نیّر ' بي - اے صاحب نوراللغات)

کسي نے خوب کہا هے کہ ملک کي انشا پردازی اپنے ملک کي تاریخ اشاروں سے بتاتي هے بول چال سے محاورے اور مثل سے ' لفظوں کا طریق استعمال ' اُسي طرح مقولے اور نصیحت سے فُصحا کا طرز گفتگو اور ان کے مذاق کا حال معلوم هوتا هے - بول چال محاورے مثل اور مقولے میں فرق هے اور وہ کسي قدر وضاحت چاهتا هے -

بول چال - کہتے هیں ایک خاص قسم کی ترتیب الفاظ کو ' جو اهل زبان کي زبان پر هو اور جس کے خلاف بولنا ٹکسال باهر هو -

(الف) اس میں الفاظ اپنے حقیقي معنی دیتے هیں مثلاً مجھے پانچ چھہ مرتبہ تمھارے یہاں جانے کا اتفاق هوا - اگر اس پر قیاس کر کے تین پانچ کہیں تو غلط هوگا - کیونکہ فُصحا اس معني میں " تین چار " " پانچ چھہ " اور " دس بیس " بولتے هیں -

(ب) جو جملے کي ترتیب' یا الفاظ کا طریقۂ استعمال اردو زبان میں مقرر هے' روز مرہ میں اس کي مطابقت لازم هے مثلاً " کیا کہیے سال بھر میں ایکبار بھی لکھنؤ جانے کا موقع نہیں ملا " - اگر اس جگہ " موقع نہ ملا " کہیں تو غلط هوگا -

* یہ مضمون اکیڈیمي کے گذشتہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا -

(ج) جس طرح خاص خاص موقعے اور محل پر اہل زبان بیساختہ الفاظ یا فقرے کہہ جاتے ہیں ان کو اسی طرح استعمال کرنا ضروری ہے :—

آتش—کہوں محبت بڑھائی تھی تم سے
ہم گنہ گار ہے گناہ ہو تم

اس صورت میں فعل کا حذف کرنا اور مکرر نہ لانا فصاحت کی جان ہے -

محاورہ - جب ایک یا کئی لفظ مصدر سے مل کر اور حقیقی معنی سے متجاوز ہوکر کچھہ اور معنی دینے لگتے ہیں تو اُس کو محاورہ کہتے ہیں - مثلاً آگ پانی میں لگانا - مزاج کو بھڑکا دینا ؟ جہاں لڑائی نہ ہوتی ہو وہاں لڑائی کرادینا - شرارت کرنا ؟ فتنہ اُٹھانا ؟ کے معانی میں مستعمل ہے - محاورے میں مصدر کے جملہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اصل محاورے میں کسی قسم کے تصرّف کرنے کا اختیار نہیں مثلاً "سر سہرا رہنا" کی جگہ "سر پر سہرا رہنا" ٹکسال باہر ہے -

مثل - ایک یا چند جملے جو عرصۂ دراز سے کسی خاص موقعے پر بطور مثال بولے جاتے اور اپنی حقیقی معنی سے متجاوز ہوکر کچھہ ور معنی دیتے ہیں - مثلاً کوئی شخص ایسی شے پر ناز یا فخر کرے جو اس کے ہاتھہ آنا دشوار تھی تو اس کی نسبت بولتے ہیں انوکھے گاؤں میں اونٹ آیا لوگوں نے جانا پرمیشر آیا - مثل میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر جائز ہے - لیکن مصدر کے تمام مشتقات کے ساتھہ استعمال جائز نہیں - مثلاً ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا کی جگہ ناچ نہ آیا آنگن ٹیڑھا بتانے لگے تو تصرّف بیجا ہوگا -

مقولہ - وہ فقرہ یا جملہ جو بوجہ عام کلیہ یا عمدہ نصیحت ہونے کے عام پسند ہو گیا ہو - اس میں الفاظ اپنے حقیقی معانی سے

متجاوز نہیں ہوتے اور نہ اس میں قدامت کی شرط ہے مثلاً
« بزرگی بعقل است نہ بسال » « با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب »

رسم و رواج - دو لفظوں سے مرکب ہے اور یہ دونوں لفظ بظاہر ہم معنی ہیں لیکن اِن میں فرق امتیازی ہے؟ ہر رسم کو رواج کہہ سکتے ہیں لیکن ہر رواج کو رسم نہیں کہہ سکتے -

رسم - خاص کر اُن افعال کے واسطے مستعمل ہے جس کو لوگ شادی غمی کے موقعوں پر دوسروں کی تقلید میں کرتے آئے ہیں - اور رواج صرف دستور اور چلن کے معنی میں مستعمل ہے - رسموں کی زندگی بے شبہہ خاص خاص زمانے تک رہتی ہے پھر اُن میں کمی بیشی ہوتی ہے - رسمیں امیر اور دولتمند عورتوں کا دل بہلاوا ہیں اور ضروری بھی نہیں ہوتی ہیں - متوسط درجے کے غریب لوگ اُن میں ترمیمیں کرتے رہتے ہیں میری نظر اُن رسموں کی طرف گئی جن سے محاورات بنے ہیں - اس میں شبہہ نہیں کہ بہت سی رسمیں ترک ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں - لیکن جو محاورات اُن سے بنے ہیں وہ ہمارے اُردو لٹریچر کا ایک ضروری جزو ہوگئے ہیں متقدمین کے کلام نثر و نظم میں اُن کی تلمیحیں موجود ہیں لہذا اِس مختصر مضمون میں اُن رسموں کو لکھتا ہوں جن کے جاننے سے اصل محاورے کی حقیقت اور معانی واضح ہو جاتے ہیں - ہر رسم کو مختصراً بیان کر کے وہ محاورات لکھدیئے ہیں جو اُن سے بنے ہیں -

(واضح ہو کہ اس مضمون میں مسلمانوں کی رسموں کا ذکر ہے) -

حمل کے آثار میں امور ذیل ہیں :—

۱ - ہاتھ پاؤں ٹوٹنا - سستی اور کاہلی ہونا - سونے اور پڑے رہنے کو جی چاہنا -

محاورات ذیل حاملہ ہونے کے معانی میں مستعمل ہیں :—

پاؤں بھاری ہونا ۔ دو جیا ہونا ۔ پیٹ رہ جانا* ۔ امید سے ہونا ۔

۱ ۔ حاملہ عورت کو گوشت سے نفرت ہو جاتی ہے اور کھٹّی میٹھی اور چٹپٹی چیز کو جی چاہتا ہے اِس لیے کھٹے میٹھے کو جی چاہنا محاورہ ہوگیا۔

۳ ۔ حمل کا ساتواں مہینہ جب ہوتا ہے میکے کی طرف سے سَدھورا آتا ہے (سدھورا ہندی میں سات چیزوں کو کہتے ہیں) جس میں سات طرح کی ترکاریاں میوے اور پکوان ہوتے ہیں ۔ سہ پہر کے وقت حاملہ کی گود بھری جاتی ہے یعنی اُس کو دلہن کی طرح آراستہ کر کے نندیں اُس کی گود میں کھانے کے پھل، میوے، ناریل وغیرہ ڈال دیتی ہیں گویا شگون ہے کہ ہمیشہ گود ہری بھری رہے اِس رسم کا نام گود بھرنا ہے ۔ لکھنؤ میں بیگمات کی زبانوں پر سدھورا دہلی میں سَدَھور سَدَھورا ہے قصبات میں اِس جگہ سدھوری معانی ذیل میں مستعمل ہے :۔

۱ ۔ وہ سات طرح کا پکوان جو ستوانسے میں دلہن کے میکے سے میوے اور چند قسم کی ترکاریوں کے ساتھ آتا ہے ۔

۲ ۔ حمل کے ساتویں مہینے حاملہ کا میکے سے سسرال آنا ۔ ستوانسا ۔ اِسی گود بھرنے کی رسم کا نام ہے اور اُس بچے کو بھی کہتے ہیں جو ساتویں مہینے پیدا ہو ۔ بعض خاندانوں میں نویں مہینہ گود بھرنے کی رسم ادا کیجاتی ہے اور اُس کو نوماسا کہتے ہیں ۔ اور بعض خاندانوں میں گود بھرنےکی رسم ساتویں اور نویں مہینہ یعنی دو بار کیجاتی ہے ۔

۴ ۔ نوماسے کے بعد حاملہ اپنے گھر یعنی میکے جاتی ہے اور اِسکو پاؤں پھیرنے جانا کہتے ہیں ۔

نوٹ—پیٹ رہ جانا مترادف الفاظ میں ہے ۔ لیکن اس میں تحقیر کا پہلو ہوتا ہے ۔ حمل عربی میں بالفتح ہے ۔ شعرا نے بفتح اول و دوم کہا ہے اور زبانوں پر بھی اِسی طرح ہے ۔ جانصاحب—دائی یقین دل کو ہے گر جائیگا حمل ۔ ننھا سا لڑکا خواب میں کل پیٹ مل گیا

۵ - اکثر بچے سر کے بھل پیدا ہوتے ہیں اور بعض پاؤں کے بھل، جو پاؤں کے بھل پیدا ہوتے ہیں اُن کو پایل کہتے ہیں - عورتوں کا عقیدہ ہے کہ ایسے شخص کے لات مارنے سے کمر کی چک دفع ہو جاتی ہے :—

جانصاحب—پایل ہے دو گانا ذرا ٹھوکر تو لگا جا

چک آئی ہے اُٹھا نہیں جا تا ہے کمر سے

۶ - بچے کے پیدا ہوتے ہی اُس کی نال کلاوے سے باندھکر چاقو سے کاٹ دیتے ہیں کلاوہ بچے کے گلے میں لٹکا دیتے ہیں - اور کٹے ہوئے نال کو بیشتر زچہ خانے ہی میں اور کبھی کبھی گھر کے کسی اور حصے میں دفن کردیتے ہیں عموماً یہ خیال ہے کہ مولود کو اُس جگہ یا مکان سے خاص تعلق اور اُنس ہوتا ہے جس میں اُس کا نال گڑا ہوتا ہے - چنانچہ نال گڑنا خاص تعلق ہونا، خصوصیت ہونا، کے معنی میں مستعمل ہے :-

منیر—اُسی ویرانے میں پھر پھر کے رہا کرتا ہے

دل میں کیا نال* گڑا ہے بت ہرجائی کا

امیر—نکلتے ہی نہیں مسجد سے واعظ

خدا کے گھر میں نال اُن کی گڑی ہے

نال، - وہ لانبی سی آنت جو پیدا ہوتے وقت بچے کے ناف سے لٹکی ہوئی ہوتی ہے -

۷ - لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں دستور ہے کہ جس ٹھیکری میں اُسے نہلاتے ہیں آپس کی رضامندی سے اُسی میں لڑکے کی ماں ایک روپیہ ڈال دیتی ہے جس کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ یہ لڑکی ہمارے لڑکے کی منگیتر ہوگئی -

۸ - جب سے بچہ ہوتا ہے زچہ کے سرہانے لوہے کی چیزیں جس میں

نوٹ—نال کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے - دہلی میں مؤنث اور لکھنؤ میں مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے - بیگمات لکھنؤ کی زبانوں پر تانیث ہی کے ساتھ ہے -

کھلوتی بھي ھوتی ھے ضرور رکھتے ھیں اور عورتوں کا خیال ھے کہ ایسا کرنے سے بچہ بھوت پریت اور آسیب کے خلل سے محفوظ رھتا ھے -

۹ - بانگ دینا - جب بچہ پیدا ھوتا ھے اس کے کان میں آھستہ آھستہ کلمات اذان کہتے ھیں اس فعل کا نام بانگ دینا ھے بانگ دینے والے کو نذر دیتے ھیں -

۱۰ - بچہ جس روز پیدا ھوتا ھے اُس روز سے چھہ روز تک زچہ کو سونے نہیں دیتے اور اس غرض سے زچہ کے پلنگ کو اکیلا نہیں چھوڑتے' انگیٹھی پر انگیٹھی روشن رھتی ھے - چھہ روز تک باری باری سے متعدد عورتیں جاگتی اور زچہ گیریاں گاتی ھیں -

زچہ خانہ - وہ مقام جہاں بچہ پیدا ھوتا ھے -

ناسخ—نال گڑتا ھے کبھی اور لاش گڑتی ھے کبھی
جو زچہ خانہ ھے وہ اک روز ماتم خانہ ھے

زچہ - (فارسی میں بغیر تشدید حرف دوم ھے اردو میں فصحا بھی اسی طرح بولتے ھیں عوام بتشدید بولتے ھیں) وہ عورت جس نے بچہ جنا ھو - ایسی عورت کو چالیس روز تک زچہ کہتے ھیں - اور سات دن تک آلی زچہ

جانصاحب—زچہ کی جان کا رھتا ھے ڈر اے جان جلنے میں
خدا ھی کام ھے زندگی کے آتا ایسی مشکل میں

زچہ گیریاں - وہ گیت جو زچہ خانے میں گاے جاتے ھیں -

۱۱ - جس روز سے بچہ پیدا ھوتا ھے نکٹی یعنی بلّی کو زچہ خانے میں نہیں آنے دیتے غالباً اِس خیال سے کہ وہ دفن ھوے ھوے نال کو نہ کھا جاوے - یا اِس خیال سے کہ بلی کی بھیس میں جن اور آسیب نہ ھوں -

۱۲ - بچے کو اول دن شہد - دوسرے دن گُھٹّی - تیسرے روز دودھ پلاتے ھیں بیشتر چھٹی تک پھوپھی سے دودھ پلاتے ھیں -

گھٹی میں پڑنا - کسی چیز کے استعمال کا بچپن سے عادی ہوجانا - سرشت میں داخل ہو جانا کی جگہ مستعمل ہے -

شاد — چھپاؤں واعظو کیا مے پڑی ہے میری گھٹی میں
وہ میخوار ازل ہوں دخت رز کا جس نے سر ڈھانکا

ناسخ — طفلی ہی سے ہے شوق شراب آب کے مانند
گھٹی میری پڑی میں بھی زنہار نہ چھوٹی

۱۳ - چھٹی - ولادت کے چھہ روز کے بعد چھٹی نہلاتے ہیں - زچہ نہا دھوکر سلہری پٹی سر سے باندھہ اور اعلی درجے کی پوشاک پہن کر بچے کے سر کو قصابے سے باندھکر دلھن سی بنی ہوئی پلنگ پر بیٹھتی ہے - اور مبارک باد کے گیت گاے جاتے ہیں - اُس روز برادری کی تمام عورتیں جمع ہوتی ہیں تیسرے پہر کو میکے سے چھٹی جسے چھوچھک بھی کہتے ہیں آتی ہے - چھٹی میں سونے خواہ چاندی کے کڑے - بچے کے گھونگھرو - چاندی کے چٹے بٹے ' چسلیاں - جھنجھنے ' کرتا ' توپی وغیرہ ہوتا ہے - بچے کے ماموں کی طرف سے ہنسلی ' کڑے ' خالہ کی طرف سے کرتے توپی کا رواج ہے - چھٹی کے روز ماں یا دایہ کا دودھہ بغیر بھوپھی کے دیا جاتا ہے جس کے اس طرح پینے میں بچے کو دقت ہوتی ہے - اس واسطے چھٹی کا دودھہ یاد آنا کمال دقت اور پریشانی میں گھر جانے کے معنی میں مستعمل ہے -

رشک — فکر بلندش میں چھٹی کا دودھہ یاد آیا کیا
غوطے کھائے سیکڑوں مضمون جوئے شعر میں

چھٹی کا کھایا پیا نکلنا - گذشتہ آرام و راحت کی کسر نکلنا -

چھٹی کے پوتڑے اب تک نہیں سوکھے - ہنوز نا تجربہ کار ہے ' کی جگہ -

چھٹی نہانا - بچہ ہونے کے چھہ روز بعد کا غسل کرنا -

۱۴ - عقیقہ یا مونڈن - عربی میں وہ بال جو بچے کے سر پر پیٹ میں پیدا ہو جاتے ہیں - وہ قربانی جو بچے کی پیدایش کے پہلے ہفتے

میں کی جاتی ہے - پیدایش سے ساتویں دن بچے کے بال منڈوائے جاتے ہیں اور اُن بالوں کے برابر چاندی خیرات کی جاتی ہے - اِسی تاریخ کو بچّے کا نام بھی رکھا جاتا ہے - بیٹے کے واسطے دو بکرے اور بیٹی کے واسطے ایک بکرا بطور صدقہ ذبح کرتے ہیں -

۱۵ - زچہ کا تارے دیکھنا - چھٹی کی رات کو زچہ‌خانے کے پاس چوکی بچھاتے اور اُس چوکی پر زچہ بچہ دونوں کو لاتے ہیں زچہ بچّے کو گود میں لے کر زچہ خانے سے باہر آتی ہے دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لیے ساتھ ہوتی ہیں - دائی آتے کی چومک لیے آگے آگے چلتی ہے - زچہ بچے کو گود میں لے کر اور قرآن شریف سر پر رکھکر آسمان کی طرف دیکھتی اور چوکی پر کھڑی ہو کر سات ستارے گنتی ہے اُس وقت دونوں تلواروں کی نوک سے نوک ملا کر زچہ کے سر پر قوس بناتی ہیں تا کہ اُوپر سے جن اور پری کا گزر نہ ہو :-

امیر — واہ کیا شکلیں ہیں قابل ہیں یہ تصویروں کے
دیکھو نکلی ہے زچّہ سایہ میں شمشیروں کے

جس وقت زچہ تارے دیکھتی ہے اُس وقت بچے کا باپ تیر کمان لے کر زچہ کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پوری بسم‌الله کہکر چھت پر تیر لگا کر گویا فرضی مِرگ مارتا ہے اِسی رسم کا نام مِرگ مارنا پڑ گیا ہے -

اب یہ دونوں رسمیں صرف شہزادوں میں باقی ہیں -

شاہ نصیر نے جب بہادر شاہ کے یہاں شہزادہ پیدا ہوا اِس رسم کا ذکر کیا ہے -

رهیں پھر شـاہ نے یہ رسم کی واں - چھپرکھٹ پر قدم رکھہ ہو کے شاداں
ادا کر حرف بسـم‌اللـہ سارا - کمان و تیر لے کر مرگ مارا
نمودار اس طرح تھا سقف میں تیر - فلک پر کہکشاں کی جیسے تحریر

اب صرف تارے دکھانے کی رسم باقی ہے - اور مرگ مارنے اور زچہ کی تلواروں کے ساتھہ سایہ میں لے کر چلنے کی رسمیں متروک ہیں -

۱۶ - رتجگہ - جسے لکھنؤ میں خدائي رات کہتے ہیں ، چھٹی، دودھ چھٹائي، سالگرہ ، بسم‌اللہ ، اور بیاہ کے موقعوں پر ہوتا ہے - رات بھر گلگلے پکائے جاتے ہیں اور اللہ میاں کا رحم بنایا جاتا ہے اور مسجدوں کے طاق بھرے جاتے ہیں -

رحم - ایک قسم کا چاولوں کا کچّا حلوا ہوتا ہے - جس‌کو لڈو کي شکل کا بھي بنا لیتے ہیں گلگلوں اور رحم پر نیاز دلوائي جاتي ہے -

۱۷ - چِلّہ یا چھلا - زچہ کا چالیسویں دن کا نہان جس کو بڑا چلہ بھي کہتے ہیں عموماً اِس تقریب میں چھٹي سے زیادہ دھوم دھام ہوتي ہے -

۱۸ - عورتیں بچے کے بہلانے کے لئے چاند کو چندا ماموں کہتي ہیں -

۱۹ - عورتیں اکثر رات کو بچوں کے بہلانے اور کھلانے کو اپنا ہاتھہ چراغ کي لو کي طرف لے جاتي اور اُدھر سے پلٹا کر وہي ہاتھہ بچوں کے منہہ پر پھیرتي ہیں اور یہ الفاظ بطور دعا زبان سے کہتي جاتي ہیں ، اکُّھو مکُّھو میاں کو الہہ رکھو ،

شوق—دیکھہ منہہ تک ہتیلي آتي ہے
اکھو مکّھو تمہیں کو بھاتي ہے

۲۰ - بِہائي - بچہ اگر سوتے میں ہنستا ہے تو کہتي ہیں کہ بِہائي ہنساتي ہے -

بہائي - سنسکرت میں وہ روح جو خوشي اور غم کي باتیں کہہ کے دودھہ پیتے بچوں کو سوتے جاگتے ہنساتي رولاتي ہے - اردو میں وہ خواب جس کو دیکھہ کر بچے سوتے میں ہنسنے لگتے ہیں :—

بحر—افسوس بہائي نے بھي مجھکو
طفلي میں نہ عشق کي خبر کي
طرفہ غمگین ہوں کہ روتي گئي وہ آہ شعور
آئي طفلي میں بہائي جو ہنسانے مجھکو

قلق نے سہواً بہائی کی جگہ بے حیائی کہا ہے -

روتے روتے جو نیند آتی تھی

بے حیائی اُسے ہنساتی تھی

۲۱—دانتوں کے نکلنے کی رسم - جب بچے کا پہلا دانت نکلتا ہے خشخاش کی میٹھی گُھنگھنیاں تقسیم کرتے ہیں اور اُسکو دانت گُھنگھنی کہتے ہیں -

جب دودھ پیتے بچے کے دانت نکلنے کے قریب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بچہ دانتوں پر ہے - دودھ کے دانت ٹوٹتے ہیں - تو اُن کو چوھے کے بل میں ڈالتے ہیں تا کہ بچے کے دانت بھی چھوٹے چھوٹے چوھیا کی دانتوں کی طرح خوشنما نکلیں -

دودہ کے دانت - وہ ملائم دانت جو شیرخوارگی کے زمانے میں نکلتے ہیں -

دودہ کے دانت نہیں ٹوٹے ہیں - نادان اور ناتجربہ‌کار ہونے کا کنایہ ہے -

شوق قدوائی—بچپنا ہے مہرے اشکوں سے جو رخ چھوٹے ہیں

دودہ کے دانت ابھی شبنم کے نہیں ٹوٹے ہیں

۲۲—سالگرہ - جس روز بچہ سال بھر کا ہوتا ہے تو ایک کشتی میں شیرینی اور کلاوہ کسی بڑے بوڑھے کے آگے رکھتے ہیں وہ نیاز دیکر اور بسم‌الله کہہ کے کلاوے میں ایک گرہ لگا دیتا ہے -

سلاطین و اُمرا عمر طبعی کے ہر نئے سال شروع ہونے کی تاریخ جشن کرتے ہیں - ہندستان میں بھی سالگرہ کے دن ہر سال ایک کلاوے میں گرہ لگا دیتے ہیں اور نذر و نیاز اور فاتحہ کے بعد شیرینی تقسیم کرتے ہیں :-

۲۳—دودہ بڑھانا - کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ تین سال کے بعد دودہ چھڑاتے ہیں اور اس رسم کو دودہ بڑھائی اور فعل کو دودہ بڑھانا کہتے ہیں :-

میر حسن—وہ گل جب کہ چوتھے برس میں لگا
بڑھایا گیا دودھ اُس ماہ کا

اوج—آب پیکاں سے ہوئی دودھ بڑھائی جس کی
خیمہ سے پیٹ کے سرماں نکل آئی جس کی

اِس تقریب میں ننھیال اور ددھیال کے اعزّا جمع ہوتے اور کھجوریں تلتے اور بچّے کو دیتے ہیں - دائی کھلائی کو انعام و اکرام اور جوڑے باگے دئے جاتے ہیں -

۲۴—ختنہ - (عربی میں ختن بالفتح ختنہ کرنا) یہ رسم شرعی ہندستان کے مسلمانوں میں بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتی ہے یہ رسم سہ پہر کو ہوتی ہے - اکثر ختنہ کرنا نائی کا کام ہے لیکن اب تو ڈاکٹروں سے ختنہ کرایا جاتا ہے جس میں اکثر خطا ہوتی ہے - جب بچہ کا زخم اچھا ہو جاتا ہے اُس کو دولھا بناتے اور گھوڑے پر چڑھا کر باجا بجاتے کسی بزرگ کی درگاہ میں لیجاتے ہیں - ختنہ کو سنت اور مسلمانی بھی کہتے ہیں -

۲۵ - ناک کان چھیدوانے کی رسم - بیشتر پانچ چھہ سال کی عمر میں لڑکیوں کے ناک کان چھیدے جاتے ہیں - ناک چھیدنے کے لیے بائیں جانب کا نتھنا کیل یا نتھہ پہننے کے واسطے چھیدا جاتا ہے - اور ہر ایک کان میں نیچے کیطرف تین تین سوراخ اور اوپر کی جانب چار چار بالے بالیاں پتّے پہننے کے لیے کیے جاتے ہیں -

۲۶ - بسم اللہ کی شادی - بچہ جب ساڑھے چار برس کا ہوتا ہے اسی تقریب سے مکتب نشینی کی ابتدا ہوتی ہے -

بچے کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھہ سورۂ علق کی آیتیں پڑھاتے ہیں بعدہ "مبارک سلامت" کی دھوم ہوتی ہے - اس تقریب میں

حیثیت کے موافق دھوم دھام کرتے ھیں اس کو مکتب بھي کہتے ھیں -

آمین - ھدیہ - بچہ قران شریف ختم کرتا ھے تو بڑي خوشی کرتے ھیں استاد کو انعام و اکرام و خلعت اور احباب اور اعزا کو شیریني تقسیم کرتے ھیں - اُس کو دھلي میں ھدیہ اور لکھنؤ میں آمین اور آمین کي شادي کہتے ھیں -

۲۷ - روزہ - جب بچہ سات یا نو یا گیارہ سال کا ھو جاتا ھے تو اُسے روزہ رکھواتے ھیں اور وہ بھی ایک چھوٹي سی تقریب ھوتی ھے -

روزہ کشائی - دھلی میں بہ معنی افطاري ھے :—

داغ—قسمت ھي میں زاھد کے ھیں دن رات کے فاقے
کیا پیر مغاں روزہ کشائي نہیں دیتا

لکھنؤ میں روزہ کھلوانے کی تقریب کا نام ھے :—

بحر—زاھدو دعوتِ رنداں ھے شراب اور کباب
کبھي میخانے میں بھي روزہ کشائي ھو جائے

۲۸ - موچھوں کا کونڈا - بچے کا سن جب ۱۷ - ۱۸ سال کا ھو جاتا ھے اور اُس کی مسین بھیگنے لگتي ھیں تو موچھوں کا کونڈا کیا جاتا ھے - لڑکے کي موچھوں پر گِھسا ھوا صندل انگلي سے نہیں بلکہ روپیے سے لگاتے ھیں - یہ نیاز سوّیوں پر ھوتی ھے - اِس رسم میں بھي قریبي رشتہ دار جمع کیے جاتے ھیں - مسین بھیگنا :— سبزہ آغاز ھونا — وہ سبزي نمایاں ھونا جو ڈاڑھی مونچھوں کے نئے بالوں کے نکلنے سے ظاھر ھوتی ھے -

جانصاحب—اُٹھتی کوپل ھے جواني کی نیا ھے انداز
ھونٹ پتلے ھیں مسیں بھیگتي سبزہ آغاز

۲۹ - بات - منگنی - نسبت -

ھندستان میں لڑکے والے کی طرف سے نسبت کا پیغام جاتا ھے -

جس جگہ پیغام دینا ہوتا ھے وھاں کے افسر خاندان کے پاس نسبت کے رقعہ سے پہلے ایک سرخ کاغذ پر خاندانی حالات لکھہ کر مشّاطہ کے ذریعے سے بھیجتے ھیں - اِس کاغذ میں خاندانی حالات ، چال چلن ، آمدنی وغیرہ اور لڑکے کی علمی قابلیت درج ھوتی ھے - اِس کاغذ کو اِسم نویسی کہتے ھیں - اِسم نویسی کے جواب میں اگر رضامندی کا اشارہ معلوم ھوا تو رقعہ بھیجتے ھیں -

بات آنا - نسبت کا پیام آنا :—

طلسم الفت—دھوم مستوں نے یہ مچائی ھے
دخترِ رز کی بات آئی ھے

بات تھہرانا—نسبت تھہرانا - بات تھہرنا - منگنی قرار پانا :—

طلسم الفت—بات بھی تھیری ھے کہیں اُن کی
آپ کو فکر کچھہ نہیں اُن کی

بات جانا—منگنی کا پیام جانا -

شعور—فرحتِ عید کو نسبت نہ رھی شادی سے
جس کے گھر رقعہ گیا اور تری بات گئی

۳۰ - فریقین کا اِطمینان ھو جاتا ھے تو منھہ میٹھا کرنے کا دن مقرر کر کے دولھا کی طرف سے چند عورتیں دلھن کے گھر مٹھائی کے خوان اور چڑھاوا لے کر جاتی ھیں - مٹھائی کی مقدار حیثیت کے مطابق ھوتی ھے اِسی رسم کو منھہ میٹھا کرنا کہتے ھیں -

چڑھاوا - اُس زیور کو کہتے ھیں جو منگنی یا برات کے روز دلھن کو دولھا والوں کی طرف سے دیا جاتا ھے اس میں بیشتر سونے کی انگوٹھی یا چاندی کا چھلّا ھوتا ھے -

نشان چڑھانا - منگنی کے روز انگوٹھی ، چھلّا وغیرہ منسوبہ کو پہنانا -

جان صاحب—انگوٹھی ایسی بناتے نہیں دمامے کی

چڑھایا تم نے ہے سمدھن بہت نشان خراب

۳۱ - بیاہ مانگنا - جب نکاح کرنے کا زمانہ آجاتا ہے تو دولہا کی طرف کی عورتیں امیروں میں باجے گاجے کے ساتھہ مٹھائی کے خوان ساتھہ لیکر اور غریبوں میں چپ چپاتے منسوبہ کے گھر جاتی اور تاریخ ٹھیرا کر واپس آتی ہیں اس کو بیاہ مانگنا کہتے ہیں -

۳۲ - مایئوں بٹھانا - جب بیاہ کے سات یا گیارہ روز رہ جاتے ہیں ؟ قریبی رشتہ دار عورتوں کو جمع کر کے دلھن کا کرتا - پیجامہ - دوپٹا زرد رنگتے ہیں پینڈیاں بناتے ہیں اور اس روز منسوبہ کو زرد کپڑے پہناتے ہیں اور مکان کے کسی کوٹھے پر بیٹھاتے ہیں۔ اب اُس کی صحبت میں بن بیاھی ھمعمر لڑکیاں رھتی ہیں

تلائی - (قصبات میں) برات سے دو روز پیشتر عروس کے تیل لگایا جاتا ہے - اس رسم کو تلائی کہتے ہیں (فقرہ) آج تلائی کل سہاگ پرسوں برات ہے -

۳۳—شادی سے دو تین روز پہلے دولھا بھی علحدہ مکان میں بیٹھتا ہے اُس کو مانجھے بیٹھنا کہتے ہیں دولھا دلھن کی گھر والیاں سہاگ گاتی ہیں -

سہاگ - (ھ - سو - اچھا - بھاگ - قسمت سنسکرت میں بمعنی خوش ؟ خوش قسمتی ہے) -

یہ لفظ معانی ذیل میں مستعمل ہے :—

۱ - خاوند کی حیات کا زمانہ -

۲ - ایک قسم کے خاص گیت جو شادی بیاہ میں گائے جاتے دھلی میں ان گیتوں کو سہاگ گھوڑیاں کہتے ھیں :—

مہر حسن—اِدھر کا تو یہ رنگ تھا اور یہ راگ
محل میں اُدھر کھوڑیاں اور سہاگ

۳ - وہ تمام زیور اور چیزیں جو سہاگن ہونے کی حالت میں عورتیں پہنتی اور اِستعمال کرتی ہیں جیسے نتھ - مہندی - مسی وغیرہ -

سہاگ رات—شبِ زفاف اِس کو تخت کی رات بھی کہتے ہیں :—

جان صاحب—آئی جب کلموہی وہ تخت کی رات
باجی ہمسایہ نے سکھائی یہ بات

۳۴ - اُبٹن - ایک خوشبودار مسالا ہے جس کے اِستعمال سے رنگ نکھرتا اور بدن میں خوشبو دیر تک رہتی ہے یہ ہلدی اور جو کے بُھنے ہوئے آٹے، کھلی، چھیل چھبیلے، ناگر موتھا، تج، بالچھڑ اور تیز پات سے مرکب ہوتا ہے اور تیل ڈال کر پانی میں گھولا جاتا ہے - لکھنؤ میں اُبٹن دہلی میں بٹنا اور اُبٹنا ہے :—

نسیم لکھنوی—کیوں نہ غیرت سے مرا دل اے وفا دشمن ملے
روز تو نکھرے نہائے روز غیر اُبٹن ملے

داغ دہلوی—دامن سے رشک گل کی اُڑی باغ میں جو خاک
بٹنا وہ بن گئی ہے عروس بہار

مائیوں بیٹھنے کے بعد دولہا دلہن کے اُبٹن روز ملا جاتا ہے -

اُبٹن کھیلنا - عموماً دولہا دولہن کے مانجھے بیٹھنے کے بعد اور خصوصاً ساچق کے روز اُبٹن بڑی بڑی لگنوں میں گھولتے اور دونوں گھروں میں عورتیں عورتوں کے اور مرد مردوں کے اُبٹن لگا کر بُری گت بناتے ہیں - اُبٹن کھیلنے کا رواج بیشتر اُن لوگوں میں ہے جن میں آپس میں مذاق ہوتا ہو جیسے سالے بہنوئی - نند - بھاوجیں -

۳۵ - بری - ساچق - (بری بر بمعنی شوہر) ساچق ترکی میں بکسر حرف سوم اُردو میں بفتحِ سوم ہوگیا ہے - بعض شہروں میں برات

سے ایک دن پہلے اور قصبات میں برات کے روز دولھا کی طرف سے دولھن کے یہاں کپڑے ، زیور ، میوہ ، مٹھائي ، پاپوش زنانہ ، رنگین سر بند تھیلیاں ، سہاگ پڑا ، پھلیل ، پان اور کھیلیں جاتي ھیں - تھیلیوں میں سفید شکر چھوارے ناریل - کشمش - بادام - مہندي کوزہ نبات ھوتے ھیں - جوڑوں زیور اور میوے کي کوئي مقدار مقرر نہیں ھے - اپنے اپنے مقدور پر ھے جوڑے معہ زیور واپس آتے ھیں باقی سب چیزیں عروس کے یہاں رھتی ھیں ایک جوڑا جو سب میں بہتر ھوتا ھے اور پاپوش عروس کو پہنا کر رخصت کرتے ھیں ۔—

جانصاحب—جوڑا بري میں آیا بڑي دھوم دھام کا

سہاگ پُڑا - کاغذ کا خوشنما پُڑا جس میں خوشبو کي چیزیں رکھہ کر ساچق میں دولھن کو بھیجتے ھیں -

ساچق چڑھنا - جب بري دھوم دھام سے باجے گاجے کے ساتھہ جاتی ھے اُس کو ساچق چڑھنا کہتے ھیں -

شربت پلائی ۱ - وہ نقد رقم جو برات یا ساچق کے روز دولھا اور دولھا کے رشتے دار شربت پینے پہ شربت کي تھالی میں ڈالتے ھیں -

۲ - وہ نیگ جو دولھا یا دلھن کي طرف سے نائي کو دیا جائے -

شربت پلانا ۱ - حجام کا نکاح سے پیشتر سب براتیوں کو شربت پلانا -

۲ - نسبت کرنا - شربت کے پیالے پر نکاح کر دینا - غریبوں کي طرح صرف شربت پلا کر نکاح کر دینا -

۳۶ - (برات بر وزن نجات - بر - شوھر - رات آتا ھے) عوام کي زبانوں پر بارات ھے - یہ لفظ معاني ذیل میں مستعمل ھے - (۱) شادي

کا دن (۲) شادي کا جلوس - دولها کي سواري کا جلوس آرایش کے ساتهه -

برات اُترنا - براتیوں کا تهہرنا کسي مقام پر :—

محسن—خوشي میں بهرے مومن و مومنات

احاطے میں رضواں کے اُتري برات

برات جانا - شادي کے جلوس کا جانا - مجمع کا روانه هونا :—

داغ—ساتهه حوروں کے هے شهید ترا - کیا عدم کو برات جاتي هے

برات چڑهنا - برات کے جلوس کا عروس کے گهر کو دهوم دهام سے روانه هونا -

برات کرنا - شادي کے جلوس میں شرکت کرنا -

برات لیجانا - براتیوں کو دولهن کے گهر لے جانا -

براتي - وہ جو دولها کي طرف سے برات کے جلوس میں شریک هو -

جانصاحب—کیسے هوئے هیں جمع براتي برات میں

ذوق—پہونچے براتیوں کے نه هرگز هجوم کو

انجم سے لاکهه جمع کرے لشکر آسماں

دلهن - (ه - بر وزن ختن) عروس :—

جلال—کیا شرمگیں نگاہ سے کہتا هے دل نه پوچهه

راز و نیاز یار یه دولها دلهن کے هیں

اس کي جمع دلهنیں هے -

انیس—گردان کے پهر آنکهوں سے سہرے کو لگاؤ

دو چاند سی گهر میں دلهنیں بیاہ کے لاؤ

بعض شعرا نے دولهن بهي کہا هے :—

نواب مرزا شوق—عطر دولهن کا نه اِس طرح ملے رهتے تهے

بلد محرم کے نه اِس طرح کسے رهتے تهے

دولهن کا عطر - عطر عروس - عوام عطر دولهن کہتے هیں -

۳۷ ـ صحنک ـ (ف ـ صحن ـ بڑا تھال ـ صحنک اُس کی تصغیر ھے) یہ لفظ دو معنی میں مستعمل ھے ـ

۱ ـ حضرت فاطمہ کی نیاز ـ

۲ ـ فاطمہ کا طباق یا کونڈا ـ

یہ نیاز خشکے یا زردے پر دلائی جاتی ھے ـ

صحنک کی ایجاد جودھا بائی نے کی ـ نور جہاں جس کا نکاح شیر افگن کے بعد جہانگیر سے ھوا تھا جودھا بائی کو نظر حقارت سے دیکھتی تھی ـ جودھا بائی نے اُس کے ذلیل کرنے کو ایک روز تمام بیگمات کی دعوت کی حضرت فاطمہ کی نیاز دلوائی نیاز کے لیے خشکہ پکوایا کورے کونڈوں میں رکھا سات ترکاریاں رکھیں اور جب سب بیگمات جمع ھوگئیں بآواز بلند کہا "اِس صحنک کو وھی بیوی کھا سکتی ھے جس نے دوسرا خاوند نہ کیا ھو" ـ یہ سن کر نور جہاں شرمندہ ھوئی ـ اب یہ نیاز ھر ایک تقریب اور شادی کے موقع پر ھوتی ھے ـ اِس کے کھانے کے واسطے پاکدامن اور پارسا عورتیں نامزد کی جاتی ھیں دوھاجو اِس کو نہیں چھو سکتی ھے ـ

۳۸ ـ برات ـ

حجام نوشہ کو نہلا دھلا کر بدن کا جوڑا لیتا ھے اُس کے بعد شاھانہ جوڑا پہنایا جاتا ھے ـ نیچے کرتا ـ کرتے کے اوپر انگرکھا یا اچکن یا شیروانی ـ سر پر دستار ـ دستار پر گوشوارہ ـ شہزادوں میں موتیوں کا طرہ اور سہرا ـ متوسط درجے کے لوگوں میں پھولوں کا سہرا پھولوں کا طرّہ ـ پھولوں کی بَدھی ـ

نوشاہ آراستہ ھو گیا تو زیور سے آراستہ گھوڑا لایا گیا ـ دولھا سوار ھوا اُس کے پیچھے شہبالا (دولھا کا چھوٹا بھائی یا کسی اور قریبی رشتہ دار کا لڑکا جس کی عمر کم ھو) ـ

دولھا کے ایک ھاتھ میں لگام دوسرے میں رومال منہ سے ڈھکا ھوا ـ

دولھا آگے بڑھا تمام براتي پیچھے پیچھے سب سے آگے باجا اور سب سے پیچھے زناني سواریوں کے محافے اِس شان سے برات چڑھي -

راستے میں آتھلّیاں - چونّیاں - پیسے لٹائے جاتے اور آتشبازي چھوٹتي ھے جس وقت یه جلوس دلھن کے دروازے پھونچتا ھے لوگ پیشوائي کو آتے ھیں دولھا اور سب براتي مردانے میں اور زناني سواریاں زنانخانے میں اُترتي ھیں -

دولھا مسند پر زر پر صدر میں بتھایا جاتا ھے رومال اُس کے منھه پر رھتا ھے اُس کے ھمعمر پہلو میں بیتھتے ھیں - دلھن کے طرف سے کشتیوں میں دولھا کا جوڑا آتا ھے جس کو پہنا کر نکاح ھوتا ھے - بدن کا جوڑا نائي کا حق ھے - دلھن والے قاضی صاحب کو بلاتے ھیں - قاضي صاحب کے آنے کے بعد دلھن والوں کی طرف سے ایک وکیل اور دو گواہ اتے ھیں - قاضي صاحب پہلے دولھا کے قریب بیتھه کر خطبه پڑھتے ھیں جس میں حمد و نعت ، توحید و رسالت کي شھادت ھوتي ھے - اور خدا سے ڈرنے اور اُس کے احکام پر عمل کرنے اور عھد و قرار پر قائم رھنے کي ترغیب ھوتي ھے - عروس کا ولي جلسۂ نکاح میں نھیں آتا اپني طرف سے وکیل کردیتا ھے - اور اس وکالت کے دو گواہ بھي مقرر کردیتا ھے -

شرعاً بالغه عورت کے لیے ضرورت ھے که بلا واسطه اجازت وکالت دي دے - چنانچه اب بھي قصبات میں پہلے وکیل اور گواہ عروس کے پردے کے باھر جا کر بآواز بلند اجازت حاصل کرتے ھیں ، عروس ھاں ھوں نھیں کرتي بلکه رو دیتي ھے اور اِس سے اجازت مراد لي جاتي ھے - قاضي وکیل سے عروس کا نام، ولدیت وغیرہ دین مھر کي تعداد آھسته آھسته دریافت کرتا ھے - اور پھر دولھا سے کھتا ھے که مسماۃ فلاں بلنت فلاں کو بعوض اتنے دین مھر کے تمھاري زوجیت میں دیا تم نے قبول کیا - اس کے جواب میں دولھا بعد تھوڑے وقفے کے کھتا ھے "قبول کیا میں نے" -

قاضي صاحب یه مضمون تین مرتبه آهسته آهسته دولها سے کہتے هیں اور اُس سے "قبول کیا میں نے" هر بار کہلاتے هیں - یه مضمون اس قدر دهیمی آواز سے کہا جاتا هے که وکیل اور گواہ سن لیتے هیں- بقیه اهل مجلس مشکل سے سن پاتے هیں - اسي سوال و جواب کا نام ایجاب و قبول هے -

ایجاب وقبول کے بعد قاضي اور تمام اهل مجلس دعا کے واسطے هاتھ اُٹھاتے هیں - اور حاضرین مبارک باد دینا شروع کرتے هیں - نکاح کے ختم هوتے هی دولها کے سر پر چھوارے لٹائے جاتے هیں اور قاضي صاحب کو حسب حیثیت دولها کا باپ نذر دیتا هے - بعد نکاح کے عروس کا جوڑا دولها کے طرف سے جاتا هے -

نوشاہ - نوشه -

سہرا - (ه - سر - مونث) وه پھولوں کي لڑیاں جو دولها اور دلهن کے سر پر سے ملهه پر لٹکائي جاتي هیں - شهزادوں اور والیان ملک کے یہاں سونے اور موتیوں کا سہرا عروس کے باندها جاتا هے -

۲ - وه نظم جو شعرا سہرا باندھنے کے تقریب میں کہتے هیں :—

ریاض—دهوم مچ جائے بزم نوشه میں - شور اُٹھے خوب هي کہا سہرا

سہرا باندھنا - سہرا سر پر رکھنا دولها بنانے کے لیے -

بحر—رات گذري همیں دولها کي طرح فرقت میں

صبح کو آنسوؤں کے تار نے سہرا باندھا

سہرا بنانا - موتیوں یا پھولوں کي مسلسل لڑیاں بنانا که سہرے کی صورت هوجائے :—

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بناکر لایا

واسطے تیرے ترا ذوق ثناگر سہرا

سہرا بندهائي - سہرا باندھنے کا نیگ جو بهنوئي کو ملتا هے -

سہرا دکھانا - شادي دیکھنے کا موقع نصیب کرنا -

سہرا دیکھنا ۔ بیاہ دیکھنا ۔ بیاہ رچانا ۔

سہرا گوندھنا ۔ موتیوں یا پھولوں کو پرو کر سہرے کی شکل بنانا ۔

جلوہ ۔ عربی میں بالفتح دکھانا ؟ نمایش کرنا ۔ بالکسر اپنے آپ کو خاص انداز سے دکھانا ۔ عوام کی زبانوں پر بالضم ہے ۔

سہرے جلوے کی ۔ (جلوہ اردو میں آرسی مصحف کی جگہ مستعمل ہے ۔ پہلی رخصتی کو دولہا دلہن کو آمنے سامنے بٹھا کر آرسی مصحف دکھاتے ہیں ۔ بیاھتا بیوی :—

جانصاحب—کیوں سوت کی میں آگ میں جل جل کے مروں گی
ہوں سہرے نہ جلوے کی جو بھرنا میں بھروں گی

سہرے کے پھول کھلنا ۔ (کنایہ) بیاہ کا وقت آنا ۔ بیاہ ہونا

منیر—دونوں دولہا دلہن خوشی سے ملیں
کہیں سہرے کے پھول جلد کھلیں

سہرے کی لڑی ٹوٹنا ۔ عورتیں اس کو منحوس سمجھتی ہیں :—

جانصاحب—ہو خیر دلہن دولہا کی ماتھا مرا ٹھنکا
اچھا نہیں بی ٹوٹنا سہرے کے لڑی کا

نوشاہ نوشہ (ف ۔ نو ۔ نیا ۔ شاہ ۔ داماد)

دولہا ۔ چوتھی تک یہ خطاب دولہا کا رہتا ہے ۔

بیاہ (سنسکرت میں وواہ ۔ بواہ) اُردو نظم میں بر وزن راہ فصیح اور بر وزن سیاہ غیر فصیح ہے :—

داغ—کرے اللہ عمر و دولت و اقبال روز افزوں
خدا وہ دن دکھائے لوگ دیکھیں بیاہ کی شادی

۱۴—ریت رسم ۔ بعد نکاح کے دولہا عروس کے مکان میں بلایا جاتا ہے دولہا سہرا لٹکائے گردن جھکائے منہ پر رومال رکھے شرمیلی چال سے

ہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے ڈیوڑھی پر آنا ھے یہاں سے دولھا کي بہلنیں
دولھا کے سر پر آنچل ڈال کر اندر لیجاتي ھیں -

۱ —- اُس وقت دلھن والیاں دلھن کے پاس بٹھا کر کالے تل اور
شکر دلھن کے ھاتھہ پر رکھہ کر دولھا کے منہ سے چٹواتي ھیں -
دولھا کو بغیر ھاتھہ لگائے زبان سے چاٹنا پڑتا ھے - یہ ایک
قسم کا ٹوٹکا ھے - اور منشا یہ ھوتا ھے کہ وہ ھمیشہ مطیع اور
تابعدار رھے - چنانچہ اسی ٹوٹکے سے کالے تل چاٹنا محاورہ
ھو گیا ھے - اور یوں اِستعمال میں ھے "کیا ھم نے ایسے ھي
تمہارے کالے تل چاٹے ھیں جو تم سے آنکھہ نیچي کریں" -

۲ —- دلھن کی جوتی پر کاجل پار کے دولھا کے آنکھوں میں لگاتی
ھیں تا کہ ھمیشہ بیوی کے جوتی تلے رھے -

۳ —- دلھن کے پاؤں کے نیچے کا پان دولھا کو کھلاتے ھیں -

۴ —- دولھا کے ایک ھاتھہ سے مروجہ بسوایا جاتا ھے - مروج ، بالچھڑ
چھیل چھبیلے ، کپور ، کچری ، صندل ، مشک دانہ وغیرہ
خوشبودار چیزوں کا نام ھے - ایک ھاتھہ سے اِن چیزوں کا پیسنا
کارے دارد ، دولھا پسینے پسینے ھو جاتا ھے اُس وقت سات
سُہاگنیں اُس کي کُمک کو آتي ھیں - اور مل کر پسوا دیتي ھیں
جب یہ پس جاتا ھے تو دولھا اور سہاگنیں دلھن کي مانگ
میں بھر دیتی ھیں - بعض جگہ مانگ سیندور سے بھري
جاتی ھے - اور دولھا کا باپ اشرفي سے مانگ بھرتا ھے -

۵ —- نو باتیں چلوانا - نو بات ، نبات سے بگڑا ھوا ھے - نو باتیں
ڈومني چلواتی ھے - پہلے دلھن کے سر پر مصري کی ڈلي رکھتي
ھے اور دولھا سے کہتي ھے اِس کو منہ سے اُٹھا کر کھا جاؤ -
جب دولھا سر کے پاس اپنا منہ لے جاتا ھے وھاں سے ھٹا کر

دوسری جگہ رکھہ دیتی هے - جب سر کی ذلي بمسکل دولها کہا لیتا هے تو دو دلہاں مونڈھوں پر اور پھر پنّھے گھلیوں اور گھٹنوں پر رکھہ کر اسی طرح دهکاتي هے -

۴۱ — آرسي مصحف - دولها دلهن کوآمنے سامنے سر سے سر ملا کر بیٹھاتے اور سرخ دوشالہ یا دوپٹا دولہن کے سر پر ڈال دیتے هیں آئینہ اور قرآن شریف سورۂ اخلاص کے مقام پر کھول کر بیچ میں رکھہ دیتے هیں عورتیں دولها سے اصرار کرتي هیں کہ دیکھو اور کہو بي بي میں تمهارا غلام ، آنکھیں کھولو - دولها کہنے میں اغماض کرتا هے آخر اُس سے دهینگا دهینگي کہوا هی لیتي هیں - دلهن جب اس پر بھي شرم سے آنکھیں نہیں کھولتي هے تو منت سماجت کر کے سمجھاتے هیں کہ آنکھیں کھول کر بي بي آئینہ دیکھہ لو - جب دلهن ذرا ذرا آنکھیں کھول دیتي هے دولها کہہ اٹھتا هے کہ آنکھیں کھولدیں اور اپنے هاتھہ کی انگوٹھي دلهن کے هاتھہ میں پہنا دیتا هے :—

قلق — شور یہ عورتوں کا چار طرف
جلد دکھلاؤ آرسي مصحف

۴۲ - جهیز (عربي میں بکسر اول و دوم جہاز کا اِماله هے) عوام دهیز اور دان دهیز کہتے هیں - وہ اسباب جو لڑکي کو شادي کے وقت میکے سے ملتا هے - بیشتر گھر بار کي ضروري چیزیں اور گھر داري کے سامان سے مراد هوتي هے جو هر شخص اپني حیثیت کے موافق بیٹي کو رخصت کے وقت دیتا هے - اس میں سات سے لے کر اکیس تک بھاری بھاري جوڑے دُهرے تہرے گهلے هوتے هیں - علاوہ ضرورت کے بال بچہ هونے کا سامان ، یعنی طشت ، چوکی ، زچہ خانے میں باندهنے کا سرخ پردہ بھی هوتا هے -

۴۳ - بابل - جسے دھلی میں ملتھا کہتے ھیں - گھر کے چھوٹلے کا ایک درد انگیز گیت جو عروس کے میکے سے پہلی رخصتی کے وقت گیا جاتا ھے -

۴۴ - جب دلھن کی سواری دولھا کے گھر پہونچتی ھے تو دولھا کی بہنیں دروازے زنانے مکان کے بند کرلیتی ھیں اور اُس کا نیگ لیتی ھیں دلھن گود میں اُتاری جاتی ھے اور اُس وقت منھہ دکھائی دی جاتی ھے اور کھیر چٹائی جاتی ھے -

رونمائی - وہ نقدی جو خاوند کے رشتے دار دلھن کا منہ دیکھہ کر دیتے ھیں -

کھیر چٹانا - یہ رسم اس طرح ادا کی جاتی ھے کہ عروس کی ھتیلی پر کھیر پھیکی رکھہ کر اس میں انداز سے شکر ملاتے ھیں بعض مقامات پر دستور ھے کہ دولھا اپنے ھاتھہ سے چکھہ لیتا ھے اور بعضوں میں صرف اپنا ھاتھہ وھاں تک لے جاتا ھے اور چکھتا نہیں پھر میراثن وہ کھیر ایک پیالے میں رکھہ لیتی ھے اور اسی طرح سات مرتبہ کھیر عروس کے ھاتھہ پر رکھی جاتی ھے - اور ھر بار اس کو میراثن اپنے پیالے میں رکھہ لیتی ھے - اس وقت میراثنیں گیت گاتی ھیں -

۴۵ - پاؤں دھونا - اس وقت لوٹا اور طشت جو جھیز میں عروس کو ملتا ھے سامنے لایا جاتا ھے اور نوشہ عروس کے پاؤں طشت میں اُسی لوٹے سے دھوتا ھے اور یہ دھوون گھر کے چاروں کونوں پر ڈال دیا جاتا ھے اُس کو پاؤں دھلانا - پاؤں دھونا کہتے ھیں -

پاؤں دھودھوکے پینا - پاؤں دھو کے پینا - کمال مطیع ھونا - فرمانبردار ھونا ؟ کمال محبت اور اطاعت ظاھر کرنے کے لیے مستعمل ھے :—

غالب — مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہو -
پیتا ھوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

بحر — پلا دے اپنے ہاتھوں ایک دن اپنا اُلش مجھکو

پھوں دھو دھو کے تیرے پاؤں اے پیر مغاں برسوں

۴۶ - چوتھی - دوسرے دن دلھن کے بھائی جو عمر میں اُس سے چھوٹے ہوتے ہیں چوتھی لیکر آتے ہیں - چوتھی میں مٹھائی اور کھاجوں کے مٹکے ہوتے ہیں - تیسرے پہر کو دولھا اور دلھن کے مکان پر جاتے ہیں - دولھا کی سالیاں نوشہ کی جوتی چھپا دیتی ہیں - اور جب تک اس کا نیگ نہیں لے لیتیں اُس کی جوتی نہیں دیتیں - اُس وقت چوتھی کھیلنے کی رسم ادا کی جاتی ہے - سالیاں دولھا کو پھولوں کی چھڑیاں مارتی ہیں اور وہ بھی پھولوں کی چھڑی ، سبز ترکاری سے مارتا ہے -

۴۷ - چالے - چوتھی کے بعد چار چالے ہوتے ہیں -

پہلا چالا ماں - دوسرا خالہ یا پھوپھی ، تیسرا نانی ، چوتھا دادی کی طرف سے اگر اِن رشتہ داروں نے نہ کیا تو باپ کو یہ چاروں چالے کرنا پڑتے ہیں - چالے اکثر جمعہ یا دوشنبہ کو ہوتے ہیں جس کی طرف سے چالے ہوتے ہیں اس کے یہاں دلھن اور دولھا کے کل عزیز رشتہ دار عورتیں مہمان ہوتی ہیں - اب یہ چالے بیشتر نوشہ کے باپ کی طرف سے ہوتے ہیں -

۴۸ - سفر - اگر دولھا کو سفر کرنا پڑے تو اس کو لازم ہے کہ سسرالی رشتہ داروں کے واسطے نشانی لائے ، نشانی میں مختلف قسم کی چیزیں کم قیمت ہوتی ہیں -

نوشاہ کی سفر سے واپسی پر تیل ، ماش سسرال سے آتا ہے - وہ اُرد کے چار دانے تیل میں ڈال دیتا ہے اور وہ تیل ماش حلال خورے کو دے دیا جاتا ہے ، اس کے بعد دیدار پیر کا کونڈا ہوتا ہے -

پیر دیدار - عورتوں نے ایک فرضی ولی قرار دے رکھا ہے عورتیں جب کسی کے آنے کی آرزو ہوتی ہے تو کونڈا مانتی ہیں -

لذت عشق - کوئي بولي آئے مرا مہ لقا
تو کونڈا کروں پیر دیدار کا

۴۹ - میت کي رسمیں -

نزع کا وقت آتا ہے تو پتلیاں تلے اوپر ہو جاتي ہیں سانس بے قاعدہ
لنے لگتي ہے - نبض کي رفتار بھي بے قاعدہ ہو جاتي ہے - اس کو
محاورات ذیل سے ظاہر کرتے ہیں :—

پتلیاں بدل جانا -
پتلیاں اُلٹ جانا -
پتلیاں پھر جانا -

یعنی نزع کے وقت پتلیوں کا تلے اوپر ہو جانا :—

جلال—جلوہ نقاب اُلٹ کے جو تم نے دکھا دیا
غش آگیا اُلٹ گئیں دو چار پُتلیاں

امیر—پُتلیاں بھي بدل گئیں دم نزع - وقت پر کوئي آشنا نہ ہوا -

جلال—اب تو خدا کے واسطے منہ پھیر کر نہ بیٹھ
آنکھوں میں دم ہے پھر گئیں اے یار پُتلیاں

آنکھوں میں جان اٹکنا - آنکھوں میں جان آ جانا - آنکھوں میں
جان ہونا - آنکھوں میں دم آنا - آنکھوں میں دم اٹکنا - تمام جسم سے
دم نکل کے حسرت دیدار سے آنکھوں میں رک رہنے کي جگہ :—

بحر—اب تو آنکھوں میں جان اٹکي ہے
دیکھ جا آ کے ایک نظر مجھکو

شرف—اے یار کسي طرح یہ رخصت نہیں ہوتي
آنکھوں میں تیرے دیکھنے کو جان اڑی ہے

آتش—اک رشک مسیحا کے تصور میں ہے یہ حال
آنکھوں میں ہے جان اور فنا دم نہیں ہوتا

داغ—دم میري آنکھوں میں اٹکا ھے کہ دیکھوں تو سہی
کیا مسیحا سے مرے درد کا درماں ہوگا

آنکھوں میں جي کھنچ آنا - آنکھوں میں جی آنا - روح کا بدن سے نکل کر آنکھوں تک آجانا - مرنے کے قریب ھونا :—

میر—مرا جي تو آنکھوں میں آیا یہ کہئے
کہ دیدار بھی ایک دن عام ھوگا

اب یہ دونوں محاورے قلیل الاستعمال ھیں -

دم اُکھڑنا - سانس* اُکھڑنا - سانس کا بے قاعدہ چلنا -

داغ—دیکھہ لینے کو ترے سانس لگا رکھا ھے
ورنہ بیمار غم ھجر میں کیا رکھا ھے

دم اُلٹ جانا - نزع کي حالت ھونا -

جرأت—نہ جانا یہ کہ جانے سے کہیں کیونکر جیے گا وہ
کہ جس کا دم اُلٹ جاتا تھا میرے روٹھہ جانے سے

دم درود نہیں - زرا طاقت نہیں - قریب مرگ ھے -

سرور—اب عیادت کو آئے سود نہیں
دم آخر ھے دم درود نہیں

دم دُگدُگی میں ھونا - (دُگدُگي - حلقوم سینہ اور گلے کے بیچ کا گڑھا) نزع کا عالم ھونا :—

انیس—چھیدیں وھیں گلا یہ لعینوں کے جي میں تھا
یاں کٹتھہ بیٹھہ جانے سے دم دُگدُگي میں تھا

دم لب یا لبوں پر آجانا - جاں بلب ھونا :—

راسخ—شکوہ کرتا ھے زبانِ حال سے بیداد کا
کھنچ کے لب پر آگیا دم خنجر جلاد کا

---

* سانس لکھنؤ میں بالاتفاق مؤنث ھے - دھلي والے مذکر بھي بولتے ھیں -

دم نکلنا ۔ جان نکلنا ۔

دمِ واپسیں - آخری سانس جو مرتے وقت نکلتی ہے -

دم دیکھنا ۔ سانس دیکھنا ۔ بیمار کی حالت ردی ہوتی ہے تو اُس کی سانس دیکھتے ہیں کہ مسلسل جاری ہے یا اُکھڑگئی یا نہیں آتی ہے

شرف—منہ ڈھانکتا تھا کوئی کوئی دیکھتا تھا سانس
شب بھر یہ حال سن کے مری داستاں رہا

سانس گننا ۔ سانس کا شمار ہونا ۔ نزع کا وقت ہونا ۔ جب سانسیں گنی جاتی ہیں -

اوج—ہو سانس کا شمار بس اب وقت ہے اخیر
کر شدت عطش سے ہوا جاں بحق صغیر

نبض اُبھرنا ۔ نبض ڈوب کر پھر چلتی ہوئی معلوم ہونا -

نبض ڈوبنا ۔ نبض کی رفتار کا جاتا رہنا :—

رضا—نبضِ مریض ڈوب کے اُبھری نہ شام غم
امید دل نے زور لگایا تو کیا ہوا

نبض نہ ملنا ۔ نبضیں نہ ملنا ۔ نبض کی حرکت محسوس نہ ہونا ۔

نبضیں چھوٹنا ۔ نبضوں میں حرکت بڑھنا :—

محسن رح—طبیب آئیں بالیں پہ تو دم گھٹیں
مری نبض دیکھیں تو نبضیں چھٹیں

جان بحق ہونا - مرجانا ۔

۵۰ ۔ جب دم نکل جاتا ہے اور سکتے کا شبہہ ہوتا ہے تو آئینہ منہ کے سامنے رکھہ کر دیکھتے ہیں اگر آئینہ پر سانس کا اثر معلوم ہوتا ہے تو سکتہ ہی سمجھتے ہیں :—

شعور—کہیں سکتا نہ عاشق کو ہوا ہو - اُسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا

۵۱ - مرد کے جنازے پر سفید چادر ڈالتے ھیں عورت کے جنازے پر گہوارہ باندھہ کر چادر ڈالتے ھیں۔ بیوہ ھو تو سفید اور سہاگن ھو تو رنگین۔

گہوارہ - چارپائی کے دونوں پٹیوں میں کھپچیاں باندھہ کر محراب سی بنادیتے ھیں اور اُس کو گہوارہ کہتے ھیں -

۵۲ - قبر پر مردے کے سرھانے اُس کا شجرہ اور جواب نامہ رکھتے ھیں -

جواب نامہ - سفید کپڑے پر پلدول مٹی سے حکم لکھتے اور اُس کو جواب نامہ کہتے ھیں -

قبریں دو قسم کی ہوتی ھیں :—

(۱) بغلی* - ایک لانبا گڑھا کھود کر اُس کے پہلو میں جانب قبلہ اندر ھی اندر قبر بناتے ھیں -

(۲) صندوقی - میت کے قد کے برابر لانبی اور قد آدم گہری ہوتی ھے -

لحد - جس بغلی گڑھے میں مُردے کو رکھتے ھیں اُس کو لحد کہتے ھیں -

۵۳ - مُردے کو قبر میں رکھنے کے بعد تختے سے بند کر کے مٹی دیتے ھیں -

مٹی† دینا - میت کو قبر میں اُتارنے کے بعد حاضرین کا تھوڑی تھوڑی مٹی لے کر قبر میں ڈالنا :—

ناسخ—کل نہ دے گا کوئی مٹی بھی اُنھیں - آج زر جو کہ دیا کرتے تھے

مٹی ٹھکانے لگانا - مُردے کی تجہیز و تکفین کو حسب قاعدہ سر انجام دینا :—

ریاض—لگا دینا کوئی مٹی ٹھکانے - ریاض اِک آرزو مُردہ پڑی ھے

مٹی عزیز کرنا—کنایہ ھے کسی مردے کے دفن میں شریک ہونے اور اپنے ہاتھہ سے دفن کرنے سے :—

---

* بغلی بسکون دوم و بفتح دوم دونوں طرح صحیح ھے -

بحر—وہ رنج پائے کہ مر مر کے زندگانی کی - بغل میں دل بغلی گور کا عذاب رہا -

† یہ لفظ بالکسر اور بالفتح دونوں طرح مستعمل ھے لیکن بالکسر فصیح ھے -

آتش۔۔۔قبول خاطرِ مردم ہو توتیا کیطرح
عزیز تیري کریں شیخ و برهمن متّي -

۵۴ - قُل کے ڈھیلے - دفن کرنے کے بعد ڈھیلوں پر قل ھو اللہ پڑھہ کر پھونکتے اور اُن ڈھیلوں سے قبر پاٹتے ھیں -

شعور۔-گنج زر جس نے لٹایا نام روشن ہوگیا
قبر میں ہر قل کا ڈھیلا سانپ کا من ہو گیا

۵۵ - ماتمدار عورتیں - جب کوئي پرسا دیتا ھے تو میت کے صفات بیان کر کے روتي ھیں اُس کو بیان کرنا اور بین کرنا کہتے ھیں -

پِلّو لینا - (عو) منہ ڈھانک کر میت پر رونا - ماتم کرنا -

پُرسا دینا - ماتم پرسي کرنا -

داغ۔۔۔دل غمگیں کا اس بیکسي میں
دیا پُرسا کراماً کاتبیں نے

پُرسا لینا - میت کے وارثوں کا صبر اور دلاسے کی باتیں لوگوں سے سننا -

منہہ ڈھانکنا - منہ ڈھانپنا - منہ پر کپڑا ڈال کر رونا - بین کرنا :۔۔

شاد۔۔۔منہ بھي ڈھانپا میت عاشق پہ جو
دیکھہ کر آنکھیں کُھلیں شرما گیا

دھلی میں منہ ڈھانکنا اور لکھنئو میں دونوں محاورے مستعمل ھیں :۔۔

شاد۔۔۔نہ نکلا جب کوئی گریاں مَرے پر مجھہ پُر ارماں کا
ہزاروں آرزوؤں نے مري میت پہ منہ ڈھانکا

۵۶ - میت کے گھر والے تین روز تک چولھا گرم نہیں کرتے - اُن کے واسطے رشتہ داروں کے یہاں سے کھانا آتا ھے -

حاضري - (ا) وہ کھانا جو مردے کے وارثوں کو بعد دفن میت بھیجتے ھیں :۔

بھجواؤ گھر میں بحر کے اے جان حاضري
بھوکا تمہارے دید کا کچھہ کھا کے مر گیا

اس کو کروي کھچڑي اور کروی روٹي بھي کھتے ھیں -

(۲) - وہ نقد رقم جو قریبي رشتہ دار میت کے وارثوں کو دیتے ھیں -

۵۷ - سوم - پھول - تیجا - دفن کے تیسرے روز رسم فاتحہ ادا ھوتي ھے اعزا اور احباب جمع ھو کر قران شریف پڑھتے اور چنوں پر کلمہ پڑھتے ھیں چنے دس بارہ سیر ھوتے ھیں - جب چنے اور قرآن شریف ختم ھو جاتا ھے تو چنے ایک چادر میں اکٹھا کر کے اُس میں الائچي دانے ملا دیتے ھیں ' جب فاتحہ شروع ھوتا ھے ' ارگجا چنوں کے پاس رکھدیتے اور لوبان یا اگر کي بتي جلادیتے ھیں -

ارگجا—(ھ - بمعني خوشبو ھے) اردو میں ایک مرکب خوشبو کا نام ھے - برادۂ صندل - کافور کو عرق گلاب میں ملا کر ایک پیالے میں رکھتے ھیں اور اس پیالے کو پھولوں کي بھري ھوئي رکابي میں رکھہ کر ھر فاتحہ خوان کے سامنے لے جاتے ھیں - وہ ایک پھول پر سورۂ اخلاص یعني قل ھواللہ پڑہکر اُس پیالے میں ڈال دیتا ھے - یہ پیالہ مردے کي قبر پر بھیج دیا جاتا ھے -

پھول - ھندوؤں میں مردوں کي ھڈیاں جل جانے کے بعد چن کر گنگا جي میں بھانے کے واسطے بھیجتے ھیں - مسلمانوں میں سوم ' تیجا کے معني میں مستعمل ھے - اور اس کا فعل جمع میں آتا ھے :—

میر—جب سے عاشق کے ھوئے پھول پھلنا کیسا

کپڑے وسواس سے پھولوں میں بسائے بھي نھیں

سوم - (ف - بکسر اول و ضم ھمزہ بشکل واو - مرکب ھے سہ - م سے یہ میم الفاظ عدد میں نسبت کے واسطے آتا ھے) - تیجا :—

امیر—عاشق کا سوگ چاھیے زینت نہ کیجئے

چھلم تو کیا سوم بھي ابھي تو ھوا نھیں

اردو میں زبانوں پر سُیم ھے :—

مہر—بلبلوں کا سُہم نہیں اے گل

کیوں ترے ملہہ سے پھول جھڑتے ہیں

۵۸ - سوگ - یہ لفظ فارسي اور هندي میں مشترک هے رشتہ دار

ں ماتم میں چالیس روز تک پان کھانا ؟ مسي ملنا ؟ ملهدي

- رنگین لباس اور چوڑیاں پہننا ترک کردیتي هیں -

عمر بھر کے لیے سب زینت کي چیزیں ترک کر دیتي هے اس کو

ے کرنا - سوگ منانا - سوگ رکھنا - سوگ میں بیٹھنا

، هیں - سوگ اُتارنا - سوگ بڑھانا - ماتم کرنا - موقوف کرنا

شرف—شہید ناز کا اپنے وہ شاید سوگ اُتاریںگے

طلب هے آئینہ سرمہ بھي رکھا هے حنا بھي هے

سوگن—غمزدہ عورت جو کسي کا سوگ کرتی هے -

رنڈاپا—وہ زمانہ جو عورت پر بیوہ هونے کے بعد گزرے -

رنڈ سالہ—وہ لباس جو عورت کو بیوہ هونے پر شوهر کے ماتم میں

اتے هیں جب کوئي عورت بیوہ هوجاتي هے تمام کنبے کي عورتیں جمع

کر سفید جوڑا پہناتي اور چوڑیاں وغیرہ جو سہاگ کي چیزیں هیں

ڈالتي هیں -

۵۹ - سوم کے بعد دسویں روز فاتحہ هوتا هے اس کو دسویں کا فاتحہ

جو بیسویں روز هوتا هے اس کو بیسواں اور جو چالیسویں روز هوتا هے

ے کو چالیسواں کہتے هیں -

۶۰ - چہلم—عوام کي زبانوں پر چِہلُم هے - صحیح چِہلُم هے -

ذوق—عبث جاں منتظر هونٹوں پہ هے وہ شوخ کب آیا

اگر چہلم کو بھي آیا تو هم سمجھیںگے اب آیا

۶۱ - سہ ماهي - چھہ ماهي - برسي - اُن فاتحوں کو کہتے هیں جو

سرے مہینے - چوتھے مہینے - چھٹے مہینے اور سال بھر بعد هوں -

۹۱ ـ تبارک—جب که مہینے میں جمعہ یا جمعرات کو مُردے کی بخشش کے واسطے چالیس مرتبہ سورۂ تبارک الذی (اُنتیسویں پارے کی سورۃ کا نام) پڑھی جاتی ہے اور میدے کی میٹھی ٹکوری روٹیاں جن پر سونف، کلونجی جمی ہوتی ہے بطور خیرات تقسیم کرتے ہیں اُن کو تبارک کی روٹیاں اور تبارک کہتے ہیں -

۹۲ ـ دپسا—مرنے کے دو برس بعد خاص وفات کی تاریخ یہ فاتحہ ہوتا ہے -

---

گارساں دتاسی

(از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم - اے - پی - ایچ - ڈی)

گارساں دتاسی اردو ادب کا ایک قابل وقعت محسن ہے - اس کے احسان نہ صرف اس لیے یاد رہیں گے کہ اس نے ہندستان سے دور ایک غیر ملک میں بیٹھ کر ہماری زبان اور ادب کی عمر بھر خدمت کی بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے زمانے میں خود ہمارے ادیب اپنے علمی اور ادبی خزانوں کی صحیح قدر و قیمت سے ناواقف تھے ؛ وہ پہلا شخص ہے جس نے اُردو ادب پر تحقیقات شروع کی - اس کے مصنفوں اور تصنیفوں پر نا قدرانہ نظر ڈالی اور فرانسیسی زبان میں ہندستانی ادب کی ایک مبسوط تاریخ لکھ کر تین جلدوں میں شایع کی -

یہ گارساں دتاسی ہی تھا جو اُردو کے مایۂ ناز قدیم شاعر ولیؔ کے کمال سے سب سے پہلے واقف ہوا اور اس کے کلام کے متعدد نسخوں کے مقابلے کے بعد ایک قابل یادگار دیوان شایع کرایا - نہ صرف یہی بلکہ بہت کم اُردو داں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس فرانسیسی محقق نے ہماری زبان اور ادب کے متعلق (۳۰) سے زیادہ کتابیں اور رسالے لکھے اور شایع کیے - اُردو ادبیات کی تمام تاریخ چھان ڈالیے بہت کم ادیب آپ کو ایسے ملینگے جنھوں نے اپنی زبان اور ادب میں اس قدر کام کیا ہو -

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک اُردو کے بعض رسالوں میں اس فرانسیسی محقق کی ایک دو کتابوں کا کچھ سرسری ذکر کیا گیا ہے - حیدرآباد دکن کے ایک رسالہ "نجمہ" میں چند سال قبل دتاسی کی معلومات کی بعض غلطیوں پر روشنی ڈالی گئی تھی اور انجمن ترقی اُردو کے رسالے میں اس کے چند خطبوں کے اُردو ترجمے بھی

شایع ہوئے ہیں لیکن اس کی زندگی اور اردو سے متعلقہ کارناموں کی نسبت اب تک کسی قسم کی معلومات اردو تو اردو کسی اور زبان میں بھی نہیں شایع ہوئی -

اردو کی لسانی ساخت پر عملی تحقیقات کرنے کے سلسے میں ۱۹۲۹ع میں جب میں نے دوبارہ یورپ کا سفر کیا تو فرانس میں ایک سال سے زیادہ قیام کرنے کا موقع ملا - وہاں کے متفرق کتب خانوں کے اردو مخطوطوں کا میں اپنے پہلے ہی سفر میں مطالعہ کرچکا تھا اور اسی ضمن میں گارساں دتاسی کی ہندستانی زبان کے متعلق اس قدر فرانسیسی کتابیں نظر سے گزری تھیں کہ ان پر کچھہ لکھنے کو بے اختیار جی چاہتا تھا - چنانچہ اس دوسرے سفر میں چھٹیوں وغیرہ میں جس قدر موقع مل سکا فایدہ اتھانے کی کوشش کی گئی اور آخر کار اس قابل عظمت محقق کی نسبت جو کچھہ معلومات حاصل ہو سکیں ان کا ایک مختصر سا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :—

علمی نشو و نما

دتاسی فرانس کا مشہور بندرگاہ مارسیل میں سنہ ۱۷۹۴ع میں پیدا ہوا - علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد جب مشرقی زبانوں کا شوق ابھرا تو تیئس سال کی عمر میں وہ سنہ ۱۸۱۷ع میں پیرس پہونچا جہاں موسیو سلوستر دی ساسی (M. Silvestre de Sacy) السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا - دساسی نے اس نوجوان کا پدرانہ شفقت کے ساتھہ خیر مقدم کیا اور اس قدر خلوص اور توجہ کے ساتھہ تعلیم دی کہ گارساں دتاسی نے بہت جلد عربی اور ترکی زبانوں پر دسترس حاصل کرلی - ان زبانوں سے اس نے فرانسیسی میں جو اعلیٰ درجے کے ترجمے کیے ہیں وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ دساسی اپنے شاگرد

کو کامیاب بنانے میں کس خلوص کے ساتھہ مصروف تھا ۔ اور یہي وجہ تھي کہ گارساں دتاسي کے دل میں اپنے اُستاد کي شفقت اور خلوص کی یاد آخر عمر تک تازہ رھي ۔

عربی اور ترکي زبانوں کي تحصیل هي کے دوران میں دتاسي کو فارسي کا شوق پیدا هو گیا ۔ اور فارسي ادب نے اس کو اِس قدر لُبھایا کہ اس زمانے میں اس نے دو تین فارسي کارناموں کا بھي فرانسیسي زبان میں ترجمہ کیا ۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر " منطق الطیر " کا ترجمہ ھے ۔ اس ترجمے کے ساتھہ دتاسي نے اس کتاب پر ایک مقدمہ بھي شایع کیا جس میں اس نے " ایرانیوں کی فلسفیانہ اور مذھبي شاعري " پر بحث کی ھے ۔

غالباً فارسی کتابوں هی کے مطالعہ سے دتاسي کو تصوف کا شوق پیدا ھوا اور یہ وہ شوق ھے جو ایک دفعہ پیدا ھوجانے کے بعد بہت کم دور ھوتا ھے ۔ چنانچہ دتاسي بھي اس میں اس قدر محو ھوگیا کہ تمام عمر صوفیاء کے عقائد اور انھی سے متعلقہ مسائل کا مطالعہ کرتا رھا ۔ اور شاید اس کا یہي شوق تصوّف تھا جس نے اس کو ھندستاني مصنفین کي طرف متوجہ کیا اور جس کي وجہ سے اس نے نہ صرف ھندستانی سیکھہ لي بلکہ اس پر قابل وقعت کام کیے ۔

اُردوے شغف اور دیوان ولي

راقم نے دتاسي اور اس کے کارناموں کي نسبت جو معلومات بہم پہونچائی ھیں ان کے مطابق میر تقي میر کی مثنوی اژدر نامہ ان چند اردو کتابوں میں سے ھے جو ابتدا میں دتاسي کو پسند آئیں ۔ اور جن کا فرانسیسی زبان میں اس نے ترجمہ کیا ۔ میر کي اس مثنوي کا فرانسیسی

ترجمہ ۱۸۲۶ع میں "Conciles aux mauvaise poets" Paris (Doudey-Dupre) کے نام سے شایع ہوا -

جب دتاسی کے استاد سلوسٹر دساسی نے دیکھا کہ اسکا قابل فخر شاگرد هندستانی ادبیات کا ماہر ہو کر اس میں اس قدر دلچسپی لے رہا ہے تو اس نے حکومت سے درخواست کی کہ مدرسۃ السنۂ مشرقیہ میں هندستانی زبان و ادب کے لیے بھی ایک پروفیسری کی جگہ قایم کی جاے چنانچہ موسیو دمارتگ ناک (M. de Martignac) کے مختصر سے عہد وزارت میں مشہور مستشرق کی یہ سفارش منظور کرلی گئی اور دتاسی سنہ ۱۸۲۸ع میں هندستانی کا پروفیسر ہو گیا -

اس خدمت کو حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے دتاسی نے اپنے شاگردوں کی شہرت کے لیے هندستانی زبان کا ایک قاعدہ مرتب کیا جو سنہ ۱۸۲۹ع میں Rudiment de la langue Hindoustanie کے نام سے شایع ہوا - تین چار سال بعد دتاسی نے اس قاعدے کا ایک ضمیمہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ یہ ضمیمہ بھی ۱۸۳۳ع میں شایع ہوگیا -

طالبعلموں کی ضرورتوں کو پورا کرتے رہنے کے ساتھہ ساتھہ دتاسی اپنے ذوق کے مطابق اُردو شہ کاروں کے مطالعہ میں بھی مصروف تھا - چنانچہ اِنہیں دو تین برسوں میں وہ کلیات ولی پر کام کرتا رہا - اس شاعر کا نام اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے هندستان سے اس کے متعدد قلمی نسخے منگائے - اُن کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا اور عرصۂ دراز کی محنت کے بعد ایک قابل قدر دیوان مرتب کیا جو سنہ ۱۸۳۴ع میں پیرس کے شاہی کتب خانے سے شایع ہوا -

اس کام میں دتاسی نے جس توجہ اور دلچسپی کو ملحوظ رکھا اس کا اندازہ دیوان ولی کے ان مخطوطوں کی طویل فہرست کے مطالعے سے

هو سکتا ہے جو دتاسی نے جگہ جگہ سے ملا کر جمع کیے تھے اور جن کا تذکرہ آیندہ صفحات میں دکّنی مخطوطوں کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے ۔

دتاسی کا کلیات ولی کئی حیثیتوں سے قابل قدر ہے اس کے ذریعہ سے دتاسی نے نہ صرف ایک حقیقی شاعر کو صحیح عظمت اور مقبولیت سے روشناس کیا بلکہ اُردو دنیا کے لیے قدیم شاعروں کے کلام کو سلیقہ سے ترتیب دینے کا ایک لایق تقلید نمونہ بھی پیش کیا لیکن اس نمونے کے بارجود بھی اُردو کے بہت کم شاعروں کے کلام اس اِحتیاط اور توجہ کے ساتھہ شایع کیے گئے ہیں ۔

جہاں دتاسی ولی جیسے عظیم‌الشان شاعر کے کلام میں محو تھا ایک اور اُردو کتاب بھی اس کے زیر مطالعہ تھی ۔ یہ تحسین‌الدین کی مثنوی "کامروپ" ہے ۔ اس کتاب کی طرف دتاسی کی توجہ غالباً اسی سے مُنعطف ہوئی کہ وہ ایک طویل مسلسل نظم تھی اور یہ وہ چیز ہے جس کی ولی کے یہاں کمی تھی ۔ چنانچہ دتاسی نے کامروپ کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ بھی سنہ ۱۸۳۴ع میں شایع ہوا ۔

اس کام کی خوبی اور مقبولیت کا اس واقع سے اندازہ ہوگا کہ اس ترجمے کی اشاعت کے بعد ایک سال کے اندر دتاسی اصل اُردو کامروپ کو شایع کرنے پر مجبور ہوگیا ۔ اس کے بھی اس فرانسیسی محقق نے کئی قلمی نسخے جمع کئے تھے ۔ یہ کتاب پیرس کے شاہی کتب خانے سے سنہ ۱۸۳۵ع میں چھپ کر نکلی ۔ اس سال دتاسی نے اُردو کی ایک اور مسلسل کتاب گُل بکاؤلی کا فرانسیسی زبان میں خلاصہ شایع کیا ۔

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی

ان ابتدائی کاموں کے بعد دتاسی کو اُردو ادب کا خاصا ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ اس اثنا میں اس نے ہندستانی مصنفین کی بہت سی کتابیں اور تقریباً جملہ تذکرے اپنے کتب خانے میں جمع کر لیے تھے - جو انگریز یا فرانسیسی ہندستان آتے تھے دتاسی ان سے مراسلت کر کے اُردو مخطوطے اور مصنفین کے حالات طلب کیا کرتا چنانچہ اس مضمون کے آخری حصے کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اس سلسلے میں اس زمانے کے تمام مستشرقین سے اس کی شناسائی ہوگئی تھی - نیز ہندستانی ادبیات کی ضمن میں تیس چالیس یورپین افراد سے اس کو تعلق رہا ہے -

خوش قسمتی سے دتاسی کی کاوشیں اکثر دفعہ کارگر ہوئیں - اس کا گھر ہندستان کے شاہی اور دوسرے عالیشان کتب خانوں کے بعض اچھے اچھے مخطوطوں یا ان کی نقلوں سے مالا مال ہوگیا - مطبوعہ کتابیں اس کے ہاں بطور تحفہ آنے لگیں اور بعض دفعہ اس کے لیے اس کے دوستوں نے خود مصنفین سے ان کے حالات دریافت کرکے روانہ کیے -

ان تمام سہولتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دتاسی چار پانچ سال کی محنت کے بعد ہندستانی ادب کی ایک تاریخ مرتب کرنے میں کامیاب ہوگیا جو سنہ ۱۸۳۹ع میں ''تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی'' کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں پیرس کے شاہی کتب خانے سے شایع ہوئی - یہ تاریخ نہ صرف یوروپی زبانوں میں اس موضوع پر اپنی قسم کی پہلی چیز تھی بلکہ خود اُردو میں بھی اس طرح کا کوئی کام اس وقت تک نہیں کیا گیا تھا - یہ واقعی ایک حیرت کی بات ہے کہ ایک غیر شخص ہماری زبان و ادب کی تاریخ لکھ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - دتاسی کا یہ کارنامہ دیوان ولی کی اشاعت سے بھی زیادہ اہم ہے -

گو اس میں بعض جگہ غلطیاں دکھائی دیتی ھیں لیکن اس زمانے کی معلومات کے لحاظ سے ان غلطیوں کا پایا جانا ایک فطری بات تھی - جس قدر مواد اُردو تذکروں ، مخطوطوں کی اندرونی شہادتوں اور ادیب مستشرقین کے بیانات سے حاصل ہو سکا اس کو دتاسی نے خاص سلیقے اور خوبی سے ایک کارآمد کتاب کی شکل میں پیش کردیا ھے - ھمارے تذکرہ نویسوں کے مبالغہ آمیز بیانات اور مُبہم اسالیب بیان اکثر دفعہ خود ھماری زبان کے اھل تحقیق ھی کو پریشان کردیتے ھیں گارساں دتاسی تو ایک بالکل غیر ملک اور غیر طرز تمدن کا پروردہ تھا - اس کو ان کتابوں سے اصل مطلب اور کام کی باتیں حاصل کرنے میں جو دقت حاصل ھوئی ھوگی اس کا اندازہ ھم اُردو داں بہت کم کر سکتے ھیں -

دتاسی کی کتاب کی سب سے زیادہ مفید خصوصیت یہ ھے کہ وہ ایک سائنٹیفک تاریخ ادبیات اُردو ھے - ھمارے تذکرہ نویس ، شاعروں کے اصل حالات زندگی اور خصوصاً ان کی تاریخ پیدایش و وفات یا کتابوں کے سنہ تصنیف کے اظہار میں ھمیشہ غافل رھے ھیں - دتاسی کو بھی اس کی بڑی سخت شکایت ھے - اس نے ضروری حالات اور معتبر تواریخ معلوم کرنے کی حتی‌الامکان کوشش کی ھے اور ان تاریخوں وغیرہ کے لحاظ سے تو دتاسی کا یہ کام بے حد قابل قدر ھے -

یہ کارنامہ ابھی اختتام تک نہیں پہنچا تھا کہ اِسکی اھمیت کا دتاسی کے ھم وطن ھم عصروں نے اندازہ لگا لیا - فرانسیسی علما اس کی مشکلات اور کام کی خوبی سے اس قدر متاثر ھوے کہ "تاریخ ادبیات ھندوی و ھندستانی" کی اشاعت سے ایک سال قبل ھی یعنی سنہ ۱۸۳۸ع میں گارساں دتاسی کو فرنچ آکیڈیمی کا رکن بنا لیا - یہ وہ عزت ھے جو فرانس میں بہت کم ادیبوں اور محققوں کو اس عمر میں حاصل ھوتی ھے -

دتاسی کی تاریخ ادب صرف فرانس ھی میں نہیں بلکہ انگریز مستشرقین

میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی چنانچہ اس کی اشاعت کے بعد ہی انہوں نے ہندستانیوں میں اس کے ترجمے کا خیال پیدا کیا اور آخر دہلی کالج کے پروفسر مولوی کریم‌الدین نے اپنی کتاب طبقات الشعراء اسی فرانسیسی تاریخ کے ایک آزاد ترجمے کے طور پر شایع کی -

اس سلسلے میں مولوی کریم‌الدین اور دتاسی کے درمیان مراسلت بھی جاری ہو گئی چنانچہ دتاسی کے مخطوطوں میں سے ایک دو ایسے بھی ہمارے نظر سے گزرے ہیں جن کو مولوی کریم‌الدین نے اس محقق کے یہاں بطور تحفہ روانہ کیا تھا -

ہندی کا شوق اور افتتاحیہ خطبے

تاریخ کی اشاعت کے بعد دتاسی کچھہ عرصہ تک درس و تدریس ہی میں مشغول رہا اور اس بات کی کوشش کی کہ ہندستانی کی دوسری شاخ ہندی پر اور زیادہ مہارت حاصل کرلے - اس نے اپنی تاریخ میں ہندی مصنفین کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ اس طرف اور بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے -

ساتھہ ہی گارساں دتاسی نے اردو کام کو بھی ہاتھہ سے نہیں چھوڑا چنانچہ سنہ ١٨٤٥ع میں میاں مسکین کے ایک مرثیے کا فرانسیسی ترجمہ شایع کیا اور اسی زمانہ میں گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کے اس فرمان کا بھی ترجمہ چھپوایا جو مندر سومنات کے دروازوں سے متعلق شایع کیا گیا تھا -

پیرس کے مدرسۃ السنۂ مشرقیہ میں ہندستانی کے ساتھہ ساتھہ دتاسی ہندی بھی پڑھایا کرتا تھا لیکن فرانسیسی زبان میں اس کا کوئی قاعدہ نہیں تھا - چنانچہ یہ کام بھی دتاسی ہی کو کرنا پڑا - اور ہندستانی قواعد کی اشاعت کے اٹھارہ سال بعد سنہ ١٨٤٧ع میں اس

نے "قاعدۂ زبان ہندوی" کے نام سے ایک کتاب شایع کی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل نئی اور کار آمد چیز تھی -

ان تمام کاموں کے بعد دتاسی کی شہرت ہندستان میں پھیل چکی تھی اور نہ صرف انگریز بلکہ ہندو اور مسلمان ادیب بھی اس کے یہاں اپنے کام تنقید و تبصرہ کے لیے روانہ کرنے لگے - اس طرح دتاسی کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہوگئی - اور بغیر زیادہ کد و کاوش کے اس کے گھر ہندستانی ادبیات کا ذخیرہ جمع ہونے لگا -

جب دتاسی نے دیکھا کہ ہندستان سے مستقل طور پر معلومات حاصل کرنے کے ذریعے پیدا ہوگئے ہیں - تو اس نے ہر تعلیمی سال کے آغاز پر اپنے معمولی درسوں سے پہلے ایک خطبۂ افتتاحیہ پڑھنا شروع کیا اس خطبے میں وہ سال گذشتہ کی جملہ ہندستانی ادبی اور علمی تحریکوں پر نظر باز گشت ڈالتا تھا - اس قسم کا پہلا خطبہ غالباً سنہ ۱۸۵۰ع میں شایع ہوا -

دتاسی کے یہ خطبے تاریخی حیثیت سے بے حد قیمتی ہیں - ان سے ہندستانی زبان و ادب کی سالانہ ترقی سن وار محفوظ ہوگئی ہے اور محققین کے لئے ایک نہایت مفید مواد حاصل ہوگیا ہے - خوش قسمتی سے ان میں سے بعض مطبوعہ خطبوں کے اردو ترجمے انجمن ترقی اردو کے رسالے میں شایع ہوچکے ہیں - جن کے مطالعہ سے وہ لوگ جو فرانسیسی نہیں جانتے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں -

ان خطبوں نے دتاسی کے زمانے میں ہندستانی ادبیات کی حمایت و اشاعت کا بھی بہت کچھ کام کیا ہے - چنانچہ دتاسی کی وفات کے بعد فرانسیسی اکیڈیمی کے صدر نے مجلس میں سرکاری طور پر جب اس کے اوصاف بیان کیے تو دوران تقریر میں ان خطبوں

کا بھی ذکر کیا ھے ۔ اس کے الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ھے :—

"مدرسۂ السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے دتاسی ھر سال اپنے لکچروں کو ایک خطبے سے شروع کرتے تھے جس میں وہ گذشتہ سال کی ادبی تحریکات ھند پر نظر ثانی کرتے ۔ یہ تبصرہ اس قدر مستحکم اور ثقہ ھوتا تھا کہ اس کو نہ صرف اھل فرانس ھی پڑھتے بلکہ انگلستان، روس اور ھر اس جگہ کے لوگ جہاں مشرق سے دلچسپی لی جاتی، اس تبصرہ کا غور و خوض سے مطالعہ کرتے تھے خود ھندستان میں ھمارے رفیق کار کی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا" ۔

اس اثناء میں دتاسی کی نظر سے ایک اردو ڈرامہ گذرا، اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ اردو ادب میں اس صنف کی قابل افسوس کمی ھے اس لئے اس ڈرامے کو اس نے غور سے پڑھا، اور نہ صرف یہی بلکہ اس کا فرانسیسی میں ترجمہ بھی کیا جو سنہ ۱۸۵۰ع میں شایع ھوا ۔

اوپر یہ ذکر آچکا ھے کہ اس زمانے میں دتاسی ھندی کی طرف بھی متوجہ تھا ۔ اس سلسلے میں یہاں یہ امر قابل اظہار ھے کہ سنہ ۱۸۵۲ع میں اس نے "شکنتلا ناٹک" کا ایک فرانسیسی ترجمہ شایع کیا ۔

دو سال بعد سنہ ۱۸۵۴ع میں دتاسی نے ایک اور دلچسپ کام ختم کیا یعنی "ھندستان کی عورت شعرا" پر اس نے ایک کتاب شایع کی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے واقعی نئی چیز تھی ۔

دوسرے ھی سال یعنی سنہ ۱۸۵۵ع میں دتاسی کی ایک اور قابل قدر کتاب شایع ھوئی ۔ جس کا نام "ھندستانی مصنفین اور ان کے کار نامے" ھے ۔ یہ کتاب گو ضخیم نہیں ۔ لیکن تاریخ ادبیات اُردو لکھنے والے کے لیے نہایت

مشہد ہے - اور حوالہ جات کی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے -

اس کے بعد کے دو برسوں میں اگرچہ اس فرانسیسی محقق کی کوئی خاص کتاب شایع نہیں ہوئی لیکن یہ ملحوظ رہے کہ وہ ہرسال جو خطبۂ افتتاحیہ پڑھا کرتا تھا وہ ساتھ ہی ایک رسالہ کی شکل میں شایع ہو جاتا تھا ۔ اس موقعے پر اس امر کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ غدر سنہ ۱۸۵۷ع کے بعد اس نے جو خطبہ لکھا وہ اس زمانے کے قیامت خیز واقعات کا ایک ہم عصر تبصرہ ہونے کی وجہ سے نہایت قیمتی ہے -

اس عرصے میں دتاسی نہال چند لاہوری کی کتاب "تاج الملوک و بکاؤلی" پر بھی کام کرتا رہا تھا چنانچہ اس کا ترجمہ سنہ ۱۸۵۸ع میں شایع ہوا -

سنہ ۱۸۶۰ع سے سنہ ۱۸۷۵ع تک

اب دتاسی بہت بوڑھا ہو چلا تھا مگر اس کی علمی دلچسپیاں اور کام کاج برابر جاری تھے - اس کی عمر پچھتّر سے زیادہ تھی جب اس نے سر سید احمد خاں کی مشہور کتاب "آثارالصنادید" کا فرانسیسی ترجمہ کرنا شروع کیا - اس کتاب کی موجودہ ادبی اور تاریخی اہمیت سے اہل نظر نا واقف نہیں ہیں - لیکن ستّر برس پہلے ایک اجنبی پروفیسر کا اپنے بڑھاپے میں اس کے ترجمے کا ارادہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اس کتاب نے اس کو کس قدر متاثر کیا تھا اور یہ بھی کہ دتاسی کا ذوق علم کس قدر اعلیٰ تھا کہ اس کتاب کو ترجمے کے لیے فوراً انتخاب کرلیا - یہ ترجمہ سنہ ۱۸۶۱ع میں پیرس کے شہنشاہی مطبع سے چھپ کر نکلا -

دوسال بعد سنہ ۱۸۶۳ع میں دتاسی نے اپنے قدیم "قاعدہ زبان ہندستانی" پر نظر ثانی کر کے اس کی دوسری طبع شایع کی - یہ کتاب پہلی دفعہ سنہ ۱۸۲۳ع میں شایع ہوئی تھی - اور تیس سال کا درمیانی عرصہ درس و تدریس کے عملی تجربوں کے لحاظ سے کافی سبق آموز تھا ؟ بعد کے چند مہینے اُردو "اخوان الصفا" کے اقتباسات کے ترجمے میں گزرے - اور یہ ترجمہ سنہ ۱۸۶۴ع میں شایع ہوا -

اس کے بعد پانچ چھہ برس تک دتاسی نے کوئی نیا کام نہیں کیا البتہ سالانہ افتتاحیہ خطبے تیار کرتا رہا جو ہر سال وسعت معلومات اور پختگی نقطۂ نظر کی وجہ سے زیادہ پر لطف اور مفید ہوتے جاتے رہے -

اس عرصے میں "تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی" کو چھپے ہوئے تیس سال سے زیادہ گذر چکے تھے - اور درمیانی زمانے میں گارسان دتاسی کی معلومات طوفانی رفتار کے ساتھہ ترقی کرچکی تھیں اس لحاظ سے ضروری تھا کہ وہ اس پر نظر ثانی کرتا - چنانچہ خوش قسمتی سے پچھتّر برس کی عمر میں وہ یہ کام بھی کرسکا - اور اس کی تاریخ کی دوسری طبع ؟ اس دفعہ تین جلدوں میں ؟ سنہ ۱۸۷۰ع میں شایع ہوئی -

اس طبع کے وقت وہ پروفیسر اور محقق کی حیثیت سے بے حد مشہور ہوچکا تھا - دنیا کے ہر مہذب ملک میں اس کے قدردان پیدا ہو گئے تھے - بادشاہوں کے درباروں سے اس کو بڑے بڑے خطابات عطا کئے گئے تھے - اس کی جماعتوں میں طالب علموں کی کثرت رہی اور اکثر نوجوان مستشرق اس کے اسّی سال کے تجربوں اور معلومات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اس کی اس مقبولیت کا اندازہ اس مضمون کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے جو فرانس کے ایک مشہور رسالہ "صحیفۂ علماء" (Journal des Savants) کے مئی سنہ ۱۸۷۵ع

نے نمبر میں شایع ہوا تھا ۔ اس مضمون نگار کا نام ؟ بار تھیلمی سان ھلیر ؟ ۔ (B. Saint-Hilaire) تھا وہ اپنے مضمون کو جن الفاظ میں ختم کرتا ھے اُن کا اُردو ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ھے تا کہ دتاسی کی نسبت اس کے ایک ھم عصر کی رائے معلوم ھو سکے :-

"آج پچاس برس کا عرصہ گذر گیا کہ دتاسي اس کام (یعنے پروفیسري) کو نہایت خوبی اور کمال سے انجام دے رہے ھیں اور اُن کے شاگردوں کي تعداد خاصي ہوگئي ھے" ۔

آخری زمانہ

دتاسي کي زندگي کے آخري سال کچھہ کم مشغولیت میں نہیں گذرے ۔ وفات سے ایک دو سال پہلے یعنے سنہ ۱۸۷۶ع میں اس نے ایک اور اھم کام ختم کیا اس کي عمر بیاسي سال کي تھی جب اس کا یہ کارنامہ شایع ہوا ۔ یہ کتاب ھندستاني ؟ عربي ؟ فارسی ؟ اور ترکي مقبول عام نظموں ؟ مقولوں ؟ اور تلمیحوں کے فرانسیسی ترجموں کا مجموعہ تھي ۔ اس کی خوبي اور اھمیت کا اندازہ اس امر کے اظہار سے ھو سکتا ھے کہ یہ ایک ایسے مستشرق کي مسلسل محنت اور حصول معلومات کا نتیجہ ھے جس نے اپنی زندگي کا کل بہترین زمانہ یعنے ساتھہ ستر سال اسلامی زبانوں ؟ تہذیب اور ادبیات کے مطالعہ اور درس و تدریس میں گذار دیا ۔

اس دلچسپ کتاب کي ترتیب کے ساتھہ ساتھہ دتاسي ایک اور اھم علمی خدمت میں مشغول تھا ۔ چونکہ وہ خود بوڑھا ھو گیا تھا ۔ اس لیے اپنے شاگرد رشید ڈیلا نکل (F. Delancle) سے اس نے ایک "ھندستاني فرانسیسي اور فرانسیسي ھندستاني لغت" تیار کرنے کي فرمایش کی ۔ اور خود اس کام کی شروع سے آخر تک نگرانی کرتا رھا ۔ یہ اعلی درجے کا کارنامہ بھي سنہ ۱۸۷۶ع میں شایع ھوا ۔

ان دو اهم کتابوں کي اشاعت کے کچھہ عرصہ بعد هي دتاسي نے مهر امن کی "باغ و بہار" کا فرانسیسی ترجمہ شروع کیا جو سنہ ۱۸۷۸ع میں اُس کي وفات سے چلد مهيلے پہلے چھپ کر نکلا - لیکن یہ کتاب دتاسي کا آخری کار نامہ نہیں تھی - اس کی آخري کوشش "مسلمانوں کے نام اور خطاب" کے نام سے شایع هوئي اس کتاب کا موضوع بھی ظاهر کرتا هے کہ یہ فرانسیسي محقق اپني آخري عمر میں اسلام اور مسلمان پر کام کرنے میں مشغول تھا - اور اسلامی تصوف کا وہ ذوق جس نے پچیس تیس برس کی عمر میں اس کو اسلامي زبانوں کی تحصیل کی طرف متوجہ کیا تھا ؛ چوراسي برس کی عمر میں یعني سنہ ۱۸۷۸ع تک اس سے کام کراتا رها -

دتاسي ایک اَن تھک محنت کرنے والا انسان تھا - اس کي ساري عمر پُر خلوص علمي خدمت میں گذري - فرانسیسي زبان میں هندستاني کے متعلق اس نے جو معلومات منتقل کي هیں اتني معلومات همارے زبان کي نسبت خود انگریزی میں بھي اب تک موجود نہیں - حالانکہ اس وقت تک کئی انگریز علماء اس موضوع پر کام کرتے رهے هیں اور انہیں دتاسي کے مقابلے میں هر طرح کی سہولتیں بھي حاصل رهیں -

دتاسی نے ایک کامیاب زندگي بسر کي - خوش قسمتي سے اس کے زمانہ نے بھي اس کی وسعت معلومات اور غیر معمولی لیاقت سے فائدہ اُتھانے کي کوشش کی - اور اس کي محنتوں کے بار آور هونے کے لئے هر طرح امداد پہونچائي -

فرانس میں اس کی کماحقہ ؛ عزت افزائی هوئي - نہ صرف انسٹیٹیوٹ دي فرانس جیسی رفیع‌الشان مجلس کا وہ رکن بنایا گیا بلکہ "شیوالیر دلا لیژون دانر" (Chevaliar de la Legion'

d'honneur ; جیسا اعلیٰ رتبہ بھی اس کو حاصل ہوا - دوسرے ملکوں سے اس کو جو خطابات عطا ہوئے ان کی تفصیل یہ ھے :—

۱ - پرتگال -

"Commandeur del' ordra de saint jaques du Portugal"

۲ - سویڈن -

"Chevalier de' l' E toile Polaire de Suede"

۳ - ھندستان -

Knight of the Imperial order of the star of India"

ان درباری اور سیاسی ھمت افزائیوں کے علاوہ دتاسی کی حقیقی علمی قدر و منزلت اس طرح ظاھر ھوتی ھے کہ وہ پیرس کی مشہور ایشیاٹک سوسائٹی کا نہ صرف بانی تھا بلکہ آخر میں اس کا صدر بھی منتخب ھوا تھا - سینٹ پیٹرس برگ ؛ برلن ؛ ویانا ؛ فلارنس ؛ اسپال وغیرہ جیسے اھم مقامات اور دارلحکومتوں کی مشہور علمی اکیڈیمیوں اور مجالس اعلیٰ کا مصروف رکن ھونے کے علاوہ دتاسی 'لندن' ؛ کلکتہ اور بمبئی کی ایشیاٹک سوسائیٹیوں کا بھی اعزازی رکن تھا -

لیکن ان تمام اعزازات اور رتبوں کے باوجود گارسان دتاسی ایک منکسر مزاج اور سادہ طبیعت آدمی تھا - اس کی وفات کے بعد اکیڈیمی کے صدرنے اس کے اوصاف میں جو تقریر کی اور جس کا ذکر اوپر گذر چکا ھے - اس کے چند اقتباسات کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ھے - جس سے دتاسی کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ھے -

" گذشتہ چہار شنبہ کو موسیو گارسان دتاسی کا جنازہ اُٹھایا گیا ان کی خواھش کے مطابق جس کو انھوں نے با ضابطہ ظاھر کیا تھا ؛ اکیڈیمی سرکاری طور پر ان کے جنازہ کے ھمراھی کے لیے شریک نہیں ھوئی یہ بحیثیت دوستوں کے تھا جو ھم نے ان کے جنازہ کے ھمراھی کی

لاش مارسیلز کو روانه کی گئی اور کوئی تقریر نہیں کی گئی ۔ اس لیے اب اجازت دیجیے که اپنے کھوئے ہوے دوست کو الوداع کہوں ۔

. . . .

ان کی شہرت ہندستان میں فرانس سے زیادہ تھی ۔ ہندستانی صحیفوں میں ان کی تصویریں چھپیں اور نثر و نظم میں اس مغربی تنقید نگار کی مدح میں گیت گائے گئے . . . .

. . . .

گارسان دتاسی کا نام ایک ان تھک کام کرنے والے ، ایک پختہ مستشرق کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ لیکن جس چیز کی ہم (جو انہیں جانتے تھے) تعریف کرنے پر مجبور ہیں وہ ان کے اخلاق ، نرم دلی اور نا قابل قبول انکسار ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو چھوٹا سمجھنے کے لیے ہمیشہ تیار تھے ۔ وہ علم سے سوائے اس کی خدمت کے اور کسی بات کے طلبگار نہ تھے ۔

اپنے آبا و اجداد کے مذہب عیسائیت کے وہ پورے معتقد تھے اور صبر و رضا کے ساتھہ انتقال کیا ۔ "

گارساں دتاسی کے کتب خانے کے قلمی نسخوں کی فہرست

دکنی مخطوطے

۱ ۔ قصص الانبیا ۔ محمد بن حسن الدیلوری الحنفی کی فارسی کتاب "قصص الانبیا" کا دکنی ترجمہ از عبدالصمد عبدالوهاب خان ابن نصرت خان اصل فارسی کتاب ثعلبی کی عربی قصص الانبیا کا ترجمہ تھی ۔

خوبصورت مخطوطہ ۔ نظام آباد یا ارکاٹ (تحصیل محمد پور)

میں سنہ ۱۲۳۳ھ (م ۱۸۱۷ء - ۱۸۱۸ء) نقل کیا گیا - ۲۱۱ ورق - کٹلاگ نمبر ۲۷۸۵ -

۲ - خزانۂ عبادت—طویل مثنوی مصنفہ شاہ محمد قادری سنہ تصنیف ۱۱۹۹ھ (م ۱۷۸۴ء) دکنی مسلمان اس کتاب کی بہت عزت کرتے ہیں -

مخطوطہ خوبصورت نستعلیق میں، شہر مدراس میں سنہ ۱۸۴۸ء میں نقل کیا گیا - کاتب غلام قادر - گارسان دتاسی کو یہ نسخہ پانڈیچری کے موسیو اے سکے (M. E. Sice) نے دیا تھا - ۲۸۷ ورق کٹلاگ نمبر ۲۷۸۹ -

۳ - قصہ فیروز شاہ—مصنفہ محمد عاجز دکنی مصنف لعل و گوہر - یہ مخطوطہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی ملکیت رہ چکا تھا - کٹلاگ نمبر ۲۸۰۴ -

۴ - قصہ پیغمبران—ملا محمد باقر مجلسی کی فارسی کتاب "حیات القلوب" کا اردو ترجمہ - از ولی محمد بن حافظ میران - مخطوطہ پانڈیچری میں نقل کیا گیا - خط خوبصورت، کٹلاگ نمبر ۲۷۸۴ -

۵ - دیوان ولی—شاہ محمد ولی اللہ - جہاں جہاں سمجھہ میں نہیں آیا - یا جہاں الفاظ متروک نظر آئے کاتب نے وہاں اپنے زمانے کے الفاظ داخل کردیے ہیں - اس کے علاوہ اکثر دفعہ اُس نے غالباً اپنے اشعار داخل کرکے اس میں ولی سے منسوب کردیا ہے - ۱۸۲ صفحات - (اس مخطوطہ کا نام دتاسی نے دیوان ولی مخطوطہ ای (M. E.) رکھا تھا - کٹلاگ نمبر ۲۸۲۱ -

۶ - دیوان ولی - یہ مخطوطہ گارساں دتاسی کے مخطوطات دیوان ولی میں سب سے زیادہ مکمل، صحیح، قدیم، اور قابل وثوق ہے -

اسي کے مطابق دتاسي نے اپنا دیوان ولي مرتب کیا تھا - اس کا نام مخطوطہ نمبر ۱ (.M. A) تھا - اس کا کاتب غالباً سمجھدار اور محتاط آدمي ہوگا - ۱۲۵ ورق - کٹلاگ نمبر ۲۸۲۲ -

۷ - دیوان ولي - مخطوطہ د (.M. D) قدیم ، نہایت صحیح - لیکن کاتب نے وہ اشعار چھوڑ دیے جن کو وہ سمجھ نہ سکا - یہ مخطوطہ متوفی ڈبلیو پرائس کي ملکیت تھا - اور اسي سے اس مستشرق نے اپني "ہندستاني گرامر" میں تین غزلیں منتخب کرکے شائع کي ہیں - ۲۷۰ ورق - کٹلاگ نمبر ۲۸۲۳ -

۸ - دیوان ولي - مخطوطہ سي (.M. C) مورخہ ۲۱ صفر سنہ ۲۲ھ جلوس محمد شاہ - لکھا نہیں کہ کس شہر میں ، لیکن ظاہر کرتي ہے کہ شمالي ہند میں نقل کیا گیا - ۲۰۲ ورق - کٹلاگ دنمبر ۲۸۲۴ -

۹ - دیوان ولي مخطوطہ ایف (.M. F) نہایت اچھا نسخہ - خوبصورت تحریر لیکن نا مکمل - صرف ردیف (و) تک کي غزلیں شامل ہیں - یہ مخطوطہ جے ڈبلیو رسل (J. W. Russel) کي ملکیت رہ چکا تھا - اور دتاسي کو مشہور مستشرق شکسپیر نے دیا تھا - ۱۲۱ صفحات - کٹلاگ نمبر ۲۸۲۵ -

۱۰ - دیوان ولي - مغل شاہنشاہ محمد شاہ کے کتب خانے کي ملکیت - نفیس تحریر ، صحیح اور بغیر تغیّر و تبدّل کے - ۲۳۲ صفحات - کٹلاگ نمبر ۲۸۲۶ -

۱۱ - دیوان ولی - مخطوطہ جی (.M. G) مکمل اور بہت اچھي حالت میں - بغیر تاریخ کٹلاگ نمبر ۲۸۲۷ -

۱۲ - دیوان ولي - مخطوطہ آئی (M. I) ایس لی پریسان (S. Lee Paraissan) کي ملکیت مورخہ سنہ ۱۸۰۱ع مکمل - لیکن بعض جگہ غلط ، کٹلاگ نمبر ۲۸۲۸ -

۱۳ - دیوان ولی - مورخہ سنہ ۱۷۸۰ع - کپتان فولس (Faules) کی فرمائش پر نقل کیا گیا تھا - نہایت صاف لکھا ہوا اور مکمل - ۲۵۲ صفحات ، کتلاگ ۲۸۸۹ -

۱۴ - دیوان ولی - خود گارساں دتاسی کے ہاتھہ کا لکھا ہوا نسخہ اس سے کلیات ولی سنہ ۱۸۳۴ع میں شایع کیا گیا - کتلاگ نمبر ۲۸۳۰ -

۱۵ - رسالۂ توحید یا کتاب التصوف - صوفیانہ موضوع پر دکنی زبان کی ایک مشہور نظم ، ۹۰ اوراق ، کتلاگ نمبر ۲۸۳۵ -

۱۶ - طوطی نامہ - بخشی کی کتاب کا دکنی نظم میں ترجمہ از مولانا غواصی - نسخہ نہایت قدیم اور خوبصورت خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے - حمد و نعمت کے بعد ایک فصل چار صفحے کی سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں لکھی گئی ہے - ۲۰۰ صفحات کتلاگ نمبر ۲۸۳۹ -

۱۷ - لعل و گوھر از محمد عاجز دکنی - ایک خوبصورت مجموعے میں شامل ہے - آخر میں سحرالبیان بھی نقل کی گئی ہے - کتلاگ نمبر ۲۸۶۲ -

۱۸ - قصۂ لعل و گوھر - از محمد عاجز دکنی - ایک مجموعہ میں شامل ہے - جس میں مفرح القلوب ترجمہ ھتوپدیش بھی منقول ہے - کتلاگ نمبر ۲۸۶۳ -

۱۹ - پنچھی باچھا - منطق الطیر فریدالدین عطار کا دکنی ترجمہ از وجیدالدین - مصنفہ سنہ ۱۱۲۴ (۱۷۱۲ - ۱۷۱۳ع) یہ مخطوطہ پانڈیچری کے موسیو سکے کی ملکیت رہ چکا تھا - اور نظام حیدر آباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا تھا - ۱۷۶ اوراق کتلاگ نمبر ۲۸۶۷ -

۲۰ - معراج نامہ - از سید بلاقي دکني - مکتوبہ سنہ ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ - ۱۸۰۵ء) کاتب شیخ احمد نے نظم کے آخر میں اپني پسند کے اور شعر اضافہ کیے ھیں - یہ کتاب ایک مجموعہ میں شامل ہے - جس میں ۱۳ متفرق مثنویاں اور غزلیں ھیں - کٹلاگ حبر ۲۸۲۹ -

۲۱ - تزویج بي‌بي فاطمہ - از بلاقي یا نظام‌الدین یہ کتاب بھي متذکرہ بالا مجموعہ میں شامل ہے -

۲۲ - لھوپري نامہ از نظام‌الدین دکني - یسوع مسیح کا ایک قصہ - یہ بھي متذکرہ مجموعہ میں شامل ہے - ھیر بلوت (D. Herbelot) نے ایک کتاب قصۃ‌العجمجمہ کا ذکر کیا ہے - جس میں یہي قصہ بیان کیا گیا ہے -

۲۳ - قصہ دحیا کبلی - ایک صحابی کا قصہ - نہیت دکني زبان میں از عبیدي یا عابدي آخر میں دو قصیدے بھي ھیں - مکتوبہ سنہ ۱۲۲۱ھ ۱۳ صفحات ، یہ بھي متذکرہ مجموعہ میں شامل ہے -

۲۴ - مروي کے احوال ، یا مروي احوال سے ۱۸ صفحات کي مثنوي جس کو دتاسي نے وحید دکني کے نام سے منسوب کیا ہے - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۵ - قصہ حضرت علي سہل - وحیدي دکني مصنفہ ۱۲۱۸ھ اس کا اصل نام غالباً وھي ہے جو ایسٹ انڈیا کمپني کے کتب خانے کے نسخے پر لکھا ہے - یعني قصہ در احوال جان محمد حلیف مکتوبہ ۱۲۱۸ھ ۳۷ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۲۶ - مجلس طفلي - یہ غالباً مرثیہ ہے ۳۲ صفحات - فہم نامي شاعر سے منسوب ہے - جس کے متعلق کوئي معلومات نہیں - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۷ - قصہ چلدر بدن و ماهیار - از میر حیدر شاہ دکنی ۳۱ صفحات - اِس کا ایک نسخہ چلدری لال حیدرآباد کے کتب خانے میں تھا - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۸ - تولد نامہ خاتون جنت - مثنوی ۱۵ صفحات - نام مصنف نا معلوم - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۹ - وفات نامہ خاتون جنت - نظم ؟ ۱۵ صفحات ؟ نام مصنف نا معلوم متذکرہ مجموعہ میں -

۳۰ - قصہ ملکہ بادشاہ - نظم از محمد پیر دکنی - مصنف کہتا ہے کہ یہ کتاب فارسی کا ترجمہ ہے - در اصل اُس یونانی ملکہ کا قصہ فارسی میں بھی موجود ہے جس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں محفوظ ہے - ۳۴ صفحات ؟ متذکرہ مجموعہ میں -

۳۱ - قصہ تولی نامہ - مثنوی از شاہ محمد زمان یار دکنی ۱۹ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۳۲ - قصہ ابوالفیض نوری - نظم نہایت دلچسپ قصہ ہے - از خانی دکنی - ۳۰ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۳۳ - قصہ ماہ منور سوداگر بچہ وشمشاد بانو دختر فرنگی - از دیدار دکنی نامکمل نسخہ ۲۲ صفحات ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں قصہ رضوان شاہ فایز بھی داخل ہے کتلاک نمبر ۲۸۷۰ -

۳۴ - قصہ رضوان شاہ از فایز دکنی سنہ ۱۰۹۲ ع ۱۲۸۳ع اشک نے اسی مضمون پر ایک قصہ نثر میں لکھا ہے - ۲۰۲ صفحات متذکرہ مجموعہ -

۳۵ - قصہ شیخ زا (ضیا؟) دکنی میں ایک چھوٹی سی صوفیانہ مثنوی - بحر رمل میں لکھی گئی ہے نسخہ نہایت بے احتیاطی سے نقل کیا گیا ہے - اور مارسل کے کتب خانے کی ملکیت ہے جو قومی کتب خانے کا ناظم تھا - کتلاک نمبر ۲۸۷۴ -

۳۶ - گلشن عشق - از نصرتي دکني (۱۶۵۸) یه نسخه لیڈن کي ملکیت رہ چکا تھا - مورخه سنه ۱۷۵۸ ع - از خط رمز علي چشتي ۲۹۸ صفحات کٹلاگ نمبر ۲۸۷۶ -

۳۷ - کریما - پندنامه سعدی ؟ فارسي ؟ معه ترجمه بزبان دکني اردو ۳۳ صفحات - کٹلاگ نمبر ۲۸۸۸ -

۳۸ - جنگ نامه سهراب و رستم - شاہنامه کے ایک حصه کا ترجمه از منشي کاظم‌الدین دکني - سر ریوس شملي هوٹن کي ملکیت ۲۵۰ ورق - کٹلاگ نمبر ۲۸۹۱ .

۳۹ - ترجمه انوار سهیلي - بزبان دکني - نام مصنف نامعلوم - خوبصورت مخطوطه مورخه سنه ۱۱۱۶ ھ (۱۷۰۵ع) آدم کلارک کي ملکیت کٹلاگ نمبر ۲۸۹۲ .

۴۰ - ترجمه انوار سهیلي - نهایت خوشخط نسخه - هنری چنڈلر (Henry Chandler) کي ملکیت - حاشیه پر انگریزي میں نوٹ هیں - ۱۸۰ اوراق کٹلاگ نمبر ۲۸۹۳

۴۱ - دکني غزلیں - چهوٹا خوبصورت مخطوطه - دتاسي کو موسیو اس سکے (M. E. Sice) نے دیا تھا - کٹلاگ نمبر ۲۹۱۴ .

۴۲ - ایک دکني قصه - دتاسي کے هاتھه کا نقل کیا هوا - ۵۱ صفحات کٹلاگ نمبر ۲۹۱۵ -

۴۳ - ایک دکني قصه - دتاسي کے هاتھه کا نقل کیا هوا - نام مصنف نا معلوم کٹلاگ نمبر ۲۹۱۷ -

۴۴ - ایک دکني قصه - دتاسي کے هاتھه کا نقل کیا هوا - متذکرہ بالا قصه کے ساتھه شامل هے -

قلمی اُردو تذکرے

۱ - تذکرہ لطف علی حسینی گردیزی ۱۱۵۴ھ (م ۱۷۴۰ - ۱۷۴۱ع)
شمال اور دکن کے سو شاعروں کے حالات - کپتان ترویر (Troyer) نے
ٹیپو سلطان کے ایک مخطوطہ سے نقل کیا - خوشخط - ۱۷۰ صفحات -
اس کی اور نقلیں ایسٹ انڈیا ہاؤس - اوسلے (Ousley) کلکشن اور
کتب خانہ وزیر نظام میں موجود ہیں کتلاگ نمبر ۲۹۴۱ -

۲ - تذکرہ شعرائے ہندی از غلام ہمدانی مصحفی (۱۷۶۰ - ۱۸۱۵ع)
محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۰ع) سے سنہ ۱۷۸۳ع تک کے شاعروں کے حالات ،
فورٹ ولیم کے کتب خانے سے یہ نسخہ سنہ ۱۸۳۰ع میں نقل کیا گیا -
۱۵۴ صفحات کتلاگ نمبر ۲۹۳۸ -

۳ - گلزار ابراہیم - تین سو ہندوستانی شاعروں کا تذکرہ ، مصنفہ
علی ابراہیم امین الدولہ ناصر جنگ یہ کام سنہ ۱۷۷۲ع میں شروع کیا
گیا اور ۱۷۸۳ع میں ختم ہوا - خط نسخ میں نہایت احتیاط کے ساتھ
موسیو ترویر نے گارساں دتاسی کے لیے نقل کیا - کتلاگ نمبر ۲۸۱۰ -

۴ - گلزار ابراہیم - از علی ابراہیم - خوبصورت نستعلیق میں یہ
نسخہ ٹرنر ما کن (Turner Macan) ایڈیٹر "شاہ نامہ" کی ملکیت
رہ چکا تھا - ۲۵۱ ورق کتلاگ نمبر ۲۸۱۱ -

۵ - گلشن ہند - از مرزا علی لطف فرزند کاظم بیگ خاں
مورخہ ۱۲۱۵ھ (م ۱۸۰۰ - ۱۸۰۱ع) لطف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اُس نے
اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے - صرف پہلا حصہ جو ساتھ بڑے
شاعروں پر مشتمل ہے مکمل ہے - دوسرا ختم نہیں ہوا -

سید ذوالفقار علی تجلی نے بتاریخ ۱۲۲۳ھ (م ۱۸۳۷ - ۱۸۳۸ع)
وزیر نظام حیدرآباد کے نسخے سے نقل کیا - دتاسی کو کرنل سیتھیووارڈ

(Steward) نے تحفہ دیا تھا ـ ۴۰۰ صفحات ، کتلاگ نمبر ۲۸۰۷ ـ

۶ ـــ مجموعہ نغز ـ از ابوالقاسم دهلوي (۱۸۰۲ ـ ۱۸۰۷) تقریباً آتھہ سو شاعروں کے حالات لکھے ھیں ، نہایت خوشخط مخطوطہ ـ ۹۱۸ اوراق ، کتلاگ نمبر ۱۹۳۷ ـ

۷ ـــ عمدۂ منتخبہ ـ از میر محمد خاں اعظم‌الدولہ سرور ابن نواب ابوالقاسم مظفر خاں بہادر بارہ سو شاعروں کے حالات ـ ۱۲۲۱ ھ (م ۱۸۰۶ ـ ۱۸۰۷ ع) نواب حسین علي خاں بہادر نے ۱۸۳۹ ع میں نقل کیا ـ ۷۴۲ صفحات ، کتلاگ نمبر ۹۳۹ ـ

۸ ـــ دیوان جہان ـ انتخاب کلام شعرائے هند ، از بیني نراین لاهوري ۱۸۱۴ ع ـ ٹي روبک (T. Robak) کے مشورے پر یہ کام دیا گیا مکتوبہ ۱۸۳۲ ع کتلاگ نمبر ۲۸۰۸ ـ

۹ ـــ گلشن بے خار ، از محمد مصطفی شیفتہ متوسط ۱۲۴۸ ـ ۱۲۵۰ ھ (م ۱۸۳۲ ـ ۱۸۳۴) چھہ سو شاعروں کے حالات ـ یہ کتاب دهلي میں ۱۷۴۵ ع میں شائع هوئي ـ یہ مخطوطہ ۱۸۳۵ ع میں نہایت احتیاط کے ساتھہ لکھا گیا ، دتاسي کو متوفی بوردوس دهلوي (نے دیا تھا ـ کتلاگ نمبر ۲۹۴۰ ـــ

۱۰ ـــ دستۂ دلکشا ـ یہ کتاب بابو راجندر لال متھرا کے تذکرہ شعراء کا دوسرا حصہ هے پہلا حصہ کلکتہ میں ۱۸۷۰ ع میں شائع هوا ـ ۱۰۱ صفحات جس میں هندستاني مصنفوں پر ۵۸۷ مضامین هیں ، یہ دوسرا حصہ ان شعرا سے متعلق هے جن کے نام حرف ک سے شروع هوتے هیں ـ بہت هي خوبصورت مخطوطہ ـ کتلاگ نمبر ۲۸۰۹ ـ

۱۱ ـــ گلدستۂ حیدري ، مصنفہ حیدر بخش حیدري مصنف توتا کہاني ـ یہ کتاب حیدري کي حسب ذیل تین کتابوں کا مجموعہ

هے ۔— ۱ - مجموعۂ تواریخ و سوانح ، (۲) - دیوان - (۳) - شعرائے هندستاني کا تذکرہ ۔

یہ تیسري کتاب اگر چہ ترتیب کے لحاظ سے اچھي هے ، لیکن مصنف نے اسے تکمیل کو نہیں پہنچایا ۔مخطوطہ نہایت اچھي حالت میں هے ، اور خوشخط نستعلیق میں لکھا گیا هے - ۴۶۳ ورق کتلاگ ۲۸۱۲ -

اہم هندستاني کتب خانوں کے مخطوطے

اس ضمیمے میں دتاسي کے اُن اردو مخطوطوں کي فہرست درج هے - جو هندستان کے قابل ذکر کتب خانوں یا اشخاص کي ملکیت تھي اور جو یا تو بجنسہ دتاسي کے یہاں پہنچ گئیں یا جن کي نقلیں نہایت اهتمام کے ساتھ تیار کي گئي تھیں ۔

۱—محمد شاہ کا شہنشاهي کتب خانہ دهلي :—

" دیوان ولي اورنگ آبادي " اعلی درجہ کا خط - صحیح ' اور بغیر تغیر و تبدل کے ' ۲۳۲ صفحات (۲۸۲۹) یہ شاهي کتب خانے کا اصلي نسخہ هے ۔

۲—حضور نظام حیدرآباد کا کتب خانہ :—

" پنچھي باچھا " منطق الطیر کا دکني ترجمہ از وجیہ الدین مصنفہ ۱۱۲۴ھ - ۱۷۶ اوراق نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے غالباً موسیو سکے نے نقل کرایا (۲۸٦۷) -

۳—حضور نظام کے وزیر کا کتب خانہ :—

الف— " دیوان افسوس " میر شیر علي افسوس کا اردو دیوان شروع میں ایک فارسي مقدمہ هے جس میں مصنف کي سوانح عمري لکھي هے - خوبصورت مخطوطہ - ۳۲۲

صفحات فی صفحه ۱۵ سطر؟ یہ وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے کا اصلی نسخہ ہے - (۸۱۹) -

ب۔ "گلشن ہند" از مرزا لطف مورخہ ۱۲۱۵ھ کاتب سید ذوالفقار علی تجلی بتاریخ ۱۲۲۳ھ - غالباً کرنل اسٹیوارٹ نے وزیر نظام کے نسخے سے نقل کرایا - اور دتاسی کو بطور تحفہ پیش کیا ؟ ۴۰۰ صفحات (۲۸۰۷)

۴۔ٹیپو سلطان بادشاہ میسور کا کتب خانہ :-

"تذکرہ گرویزی" از فتح علی حسینی ۱۱۵۳ھ - کپتان تروپر نے ٹیپو سلطان کے ایک نسخے سے نقل کرایا، خوشخط، ۱۷۰ صفحات، اس کتاب کا ایک ایک نسخہ وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے اور اس کے گلکشن میں بھی موجود ہے (۲۹۴) -

۵۔مہا راجہ کالی کرشنا بہادر کے مخطوطے :-

الف "قصہ کا مروپ" از تحسین الدین، کاتب لکھتا ہے کہ وہ اس کو ۷ اگھن (نومبر - دسمبر) کو ختم کرتا ہے، مگر سنہ نہیں لکھا ہے - یہ نسخہ خود مہاراجہ نے دتاسی کو تحفہ دیا تھا -

ب۔ "مصدر فیوض" اسی نام سے کتاب کا سنہ تصنیف بھی نکلتا ہے، از نذیرالدین حسن شیخ قریشی ۱۸۱۵ع - مصنف لکھتا ہے کہ یہ کتاب بریلی کے فارسی سیکھنے والوں کے لئے نواب احمد یار خاں ابن محمد ذوالفقار کی فرمائش پر لکھی گئی، مہا راجہ کالی کرشنا کے لیے سید محمد علی صاحب نے ۱۸۲۹ع میں نقل کیا - ۲۲۴ صفحات، یہ مہا راجہ کا اصل مخطوطہ ہے (۲۹۰۳) -

۶۔کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال :-

"ترجمۂ تاریخ آسام" ترجمہ مہر بہادر علی حسینی (۱۸۰۵ع)

ایشاٹک سوسائٹی بنگال کے مخطوطہ سے پرنسپ نے نقل کرایا اور دتاسي کو نسخہ دیا (۲۸۰۵)۔

۷۔۔ فورٹ ولیم کالج کا کتب خانہ :۔

الف ۔۔ "قصہ فیروز شاہ عاجز دکني" (دیکھو دکني مخطوطے) یہ اصل مخطوطہ فورٹ ولیم کے کتب خانہ میں تھا ۔ نہ معلوم دتاسي کے یہاں کسي طرح پہنچ گیا (۲۸۰۴) ۔

ب ۔۔ "قصہ کامروپ" از تحسین الدین ' موسیو ترویر سکریٹري هندو کالج کلکتہ نے نہایت اهتمام کے ساتھ کتب خانے فورٹ ولیم کے ایک نایاب نسخے سے نقل کرایا (۲۸۵۴) ۔

ج ۔۔ "قصہ بوستان خیال" از محمد امین دکني (دیکھو دکني مخطوطے) یہ مخطوطہ بھی ترویر کی فرمایش پر فورٹ ولیم کے اصل مخطوطے سے نہایت خوشخط نقل کیا گیا ۔ ۲۹۹ صفحات (۲۸۸۱) ۔

د ۔۔ "تذکرہ هندي" از شیخ غلام همداني مصحفي (دیکھو دتاسي کے اردو تذکرے) یہ نسخہ فورٹ ولیم کے کتب خانے کے مخطوطے سے ۱۸۳۲ ع میں نقل کیا گیا ۔ ۱۵۴ صفحات (۲۹۳۸) ۔

یورپین مستشرقین اور دیگر اشخاص

اس ضمیمے میں اُن یورپي افراد کي تفصیلي فہرست پیش کي گئي هے جنھوں نے اپنے اردو مخطوطے گارساں دتاسي کو بطور تحفہ نذر کئے یا جن کے کتب خانوں کے مخطوطے دتاسي نے خریدے تھے ۔

هر شخص کے نام کے آگے اس کے مخطوطوں کا بھي ذکر کر دیا گیا هے تاکہ آیندہ اس ضمن میں تحقیقات کرنے والوں کو مدد مل سکے ۔

اشخاص کے نام انگریزی حروف تہجی کے مطابق سلسلہ وار لکھے گئے ہیں اور قوسین میں اُن اردو مخطوطوں کے کتلاگ نمبر دے گئے ہیں جن کے ذکر کے سلسلے میں فہرست کتاب خانہ دتاسی میں اُن کا نام آیا ہے -

۱ — آرنٹ (Sanford Arnot) اسکاٹ لینڈ کا مستشرق "ترجمہ گنج خوبی" از میر امن ۱۹۰۲ ع (۲۸۳۴)

۲ — بلنڈ (N. Bland) "کلیات سودا" مورخہ ۱۷۹۰ ع (۲۸۱۷) -

۳ — چینڈلر (Henry Chandler) "ترجمہ انوار سہیلی دکنی" (۲۸۹۳) -

۴ — کلارک (Adam Clarke) "ترجمہ انوار سہیلی دکنی" مورخہ ۱۱۷۹ ھ (۲۸۹۰) -

۵ — فلکونر (M. Falconer)

(۱) - "دیوان شاہ رکن الدین عشق دہلوی (۲۸۱۵)

(۲) - "قصہ مہر و ماہ" از منشی غلام اکی (Aki) (۲۸۷۵) -

۶ - فاربس (D. Forbes) -

(۱) - "حیدر نامہ" مورخہ ۱۲۲۰ھ (۲۷۹۹) -

(۲) - "تولد نامہ" مثنوی شیخ غلام محی الدین زشت منگل پوری مورخہ ۱۲۱۹ھ مکتوبہ مصنف (۲۸۳۴) -

(۳) - "خیابان ریحان" از ریحان الدین بنگال (۱۸۹۷-۱۸۹۸ع) (۲۸۷۹) -

(۴) - "منتخبات اردو" از میر افضل علی سنہ ۱۸۴۰ع (۲۹۰۰) -

(۵) - "مخزن الامثال" از محمد علی سلہانی (۲۸۹۶) -

۷ - فریزر (M. Fraser) مشہور سیاح ایران کے بھائی -

" مجمع داستان " از حکیم حکومت رائے سنه ۱۲۴۳ع مکتوبه مصنف (۲۸۴۳) -

۸ - گلکرائسٹ (Dr. Gilchrist) " قصه کامروپ " از گلدن لال لاهوری - مکتوبه مصنف (۲۸۵۱) -

۹ - هوٹن (Sir Chamnez Haughton) " دیوان ولا " از مرزا لطف علي دهلوي (۲۸۲۰) -

(۲) - " جنگ نامه سهراب و رستم " از منشي کاظم‌الدین دکني - (۲۸۹۱)

۱۰ - لیس (Nessen Lees) (۱) - " مرثیه اول رزمه " از سید آقاحسن موسوی امانت دهلوي (۲۸۳۱) -

(۲) - " چار مراثي " از مرزا سلامت علي دبیر لکهنوي (۲۸۳۲) -

۱۱ - ماکن (Turner Macan) ایڈیٹر شاه نامه -

(۱) - " گلزار ابراهیم " از علي ابراهیم خاں (۲۸۱۱) -

(۲) - " کلیات جرات " از قلندر بخش (۲۸۱۲) -

۱۲ - مارسل (Mercel) بیلیو تک نیشونل کا ڈائرکٹر - " قصه شیخ ضیا " دکني مثنوي (۲۸۷۴) -

۱۳ - پریساں (S. Lee Paraisant) - " دیوان ولي " مورخه سنه ۱۸۰۱ع (۲۸۲۸) -

۱۴ - پرائس (W. Price) - مصنف هندستاني گرامر " دیوان ولي " مخطوطه " ی " (۲۸۲۳) -

۱۵ - پرنسپ - (Prinsip) - " تاریخ شیر شاه " مترجمهٔ مظهر علي خاں ولا ؟ سنه ۱۸۰۵ع - (۲۸۰۲) -

۱۶ - رویک (T. Roebuck) اسی مستشرق کے مشورے پر بهیني نارائن لاهوري نے اپنے انتخاب دیوان جهان کا کام تکمیل کو پهونچایا - " کلیات قلندر بخش جرأت " مورخه سنه ۱۸۰۸ع (۲۸۱۴) -

۱۷ - رومر - (Romer) - "قصہ مادھو نل" از مرزا لطف علی ولا سنہ ۱۲۱۵ (۲۸۷۱) -

۱۸ - رسل - (J. W. Russel) - "دیوان ولی" مخطوطہ ف - (۲۸۲۵) -

۱۹ - شکسپیر - (G. Shakespeare) - "نو طرز مرصع چہار درویش" از میر محمد عطاحسین تحسین مورخہ سنہ ۱۷۸۸ع (۲۸۱۰) -

(۲) - "دیوان ولی" مخطوطہ ف (۲۸۲۵) -

۲۰ - سکے - (M. E. Sice) مقیم پانڈیچری -

(۱) - "خزانۂ عبادت" از شاہ محمد قادری ۱۱۹۹ھ (۲۷۸۹) -

(۲) - "خلاصہ تاریخ نادر شاہ" حیدری کے ترجمہ سے اس کو کوئی تعلق نہیں (۲۷۹۹) -

(۳) - "پدچھی با چھا" از وجیہ الدین ۱۱۲۳ھ نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا - (۲۸۹۷) -

(۴) - "دکنی غزلیں" (۲۹۱۳) -

۲۱ - یسٹھوارڈ - (Col. Steward) - "گلشن ھند" از مرزا علی لطف وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا (۲۸۰۷) -

۲۲ - ٹرویر (Cap. Troyer) سکریٹری کلکتہ ھندو کالج -

۱ - گلزار ابراھیم - از علی ابراھیم خاں خلیل - خود ٹرویر کا مکتوبہ (۲۸۱۰) -

(۲) - "قصہ کامروپ" از تحسین الدین - فورٹ ولیم کے کتب خانے سے ٹرویر نے نہایت اھتمام سے نقل کرایا (۲۸۵۴) -

(۳) - "قصہ یوسف زلیخا" از امین دکنی سنہ ۱۲۰۰ع - فورٹ ولیم کے کتب خانے سے ٹرویر نے نہایت اھتمام سے نقل کرایا (۲۸۸۱) -

(۴) - "تذکرہ گرویزی" از علی حسین گرویزی سنہ ۱۵۳ ع - خود ٹرویر نے ٹیپو سلطان کے ایک مخطوطے سے نقل کیا (۲۹۴۱) -

۲۲ - وائٹ (Col. Wight) - "مجموعہ کلام ھندستانی و فارسی"
از صدرالدین محمد فیض ابن زبردست خان (۲۸۷۸) -

ان مستشرقین کے علاوہ دس اور یورپی افراد کے نام گارساں دتاسی کے اردو مخطوطوں کے سلسلے میں ہماری نظر سے گذرتے ھیں - گو ان کا حسب ذیل تذکرہ بظاھر کوئی اھمیت نہیں رکھتا مگر ممکن ھے کہ کسی وقت تحقیق و تفتیش میں اس سے مدد ملے - قوسین میں دتاسی کے ان مخطوطوں کا فہرست نمبر درج ھے جن کے سلسلے میں ان اشخاص کا ذکر آیا ھے -

۱- اینڈرسن (James Anderson) اور گلاڈون نے ملفوظات جہانگیری کے انتخابات کئے تھے (۲۷۹۷) -

۲- بوتروس (F. Boutrons) پرنسپل دھلی کالج - اس شخص کی زیر نگرانی مولوی امام بخش صہبائی نے "حدائق البلاغت" کا اردو ترجمہ کیا (۲۹۰۱) بوتروس ھی نے دتاسی کے لیے نہایت احتیاط سے اس ترجمہ کا ایک نسخہ لکھوایا -

اسی بوتروس نے دتاسی کو مصطفی خان شیفتہ کا "تذکرۂ گلشن بے خار" بھی نقل کرا کر تحفہ دیا تھا (۲۹۴۰) -

۳- فولس (Captain Foules) - اس شخص کی فرمایش پر کلیات ولی سنہ ۱۷۸۰ء میں نقل کیا گیا تھا (۲۸۲۹) -

۴- فرانسس (M. Robert Fransis) - اس شخص کو تحفہ دینے کے لیے شاہ حسین خان حقیقت دھلوی نے اپنے قصے "جذب عشق" کو ۱۲۱۲ھ (م ۱۷۹۷ - ۱۷۹۸) میں نقل کیا - یہ نسخہ اصل کلم کی تیسری نقل ھے - نقل کرتے وقت مصنف فتح گڈھ کیمپ میں تھا - اس کتاب میں ایک صحیح واقعہ بیان کیا گیا ھے جو بمقام سارو

۱۲۰۴ھ (م - ۱۷۸۹ - ۱۷۹۰) گذرا - اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۱ھ ھ (۲۸۸۳) -

۵—گلادون - (Gladuin) نے "ملفوظات جہانگیری" کے اِنتخابات پیش کئے تھے (۲۷۹۷) -

۶—ھیربلو - (D' Herlbelot) نے ایک کتاب "قصہ النجمجہ" کا ذکر کیا ھے جس میں وھی قصہ بیان کیا گیا ہے جو نظام الدین دکنی کی کتاب "کھوپری نامہ" میں یسوع مسیح کی سیمت لکھا گیا ھے (۲۸۹۹ - ۳) -

۷—جونس - (sir William Jones) نے "تاریخ نادری حیدری" کا انگریزی میں ترجمہ شایع کیا - (۲۸۰۱) -

۸—لیڈن - (Leydan) - "گلشن عشق" نصرتی دکنی (۱۹۵۸) مورخہ سنہ ۱۷۵۸ اسی شخص کی ملک بھی جو دتاسی نے حاصل کی - (۲۸۷۹) -

۹—لٹل (Captain Thomas Little.) یہ شخص ٹیپو سلطان کی مخالف انگریز فوج میں سردار تھا - اور اسی کی فرمایش پر حیدر نامہ فارسی کا اردو میں ترجمہ کیا گیا - اس کتاب میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سوانح و حالات درج ھیں - مورخہ ۱۲۲۰ھ (۲۷۹۹) -

۱۰—مونات (James Monot) فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں یہ شخص ھندستانی پروفیسر تھا اور اس نے "بیتال پچیسی" مترجمہ سری للو لال کبی گجراتی اور مظہر علی خان ولا پر نظر ثانی کرنے کے لئے تھریلی چرن مترا سے فرمایش کی - (۲۸۹۸) -

"مثنوي حُزن اختر"

اور

خصوصیات مصنف

(از مولانا احسن مارهروي پروفیسر اُردو اِنٹرمیڈیٹ کالج علیگڑھ)

تاریخي اندراجات سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو ہندستان کے سلاطین و والیان ملک میں چند ہستیاں ہي ایسي نظر آئیں گي، جن کو شہرت عام نے بقائے دوام کي شاہ راہ سے گزرنے کا موقع دیا ہے - انہیں چند نفوس میں لکھنؤ کے آخري تاجدار جان عالم واجد علي شاہ اختر کو بھي شمار کرنا چاہیے، خاص و عام میں اُنکي شہرتیں جن واقعات و حالات سے وابستہ ہیں وہ تین عنوانوں میں متحدود ہیں :—

(۱) کمال شاعري -
(۲) انہماک نشاط -
(۳) زوال سلطنت -

ان تینوں حالتوں کے وقوع میں کسي شبہے کي گنجائش نہیں، البتہ اُن کے بیان و اظہار میں زیبائش داستان کی سي رنگ آمیزیاں دھوکے میں ڈال سکتي ہیں - ایسي باتوں کي تصدیق و تکذیب کے لئے دوسرے وقائع نویسوں کي تحریروں کے مقابل میں خود صاحب واقعہ کے بیانات کا مطالعہ زیادہ قابل اعتبار اطلاعیں بہم پہونچا سکتا ہے -

حُسن اتفاق سے واجد علي شاہ مرحوم کا بیشتر سرمایہ تصنیف و تالیف طبع ہو چکا ہے اگر اُس کو معیار نفسیات پر فطري اصول کے ساتھہ پرکھا جائے تو مصنف کے اکثر صحیح واقعات اور وقوعي حالات معلوم ہو سکتے ہیں - في الحال اُن کي ایک تصنیف (مثنوي حزن

اختر) سے خصوصیات مذکور پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی -

اس مثنوی میں بادشاہ موصوف نے انتزاع سلطنت کے بعد اپنے لکھنؤ سے جانے، کلکتے میں رہنے اور قید ہونے کے سوانح اس شرح و بسط سے قلم بند کیے ہیں کہ ان کو پڑھ کر واقعات کی تصدیق کرنے کے لیے، اُن کے بیان کا انداز صداقت، دوسری تحریروں کے تائیدی ثبوت سے مستغنی کر دیتا ہے -

جان عالم کی مشہور خصوصیتوں میں اُن کی شاعری کا نمبر تیسرا ہے - اور اُن کی شہرت سخن، صرف طبقۂ شعرا اور وہ بھی مخصوص حلقے تک محدود ہے -

مثنوی حزن اختر کو پڑھ کر جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اُنہیں خصوصی شہرتوں کے مانند ہیں جن کا بیان اوپر ہو چکا ہے، یعنی :—

۱ - کمال شاعری اور اُس کے اسالیب بیان کی تنقید -

۲ - انہماک نشاط اور اُس کے متعلقات -

۳ - زوال سلطنت اور اُس کے اسباب -

لیکن قبل اس کے کہ ان خصوصیات پر تبصرہ و نظر کا سلسلہ شروع کیا جائے بعض اہل قلم کی ایسی تحریریں نقل کی جاتی ہیں جن سے موجودہ طرز تنقید کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے :—

رسالۂ مخزن لاہور نمبر (۱) جلد (۱۶) اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع میں "جان عالم کی شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، اُس کے صفحہ (۴۸) سطر (۵) میں یہہ الفاظ درج ہیں :—

"یہہ ہندستان کے پہلے بادشاہ ہیں جنہوں نے شاعری میں کسی کی شاگردی قبول کرنا ننگ نہ سمجھا" -

اس انکشاف کے بعد خود جان عالم اختر کا اعتراف بھي سننے کے
بل ہے :—

زن و مرد سے کم ہوے سات لوگ
مجھے فتح دولہ کا اب بھي ہے سوگ
خدا بخشے اُس کو عجب مرد تھا
فنِ شاعري میں تو وہ فرد تھا

یہہ بندہ ہے شاگرد اُس ماہ کا
بندھا ہے دھواں دل میں اک آہ کا

(مثنوي حزن اختر مطبوعہ سلطان المطابع صفحہ (۵۳)-

اسي طرح ایک مضمون نگار کا بیان اخبار ذوالقرنین بدایوں میں
یکھا گیا، نمبر (۳۵) جلد (۲۸) ۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں بعنوان
" اودھہ کي تاریخ کا ایک ورق یعني آخري تاجدار اودھہ واجد علي شاہ
ي زندگي کا مختصر خاکہ " - بیان کیا گیا ہے کہ :—

حرام مطلق نہیں کرتے تھے، غیر ممتوعہ عورت کي صورت تک
دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے، (۳۶۰) بیگمات تھیں اور اُن میں
کوئي ایسي نہ تھي جس کے ساتھہ از روئے شرع شریف متعہ
نہ ہو گیا ہو، کبھي کسي عورت کے ساتھہ جبراً متعہ نہیں
کیا، بے شک ممتوعات کي کثرت تھي اور بادشاہ پر جو فرد
جرم لگائي گئي ہے اُس میں سب سے زیادہ سنگین یہي جرم
تصور کیا جاتا ہے، اس پر کوئي شرعي الزام تو آ ھی نہیں
سکتا اس لیے کہ بادشاہ مذہب اثنا عشریہ کے پیرو تھے لہذا
اُن کے اعتقاد میں متعہ بغیر کسي حد اور قید کے شرعاً
جائز تھا، اب رہا یہہ کہ اخلاقي اور تمدّني حیثیت سے
بادشاہ کو اتني عورتوں سے متعہ کرنے کي کیا ضرورت تھي ؟ اس

کي حالت یہہ ھے کہ بادشاہ نہایت ھي محتاط اور پرھیزگار تھے ' اور اُنھیں ایک گھڑي کے لیے بھي گوارا نہ تھا کہ کسي نا محرم عورت پر اُن کی نظر پڑے مگر شاھي محل تھا جس میں پیش خدمتوں محلداروں ' مغلانیوں ' مکان‌داریوں ' یہاں تک کہ بھشتنوں اور خاکروبنوں کے ایک گروہ کثیر کے رھنے کي ضرورت تھي - ممتوعات میں چند ھي تھیں جن کے ساتھہ خلوت‌گاہ میں داخل کرنے کي غرض سے متعہ کیا گیا ھو ' ورنہ سب کي سب خدمتگارنیاں تھیں ' لیکن چونکہ متعہ ھو جانا لہذا جائز تھا کہ اُن میں سے کوئي پسند آئے تو خلوت میں بلا لي جاے - معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کي حالت پر غور نہیں کیا اس لیے کہ ممتوعات کي کثرت تو اُن کے اتقا اور پابندي شرع کي دلیل تھي اور اتقا بھی ایسا ' جیسا معمولي مسلمانوں میں بھی کم دیکھا گیا ھے ' بہت سے اگلے بادشاھوں کي نسبت آپ سنتے ھیں کہ اُن کے محل میں چند بیوي کے ساتھہ ھزاروں کنیزیں بھري ھوتي تھیں اور اب بھی اگرچہ بردہ فروشی ممنوع اور جائز کنیزوں کی فراھمی کا سلسلہ مسدود ھو گیا ھے ' مگر ھندستان کے مسلمان والیان ملک کے محل اور زنان‌خانے اُسي طرح بے حد عورتوں سے بھرے ھوئے ھیں جن کے جائز و ناجائز ھونے کا کبھي اُنھیں خیال بھي نہیں آتا - لہذا واجد علي شاہ نے شرعي پہلو کي نگہداشت کے ساتھہ اپنا شوق پورا کیا تو کون اعتراض کرسکتا ھے ؟ لوگ خواہ مخواہ کو بدنام کرتے ھیں کہ بھشتنیں اور مہترانیاں واجد علي کی بیوي تھیں مگر جو لوگ ایسا کہتے ھیں وہ سخت مغالطے

میں پڑے ہوئے ہیں اصل واقعہ یہہ تھا کہ بادشاہ اپنے ہاتھہ سے آبدست نہیں لیتے تھے لہذا کئی گز چھالٹھن یا نین سکھہ کی لنگی سے آبدست کرایا جاتا تھا ، جس کو دو عورتیں اِدھر اُدھر کھینچتیں ، اس خدمت پر ایک بھشتن اور بھنگن مقرر تھی - اور چونکہ اُن پر سطر ظاہر کرنا پڑتا تھا لہذا بادشاہ نے اُن دونوں کو ممنوعات میں داخل کرکے پہلی کو آب رسان بیگم ، اور دوسری کو مُصفی بیگم کا خطاب دے دیا تھا ، بادشاہ نے کبھی حرام نہیں کیا اور نہ کسی نا محرم عورت کو اپنے سامنے آنے دیا - چنانچہ خدمت میں جتنی عورتیں رہتی تھیں وہ قبلہ و کعبہ کے سامنے آتیں اور قبلہ و کعبہ تحقیق و تفتیش کے بعد اُن کے ساتھہ متعہ کا صیغہ پڑھہ دیتے تھے - لیکن خود بادشاہ سلامت یہہ ارشاد فرماتے ہیں :-

چہارم ہے قیصر بھی بیگم کے ساتھہ
لکھا نام میں نے بہت غم کے ساتھہ
نہ منکوحہ تھی اور نہ ممنوعہ تھی
فقط دوستی سے یہاں وہ رہی
اُسے بعد چلدے جو آیا خیال
گئی لکھنؤ ہم کو دے کر ملال
وہیں زاد رہ یاردہ تھیلیاں
عدد میں تھے گیارہ ہزار اے جواں
وہ دیں اس لیے تا رہے میرے پاس
نہ تھہری ہوئی اس طرح کی اداس
ہمیں چھوڑ زنداں میں راہی ہوئی
گئی وہ گئی وہ گئی وہ پری

(حزن اختر صفحہ (۲۵ و ۲۶)-

کسي مشہور و معروف ہستي کے اوصاف بیان کرنے میں ایسي بالاخوانیاں جن سے اس کي وقعت اور کم ہو جائے عجو ملیح کي مترادف ہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ موصوف خود اس کا مدعي نہ ہو - اپني انفرادي رائے پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کے متعلق اب تک جن دو ایک اہل قلم نے آزادانہ یا روادارانہ تبصرہ کیا ہے اُس کا خلاصہ درج کردیا جائے تا کہ عام رایوں کو سن کر، ناظرین ہر انفاقي اور اختلافي رائے سے بآساني نتیجہ نکال سکیں، نیز دونوں قسم کي روایتوں کا امتزاج، درایت کے تجزیئے سے دودھہ کا دودھہ اور پاني کا پاني ہو سکے -

(۱) (اقتباس خم خانۂ جاوید مولفہ پنڈت سري رام جلد اول صفحہ ۲۰۹ و ۲۱۰) -

"ہم اُن کي نفس شاعري کے متعلق اپني رائے ظاہر کرتے ہیں، اُن کے متعدد دیوان، مثنویاں، ضخیم مرثیے، سلام اور مختلف و بے شمار نظمیں دیکھہ کر ہر شخص یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ سلطان عالم ہر وقت اور ہر لحظہ اسي فکر میں رہتے ہوں گے - ہر رنگ اور ہر طرز میں لکھا ہے، مگر اساتذۂ لکھنؤ کي خشک کلامي کے زبردست اثر پر حاوی نہ ہوسکے، چنانچہ کلام میں سوز و گداز کم ہے اور زیادہ تر رعایت لفظي ہي کي تکرار ہے - غزل، قصیدہ، مثنوي، سلام، قطعہ، الغرض کوئي صنف شاعري اُن کي فکر رسا سے نہیں چھوٹي بلکہ اپني حیرت انگیز پُر گوئي کي بدولت جو کچھہ لکھا جي بھر کر لکھا مگر افسوس ہے کہ جملہ تصانیف میں سے صرف ٹھمریوں نے قبولیت کا درجہ حاصل کیا، جملہ تصانیف کي تعداد (۴۰) جلدوں سے کم نہیں اُن کے زمانے میں کیا بلکہ اُن سے پہلے ہي لکھنؤ کے شعرا رعایت لفظي اور استعارہ بلاغت کا ایسا رواج دے

گئے تھے کہ وہاں والے اب تک اس طرز پر مٹے ہوئے ہیں غزلوں میں حضرت اختر کی روش بھی وہی ہے ، پس ہم نہایت آزادی سے اس رعایت لفظی کی پابندیوں کو مد نظر رکھکر اُن کی غزلوں پر رائے دیتے ہیں کہ اُن کے کلام میں اکثر جگہ مرزونی طبع اور فراہمی الفاظ کے سوا کوئی خاص زبان یا بیان کا لطف نہیں پایا جاتا ، مثنویوں میں البتہ اکثر جگہ روزمرہ اور بیان کی صفائی کا خیال رکھا ہے - دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ اُن کے مکتوبات وغیرہ دیکھہ کر ایک عجیب اور قابل قدر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ اختر ہی ایک ایسے بے دھڑک اور سچے شاعر ہے جنھوں نے اپنے تمام خفیہ رازوں ، دلی بھیدوں اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپنی خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ اُن خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے بھی پیش کیا ، ان کی یہ اخلاقی جرءت واقعی اس خاص روش میں تمام شعراے ماضی و حال سے بڑھہ گئی ہے - "

(۲) (اقتباس مضمون "جان عالم کی شاعری" از رسالۂ مخزن لاهور ، اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع نوشتہ خواجہ عشرت لکھنوی) -

" حضرت قدر قدرت ابوالمنصور سکندر جاہ ناصرالدین قیصر زماں سلطان عالم ، علاوہ اور تمام علوم و فنون کے گلشن شاعری کی بھی گلگشت کیا کرتے تھے اور اس باغ میں بہت کچھہ گلکاری بھی کی ہے ، نظم کے ہر صیغے میں داد سخن دی ہے . . . .وہ زمانہ اُردو شاعری کے شباب کا تھا ، زبان کے قواعد ، محاورات کی پابندی ، متروکات کا لحاظ ثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرہیز کا دور دورا تھا . . . . دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان مستند اور مقبول عام تھی اور دهلی کا ٹوٹا ہوا مجمع بھی اسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا

تھا ..... پھر شاہ اختر کا شاعری میں معجز نمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا، بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لیے ہوئے تھا . . . بادشاہ اگرچہ کسی سے تلمذ نہ رکھتے تھے لیکن تاہم کلام زیادہ تر میر و مرزا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا تھا ۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر پکار اُٹھتے تھے، خداوندا! یہ شاعری نہیں سحر ہے؟ اعجاز ہے ۔ فارسی ترکیبوں کے جملے ایک جدید شان سے جھلکتے تھے ... .. بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں کہ اُن کی شاعری تعریف کی بوچھار سے کمال کی حد تک نہیں پہنچنے پاتی اور مصاحبین کی بے جا خوشامد سے پختہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی، مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے اُن کو یہ شک ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے اور چوں کہ خود سخن فہم تھے اس سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل اُن کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی ۔ جان عالم نے تو باوجود مشاغل اور سلطنت کے جو کچھ فرمایا اُریزۂ گوش خلائق ہوا، ہر غزل مقبول خاص و عام تھی، مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمین آپ کے دریاے فکر کے آگے پانی تھی، ہر پہلو پر جزئیات بلاغت کا خیال رہتا تھا پھر تشبیہات و استعارات کی ملمّع کاری نور علی نور ۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیوں اور عمدہ تخئیل کے سمندر موج زن نظر آئیں گے" ۔

غالباً دو اقتباسات شاہ موصوف کی حقیقت شاعری اور متذکرہ اہل الرائے کی ذہنیت کے معلوم کرنے میں کافی مدد دیں گے ۔ اُردو شعرا کے اکثر تذکرے واجد علی شاہ کے وجود سے پہلے لکھے گئے، اور جو تذکرے

ان کے عہد میں تصنیف و تالیف ہوئے اُن میں "سخن شعرا" (مولانا نساخ) کے سوا کسی میں اُن کا نام تک نہیں دیکھا گیا - نساخ نے بھی صرف دو سطری حال لکھ کر دو ایک شعر درج کردیے ہیں ؛ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بسلسلۂ شاعری قابل تذکرہ نہ تھے ؛ دو ایک تذکرے چودھویں صدی عیسوی میں اشاعت پزیر ہوئے اُنھیں میں کم و بیش اُن کے حالات ملتے ہیں ؛ یا بعض رسائل و صحائف میں اُن کی شاعری وغیرہ کے متعلق مضامین پڑھنے میں آتے ہیں ؛ جن دو تحریروں کا انتخاب یہاں درج کیا گیا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی دو چار تحریریں اور مل جائیں مگر وہ بھی بیشتر انھیں سے ماخوذ ؛ اور اس لیئے اسی انداز کی حامل ہوں گی ؛ لہذا اِنھیں اصل ماخذوں کو ملحوظ رکھ کر اس باب میں کچھ عرض کیا جاتا ہے -

جب سے دور جدید کی شاعری نے اہل ذوق میں تعارف حاصل کیا ہے اُس وقت سے بخصوصیت "اُردو شاعری کے دو مختلف اسکول" کا عنوان لکھنؤ اور دھلی کی شاعری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ؛ اس اصطلاحی روز مرہ و عنوان کو پیش نظر رکھکر دیکھا جاتا ہے تو اہل دھلی اور اُن کے ساتھ دوسرے دلدادۂ سلاست زبان ؛ مؤلف خمخانۂ جاوید کے ہمنوا پائے جاتے ہیں ؛ یعنی اہل لکھنؤ خشک کلامی ؛ رعایت لفظی کی تکرار ؛ استعارہ بندی ؛ کنگھی چوٹی کے سوا اور کوئی سرمایۂ شاعری نہیں رکھتے - ان خیالات کی تائید میں اقتباس خُمخانۂ جاوید کے علاوہ شعرالہند جلد اول کی عبارت پڑھنی چاہیے :—

"لکھنؤ کی شاعری کا خاکا اگرچہ مصحفی اور انشا ہی کے زمانے میں قائم ہوچکا تھا - تا ہم اب تک شاعری کے مختلف اسکول قائم نہیں ہوئے تھے ؛ لیکن ناسخ اور آتش نے اس رنگ کو زیادہ نمایاں کیا ؛ اُن کے زمانے سے لکھنؤ اور دلی کے دو مختلف اسکول قائم ہو گئے جن کی

خصوصیات باہم مختلف قرار پائیں :—

(۱) لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں عام طور پہ جو زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا اُس کا اثر وہاں کی شاعری میں نمایاں ہوتا ہے -

(۲) شعراے دهلي کے کلام میں فارسي زبان کي دلآویز ترکیبیں نہایت کثرت سے پائي جاتي هیں لیکن شعراے لکھنؤ کا کلام اُن ترکیبوں سے بالکل خالي هے -

(۳) شعراے دهلي قدما کي طرز پر اکثر مختصر غزلیں کہتے تھے اس لیے اُن کے یہاں مبتذل، سخیف اور بھرتي کے اشعار بہت کم هوتے تھے؛ لیکن شعراے لکھنؤ اکثر نہایت سیر حاصل غزلیں لکھتے هیں جن کي انتہا بسا اوقات دو غزلہ سہ غزلہ اور چو غزلہ پر هوتی هے جس کا نتیجہ یہ هوتا هے کہ تمام قافیوں کو خواہ مخواہ باندھنا پڑتا هے اور اس طرح بہت سے مبتذل مضامین پیدا هو جاتے هیں -

(۴) شعراے لکھنؤ اور شعراے دهلي کے کلام میں معنوي طور پر جو چیز مابہ‌الامتیاز هے وہ یہ هے کہ شعراے لکھنؤ کے کلام میں روحاني جذبات بہت کم پائے جاتے هیں اور اُن کی جگہ معشوق کے خارجي اوصاف و لوازم وغیرہ کا ذکر اس کثرت سے آجاتا هے کہ اُن کے کلام کو پڑھ کر تغزل کا لطف بہت کم حاصل هوتا هے -

(۵) رعایت لفظي کي طرف شعراے لکھنؤ کا عام میلان پایا جاتا هے اور اس صنعت کو وہ نہایت ابتذال کے ساتھ استعمال کرتے هیں -

(۶) ابتذال بھی شعراے لکھنؤ کی ایک عام خصوصیت ھے -

(۷) شعراے لکھنؤ کا عام رنگ معاملہ بندی ھے جس نے حد اعتدال سے بڑھ کر بازاری روش اختیار کر لی ھے - اس لیے اُن کے کلام میں متانت و ثقاهت نہیں پائی جاتی -

(۸) تشبیہات و استعارات میں نزاکت و لطافت نہیں -

(از صفحہ ۲۰۲ تا ۲۱۴ شعرالہند جلد اول) -

ان خیالات سے اگرچہ اهل لکھنؤ اور اُن کے متبعین کم و بیش اختلاف رکھتے هیں مگر اتنا اعتراف اکثر سنجیدہ صاحبان ذوق کی تحریروں میں ضرور پایا جاتا ھے :--

۱ - "وہ خیالات شیخ (ناسخ) کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل هو گئے جو در حقیقت احاطۂ غزل سرائی سے باھر هیں ؟ اس زور آزمائی کا نتیجہ یہہ هوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذهنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرّا هو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب فوت ھو کر ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد هو گئی جس پر نہ قصیدہ گوئی اور نہ غزل سرائی دو میں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی ھے - ناسخ کی تشبیہیں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی هیں اس پر بھی کبھی کبھی بھبتی کا اثر پیدا کر لیتی هیں -

(کاشف الحقائق مولنٰہ شمس العلما مولوی سید امداد امام اثر صفحات ۱۳۹ - ۳۳۸) -

۲ - بادشاہ (واجد علی شاہ) کی طبیعت تصنّع کو زیادہ پسند کرتی تھی ؟ یعنی برق و بحر و خواجہ وزیر جس رنگ میں ڈوبے

ہوئے تھے وہی رنگ بادشاہ کو پسند تھا مگر یہ رنگ غیر
طبعی ہونے کے سبب سے کبھی عام پسند نہیں ہوا -

(مضمون رسالہ ادیب الہ آباد بابت مارچ سنہ ۱۹۱۲ع
نوشتہ مولوی حیدرعلی طباطبائی) -

متذکرۂ بالا تمام اقتباسوں میں صرف خواجہ عشرت لکھنوی کی رائے ایسی ہے جس کا نقطۂ نظر شاہ اختر کی شاعری کے اُن اوصاف سے دست و بغل ہے جن میں ذرا سی گنجائش بھی اُس دوسرے پہلو کے نظر نہیں آتی جو بڑے بڑے شاعر میں بحیثیت انسان ہونا چاہیے - اُن کا بیانگ بلند یہ لکھنا کہ :-

۱ - "وہ زمانہ اُردو شاعری کے شباب کا تھا ؛ زبان کے قواعد ؛ محاورات کی پابندی ؛ متروکات کا لحاظ ؛ تثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرہیز کا دور دورہ تھا -

۲ - بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لیے ہوئے تھا -

۳ - طرز کلام زیادہ تر میر و مرزا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا تھا -

۴ - مصاحبین کی بیجا خوشامد سے پختہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی - مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا -"

میرے نزدیک حقیقت سے دور ہے -

اہل وقوف کے نزدیک شاہ اختر کی شاعری کے لیے یہہ کہنا کہ "اُن کا رنگ میر و مرزا سے ملتا جلتا ہے" مطبوعات شاعری میں یقیناً نا قابل قبول ہے اب رہا یہہ امر کہ وہ محاورات کے ایسے پابند تھے کہ کبھی غلطی نہیں کرتے تھے ؛ اس لحاظ سے مان لیا جائے کہ وہ بادشاہ تھے ؛ اور بمصداق ؛ هر عیب کہ سلطان بہ پسندد هنر است - خاموشی اختیار کر لی جائے تو دوسری بات ہے ؛ ورنہ اُن کا کلام پڑھ کر صاف معلوم

هوتا هے کہ وہ نہ تمام محاورات پر پوري طرح حاوی تھے نہ اُن کا کلام متروکات سے بے نیاز هے نہ اُن کي شاعري میں وہ پُختگي و سنجیدگی پائي جاتي هے جو کسي مشاق اور محتاط سخن گو کے کلام میں هوني چاهیے، اور نہ اُن کے اسالیب بیان سے بحیثیت مجموعي کوئي روحاني انبساط حاصل هوتا هے ۔ بلکہ صرف اس بنا پر کہ اُنھوں نے مثنویوں میں اکثر آپ بیتي بیان کي هے، پڑھنے والے اور سننے والے میں انساني همدردي کا فطری جذبہ ضرور بیدار هو جاتا هے ۔ غرض کہ اُن کي شاعري میں وهي ایک بات مابہ‌الامتیاز هے جس کو مؤلف خم خانۂ جاوید نے ظاهر کر دیا هے کہ "اُن کے مکتوبات وغیرہ کو دیکھہ کر ایک عجیب اور قابل قدر بات یہ معلوم هوتي هے کہ شاہ اختر هي ایک ایسے بے دھڑک اور سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنے تمام خفیہ رازوں، دلي بھیدوں اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپني خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ اُن خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے پیش کیا، اُن کي یہ اخلاقي جرأت واقعي اس خاص روش میں تمام شعراے ماضي و حال سے بڑھہ گئی هے" ۔ فی‌الحقیقت یهي وہ خصوصیت هے جس نے شاہ اختر کو شعرا کي صف میں شامل هونے کا موقع دیا ورنہ اُنھوں نے جس قسم کي سخن سرائي اور قافیہ پیمائی کي هے اُس کا اندازہ سطور آیندہ سے واضح هوگا ۔

اس سے میرا یہ منشا نہیں هے کہ شاہ موصوف کے کلام میں کوئي شعر یا کوئي حصہ، صحت لفظي، بر جستگي محاورات، پختگي بندش، اور سلامت بیان سے خالي هے، اس بحث کي مزید توضیح سے پہلے لکھنؤ کے عام مذاق شاعري کی بابت جو خاص بدگمانیاں پھیلي هوئي هیں اُن کے متعلق اپني رائے کا اظهار مناسب معلوم هوتا هے ۔ لیکن یہ خیالات زیادہ تر بیسویں صدي عیسوي سے پہلے کي شاعری کے آئینہ بردار هوں گے ۔

غالباً تاریخی حیثیت سے حسب بیان مؤلف شعرالہند دوئی سخن فہم اس کا منکر نہ ہوگا نہ لکھنؤ کی شاعری نہ جداگانہ وجود شیخ ناسخ کی بدولت قائم ہوا ، اور اُنھوں نے اسی ادعا پر اپنا تخلص ناسخ رکھا ۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ سے پہلے عام شعرا کے کلام میں جو رطب ویابس بھرا ہوا تھا اُن سب کو اُنھوں نے صاف کر کے ایک منجھی ہوئی زبان کا رواج دیا ۔ اس دعوی کی تائید و تردید کے لیے دو نتیجے قائم کی جاتی ہیں ۔

(الف) آیا ناسخ سے پہلے کسی شاعر نے وہ الفاظ اور وہ ترکیبیں استعمال نہیں کیں جو اُن کے قلم سے نقش پزیر ہوئیں ۔

(ب) آیا ناسخ کے زمانے میں وہ الفاظ مستعمل ہوتے تھے جن کو انھوں نے متروک کیا ۔ نتیجۂ اول کی تائید میں صاحب کشف الحقائق جلد دوم صفحہ (۱۳۸) میں لکھتے ہیں ، کہ :—

"شیخ امام بخش ناسخ زبان اُردو کے مصلح گزرے ہیں ، اس اعتبار سے اُن کا یہ تخلص نہایت حسب حال ہے ، شیخ نے اُردو کو خراش تراش کر ایسا درست کردیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ۔ ذوق نے صرف مضمون آوری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور اصلاح زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے ۔ مومن کو بھی اس جانب کچھ میلان نہ ہوا ، اور غالب نے تو فارسی کی اس قدر آمیزش کردی کہ اُردو پر زبان فارسی کا شبہہ ہونے لگا ، حضرت (غالب) نے فارسی الفاظ یا فارسی جملوں کو اس طرح باندھا کہ اُردو فارسی‌نما ہو گئی ۔ اس کے بر خلاف شیخ نے گو الفاظ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اُردو اُردو رہ گئی ، بلکہ

اگر فارسي جملے کو بهي اپنے کلام میں جگه دي تو فارسي کو اُردو کر کے دکها دیا، مثلاً شیخ فرماتے هیں ؛ :—

"سوالِ وصل پر هلدا پري رو تیرے ابرو کا
اشارہ هے براتِ عاشقاں بر شاخِ آهو کا"

اس شعر میں سوالِ وصل ، پري رو ، ابرو ، اشارہ ، اور براتِ عاشقاں بر شاخِ آهو - الفاظ فارسي اور جملہ و ترکیب کي تعریف میں آسکتے هیں ، کیا ناظرین میں کوئي ایسا ذوق نا آشنا هوگا جس نے یه الفاظ شیخ ناسخ کے سوا کسي دهلوي شاعر کے کلام میں نه دیکهے هوں مثلاً -

سوالِ بوسه کو ٹالا جوابِ چینِ ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آهو اس کو کہتے هیں

مؤلف کاشف الحقائق نے طویل تمہید کے بعد صرف ایک شعر مثال میں لکها هے ، اس لیے جواب میں بهي ایک هي شعر کافي سمجها گیا ورنه ایسے الفاظ اور جملے متعددون ناسخ و ذوق کے کلام میں بهي بکثرت پائے جاتے هیں - لہذا بوادید حالات اس امتیاز خصوصي کو قدر مشترک پا کر تنقیح اول کا فیصله شیخ صاحب کے خلاف کیا جا سکتا هے -

دوسري تنقیح اصل تنقیح هے اور اسي پر اختلاف و اتفاق کا دارومدار هے - جهاں تک راقم کي معلومات هے محاورات و الفاظ کے ترک و اختیار کي دو هي صورتیں دیکهي جاتي هیں ، اول یه که جب کسي قدیم لفظ یا محاورے کا استعمال کم یا زیادہ هونے لگتا هے تو فصحاے مستند و ممتاز اُن لفظوں کو اپنے روز مرہ سے خارج کرنے لگتے هیں یا داخل کرلیتے هیں مثلاً آوے ، جاوے ، هووے ، کهاوے ، لیویں ، دیویں وغیرهم کو سو سوا سو برس عام و خاص سب بے تکلف بولتے تهے ، بعد کے آنے والوں نے ابتداءً کبهي بهي الفاظ استعمال کیے اور کبهي ان کي جگه آئے ، جائے ، هوئے ،

کھائے، لے یا لیں - دے یا دیں بولنے شروع کیے - رفتہ رفتہ مُصلحین و محققین نے پہلے لفظوں کو بول چال میں کم دیکھہ کر اور ان قائم مقاموں میں کسی حرف کو مخل فصاحت نہ سمجھہ کر بولنا اور لکھنا شروع کردیا ؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبان ترک و اختیار کے عہد آخر میں قدیم الفاظ معدوم ہو گئے اور اُن کے بعد جو نسل پیدا ہوئی اُس نے اُن لفظوں کو ہمیشہ کے لیے مفقود سمجھہ کر یک قلم متروک کردیا - دیکھیے فارسی ترکیب کے ساتھہ نون کا اعلان فارسی قواعد کے خلاف تھا مگر متقدّمین اور متوسطین شعرائے اُردو نے بکثرت دین - و ایمان - زمین و آسمان ؛ فتنۂ هندستان وغیرہ کو باعلان نون لکھا ہے - چنانچہ ذوق و مومن اور غالب کے زمانے تک اس قسم کا استعمال رہا مگر متقدمین سے کم ؛ اُن کے بعد جو زمانہ آیا اُس میں اہل سخن نے متفق علیہ اس کو متروک سمجھہ لیا - اس خصوص میں ان حضرات کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے جنھوں نے نیچرل شاعری کی تائید و ترویج کے بعد متروک تراکیب و الفاظ کا استعمال جائز سمجھہ لیا ہے -

دوسری صورت یہ ہے کہ آنے والی نسل نے وہ قدیم الفاظ سنے ہی نہیں یا اُس کے صوبہ و شہرمیں ادبی حیثیت سے وہ الفاظ داخل زبان ہوئے نہیں ایسی حالت میں وہ شاعر اپنی سخن آفرینی میں اُن الفاظ سے کیا سروکار رکھہ سکتا ہے جن کا وجود اُس کے موجود ہونے سے پہلے معدوم ہو چکا ہو - معمولی تفحّص سے معلوم ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ کے آغاز شاعری میں ایسے بہت سے الفاظ جن کو متروکات ناسخ کہا جاتا ہے اُن سے پہلے ترک ہونے شروع ہوگئے تھے ؛ مگر چوں کہ شعرائے عصر نے اپنے ابتدائی کلام سے اُن الفاظ کو خارج نہیں کیا تھا ؛ اس لیے جا بجا اُن کے دیوانوں میں آئے ہے ؛ کھجلائے ہے ؛ وغیرہ الفاظ قائم رہ گئے ؛ اگر ان الفاظ کے ساتھہ وہ مترادف اور اختیار کردہ الفاظ اُن معاصرین کے کلام میں

کہیں موجود نہ ہوتے تو بے شک یہ خیال صحیح تھا کہ ان کے سوا دوسرے مجتہدان فن نے ان لفظوں کو ترک کیا ہے مگر جب کہ بکثرت یہ دیکھا جاتا ہے کہ متروک الفاظ فی صدی پانچ اور اختیار کردہ فی صدی پچاس مستعمل ہو رہے ہیں تو اس کا کامل یقین ہوجاتا ہے کہ شیخ ناسخ کے لکھے ہوئے الفاظ دوسرے معاصرین بلکہ متقدمین کے کلام میں بھی موزوں ہوتے رہتے تھے -

شیخ ناسخ لاهوری نسبت کے لحاظ سے شمالی ہند میں ایک نو وارد کی حیثیت رکھتے ہیں یہ مسلم ہے کہ وہ ساری عمر اسی صوبے میں رہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ خلاق مطلق نے اُنہیں جوہر قابل بلنے کی صلاحیت عطا کی تھی اور اسی طرح تمام وہ خوبیاں جو ایک مستند فاضل کو حاصل ہوسکتی ہیں بوجہ کمال اُن میں موجود تھیں - بایں همه یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اباً عن جد دوسرے شعرائے شمالی ہند کی طرح اُردو کو اپنی مادری زبان کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں - جن الفاظ کو آج غلط فہمی سے محض اُن ہی متروکات میں شامل سمجھا جارہا ہے وہ یقیناً اُن سے پہلے متروک ہونے شروع ہو گئے تھے ؟ اول تو اُنھوں نے وہ الفاظ جس کو شاہ حاتم کے زمانے سے اُردو داں بول رہے تھے سنے هي نہ ہوں گے اور جب سنے ہی نہیں تو ترک و اختیار کا احساس کیا ہوتا اور بفرض سنے بھی تو ایسے وقت میں سنے جب کہ عموماً دوسرے شعرائے مصلحین یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب ان محاورات و الفاظ کی ترویج موزوں و مناسب نہیں - اس بنا پر تنقیح دوم کا یہ فیصلہ قرین انصاف ہے کہ تنہا شیخ صاحب ہی محاورات متقدمین کے ناسخ نہیں ہیں بلکہ -

اُنھیں آشفتہ مزاجوں میں جواں میر بھی تھا

شیخ ناسخ کے کلام میں بھی بعض الفاظ اور اسالیب بیان ایسے ملتے ہیں

جن کو فی زماننا کوئي اُردو داں استعمال نہیں کرتے اور اُن کے زمانے میں بلکہ اُن سے پہلے بھي موجودہ عہد کے الفاظ مستعمل ہونے لگے تھے - مثلاً ' ولے (مگر) نلے (نیچے) ہووے (ہو) بن (بغیر) مثلاً حسب ذیل اشعار :—

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتي شب فرقت میں تو احساں ہوتا

سر سبز سبزہ ہو جو ترا دازمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

راز کا چاہیے عاشق کو چھپانا ایسا
دل میں ہو درد صنم ہاتھ میں قرآں ہووے

غیر کوثر کسي دریا کا میں سباح نہیں
بیشۂ شیر خدا بن کہیں سیّاح نہیں

لیکن اگر اس غلط فہمي کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو کہ ناسخ سے پہلے مگر ' تلے ' ہووے اور بن کے سوا دوسرے مترادفات کا استعمال ہي نہ تھا ' تو اس کا جواب بھي حسب ذیل اشعار سے ملے گا - ان مثالوں میں ولے اور بن کي مثالیں مخصوص نہیں لکھي ہیں کیوں کہ ایک متشکک یکساں وزن عروضي ہونے کي وجہ سے بے کي جگہ بن اور ولے کے بجاے مگر پڑھ سکتا ہے ' تاہم مگر کي مثال ایک قافیے سے لکھي جائے گي -

سپر - اثر کے قوافي کے ساتھ میر کا شعر ہے :—

روؤں تو آتشِ دل شمع نمط بجھتي نہیں '
مجھکو لے جا کے ڈبو دیویں مگر پاني میں

ھونے کي جگہ ھو ملاحظہ ھو :—

میر

قطرہ قطرہ اشکباري تا کجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ھو سو ھو

میر حسن

وھي ھو شہر اور وہ باغ و گلزار
وھي صحبت ھو اور وہ سات کے یار

میر عباس علی عرفاں دھلوي

یہ خال نہیں ابروے خمدار کے نیچے
زنگي کو قضا لائي ھے تلوار کے نیچے

خلاصۂ کلام یہ ھے کہ شیخ ناسخ اور اُن کے تلامذہ و متبعین بندش الفاظ، استعمال تراکیب اور اسالیب بیان میں کوئي ایسا خاص فرق نہیں دکھا سکے جس کي شان کم و بیش اُن کے متقدمین و معاصرین کے کلام میں دستیاب نہ ھو سکے، البتہ خارجي اور سطحي مضامین حسن و عشق کو رعایت لفظي اور دیگر صنائع و بدائع کے لزوم مالا یلزم سے ضرور اپنالیا* ھے اور یہي اُن کا امتیازي اور خصوصي رنگ مانا جا سکتا ھے - یہ بھي ظاھر ھے کہ چوں کہ اُن کے مستعملہ تلازمات صنایع بدایع زیادہ تر فارسي کي تقلید میں شروع ھوئے تھے اس لیے اُن کے زمانے میں بمصداق "کل جدید لذیذ" ھیں ایسي گل‌کاریاں چمنستان دھلي میں بھي پائي جاتي ھیں، لیکن اُن کي مقدار اُسي قدر ھے جس

---

*یہ لفظ دانستہ لکھا گیا ھے -

قدر که ناسخ ، وزیر ، برق ، رشک ، بحر وغیرهم کے مجموعۂ کلام سے صاف سلجھیدہ ، اور با اثر اشعار کے انتخاب کی مقدار -

چوں که یه مضمون صرف واجد علی شاہ کے متعلق لکھا گیا ھے اور موجودہ بحث شاعري لکھنؤ کے خصوصي رنگ کي وجه سے چھڑ گئي تھي اس لیے حضرات ناسخ وغیرہ کا تذکرہ اتني وضاحت سے کیا گیا ، اب اصل مدعا کي طرف متوجه ھونا چاھیے -

واجد علي شاہ اگرچه شیخ ناسخ کے انتقال سے ۸ - ۹ برس بعد تخت نشین ھوئے لیکن اُن کي پیدائش شیخ صاحب کی زندگي ھی میں ھو چکی تھي جبکه اُن کي طرز و روش کا اثر عام طور پر صوبۂ اودھ میں پھیلا ھوا تھا ان کے نامور تلامذہ اور جمله متقدین عموماً اُسی رنگ کو پسند کرتے تھے ، ایسي حالت میں شاہ اختر جان عالم ، (جن کے میلان طبع کي تصدیق ان کے مصاحب مولوي علي حیدر صاحب طباطبائي بھي فرماتے ھیں) کس طرح اس چھائے ھوئے رنگ سے بچ جاتے ، چنان چه وہ بھی زیادہ تر اُسي لفظي تکرار ، عامیانه جذبات ، عریان مضامین ، کے سبق دھراتے رھے - اب چند اشعار شاہ اختر کے درج کیے جاتے ھیں اس دعوی کو مد نظر رکھه کر پیش کیے جاتے ھیں که وہ متروکات اور پختگي بندش اور استعمال محاورات پر کس قدر حاوي و عامل تھے ، یه مضمون مثنوي حزن اختر کي تنقید کے سلسلے میں شروع کیا گیا ھے اس لیے نمونۂ اشعار بھي اُسي مثنوي سے منتخب کیے گئے ھیں :—

(۱) وزیرِ نبي شوھر فاطمه

حسین و حسن کا پدر مه لقا

وہ تھي لکھنؤ میں مع والدہ

سدا ، اب گئي سوے ملکِ بقا

نیک دل کي پھوڑے کی مانند ھے

گرفتار زنداں ترا رند ھے

(۲) جو کچھہ حد امکان میں آئے گا

بحکم گورنر وہ مل جائے گا

جہاں میں رھوں گا ثنا خوان ھوں

مگر قید غم میں پریشان ھوں

الٰھی ملیں مجھسے میرے حبیب

جو ھور دور وہ جلد ھوویں قریب

کہے نذر قیصر بھي گیارہ ھزار

کہ لیوے نہ رنج اُس کے دل میں قرار

ھے چھبیسویں آج ذیعقد کي

لکھے احباب کچھہ قید کے بعد کي

(۳) گل تازہ تجھسے ھے با آب و تاب

چمن بھي ھرا ھے، درختوں میں آب

ادب کر ادب کر خموش اخترا

کہاں تو کہاں یہ سخن مرحبا

بس اختر کر اب ترک طرزِ بیاں

ھوئي ختم یہ مثنوي گل ستاں

مندرجۂ بالا اشعار میں صرف خط کشیدہ الفاظ توجہ طلب ھیں ۔ اگرچہ آج کل کا ادبي مذاق اور ذوق سلیم ان اشاروں کے بعد کسي تفصیل و صراحت کا محتاج نہیں، لیکن اس خیال سے کہ شاید مضمون نگار اچھي طرح اُن شعروں کے محاسن کو نہ پہچان سکا ھو، تھوڑی سي وضاحت کي جائے گي - ان ابیات میں دو تین

قسم کے شبہات ہیں ؟ اول یہ کہ اُس زمانے کے مسلمہ قواعد و اصول کے خلاف قافیے لکھے گئے ہیں - دوم یہ کہ بعض الفاظ کی موزونیت اُردو شاعری کے شباب کے زمانے میں ایک پابند متروکات کے نزدیک قابل نظر ہے - سوم یہ کہ ایک پختہ کلام اور کہنہ مشق جس کو نکتہ چینیوں کا لحاظ بھی رہتا ہو ایسے الفاظ استعمال کرے جن سے باقی جملے نہ صرف بے ربط ہو جائیں بلکہ اُن سے مضحکہ خیز مہملیت ظاہر ہوتی ہو -

(۱) موجودہ زمانے کی بے راہ روی اور آزادی سے قطع نظر کر کے نصف صدی پہلے کے اساتذہ لکھنؤ بالعموم اس کے پابند نظر آتے ہیں کہ ؟ ہائے مظہرہ یا عربی کی تائے مدوّرہ کو الف سے ہم قافیہ نہیں کرتے - فاطمہ ؟ والدہ ؟ لقا اور بتا اگرچہ اُردو تلفظ میں ہم آواز ہیں لیکن شیخ ناسخ اور اُن کے تلامذہ اور دیگر اساتذہ نے اپنے زمانے میں اس کو جائز نہیں رکھا ؟ - اور بفرض کسی نے کہا تو غلط مانا گیا - اسی طرح مانند بفتح نون اول صحیح لفظ ہے اور رند یقیناً بکسر رائے مہملہ ہے - یہ اختلاف توجیہ غیر مسلم ہے - عوام کالانعام (جُہلا) البتہ مانند تو بکسر نون بولتے ہیں جن کی پابندی اخص الخواص (اور پھر بادشاہ) کے لیے کیسی ؟ -

(۲) امکان ؟ آسمان ؟ وغیرہ جیسے الفاظ کا نون بہ ترکیب اضافی اعلان نون کے ساتھ مدت سے واقفان فن نے متروک کردیا ہے - ؟

جہاں میں رہوں گا ثناخوان ہوں - اس مصرع میں اظہار نون ثنا خوان کے علاوہ ؟ ہوں روز مرہ کی پابندی سے آزاد ہے - صیغۂ استقبال کے ساتھ حال (ہوں) کا جوڑ اس وقت موزوں ہوسکتا ہے جب کہ وہ مضارع کا صیغہ ہو؟ اگر یہاں حال و استقبال کا اتصال

غلط نہ مانا جائے تو بھي فقرہ ناقص اور غلط ہو جاتا ہے اس کي صحیح نثر یہ ہو گي "میں جہاں رہوں گا ثناخواں رہوں گا یا ہوں گا" - اس مد میں ہوویں اور لیوے وہ الفاظ ہیں جن کو اُسي عہد کے متروکات میں شامل ہونا چاہیے - اسي سلسلے میں "لکھہ اخبار کچھہ قید کے بعد کي" والا مصرع کسی تاویل کو ذہن نشیں ہونے نہیں دیتا - کیوں کہ پہلے مصرع میں چھبیسویں کے لیے یقیناً کي (بجائے معروف) چاہیے مگر اخبار میں جس کو متفق علیہ ابتدا سے اب تک اہل لکھنؤ کے لیے بقاعدۂ جمع عربي مذکر ہونا چاہیے) فعل تانیث قابل غور ہے -

(۳) الفاظ کا توازن، اسالیب کا تناسب، فصاحت و سلاست کی روح ہے، مگر اس شعر میں

گُلِ تازہ نجھسے ہے با آب و تاب

چمن بھي ہرا ہے، درختوں میں آب

ذوق سلیم کو "چمن بھي ہرا ہے" کے بعد "درختوں میں آب" کا جملہ جس قدر نا مربوط معلوم ہو سکتا ہے اُس کی لذت اہل مذاق ہي سے پوچھی جائے - مزید تصدیق کے لیے پورے شعر کو ایک ساتھہ پڑھہ کر دیکھنا چاہیے کہ اس سلاست میں کیسی رکاوٹ پیدا ہوتي ہے، جس سے شاعر کا انتہائي عجز ثابت ہوتا ہے -

اکثر مثنویوں میں قافیہ پیمائي کے لیے برائے بیت الفاظ لائے جاتے ہیں، یہ عمل بھي اگرچہ شاعر کي کم مشقی اور عجز طبع کا نمایندہ ہے - لیکن معنوي حیثیت سے اُن بھرتی کے لفظوں میں شعر کي ترکیب کے ساتھہ کچھہ نہ کچھہ مناسبت ہوتي ہے - ذیل کے اشعار اس خصوصیت سے معرا ہیں -

ادب کر ادب کر خموش آخترا

یہاں تو کہاں یہ سخن مرحبا

اس شعر میں علاوہ اخترا کی رکاکت کے ' مرحبا کا کوئی محل نظر نہیں آتا - مرحبا تحسین و تعریف کے موقع پر مستعمل ہے جس کا ترجمۂ اُردو واہ وا ہے - اور یہاں تحسین کی جگہ تادیب کا موقع ہے ' اسی طرح منقبت کا پہلا شعر :—

وزیرِ نبی شوہرِ فاطمہ

حسین و حسن کا پدر مہ لقا

یہاں پہلا شبہ تو یہ ہے کہ باضافت توصیفی بدر مہ لقا ہونا چاہیے ' اور اگر اُردو کی عام بول چال یا مجبوری نظم کی خاطر فکِ اضافت جائز بھی ہو تو حضرت مولیٰ علی کو مہ لقا کہنا کم از کم اس موقع پر تو کوئی مناسبت نہیں رکھتا - تیسرا شعر

بس اختر کر اب ترک طرزِ بیاں

ہوئی ختم یہ مثنوی ' گُلستاں

یہاں بھی حذف اضافت کے علاوہ ایسی مثنوی کو گلستاں بتانا جس میں اول سے آخر تک حزن و ملال کی داستان لکھی گئی ہو کس قدر مُضحک ہے -

رسالۂ مخزن سنہ ۱۹۰۸ع کے مضمون میں جس بلند آہنگی سے شاہ موصوف کو پابند متروکات اور پختہ کلام وغیرہ بتایا گیا ہے اُس کا اندازہ مندرجۂ بالا انتخاب اشعار سے ہو گیا ہوگا جو بہت سرسری طریقے سے نقل کر لیے گئے ہیں ' اگر بالاستیعاب ساری مثنوی کے اشعار لکھے جائیں تو غالباً مثنوی کا نصف حصہ ایسا منتخب کیا جا سکتا ہے جن میں شاعرانہ خوبیوں کا کوئی لطیف اور دلچسپ پہلو بجز موزونیت کے نظر نہ آئے گا -

اس دعوے کا تصفیه که " شاہ اختر کا رنگ میر و مرزا سے ملتا جلتا ھے " اس سے بہتر نہیں ہوسکتا که مضمون نگار مخزن کے منتخب کردہ اور چیدہ اشعار لکھہ کر میر و مرزا کے بھی بعض اُسي قسم کے اشعار درج کیے جائیں اور آخري فیصله خود ناظرین پر چھوڑ دیا جائے -

شاہ اختر

بندے کو اُس کے عشق ھے ذات و صفات کا
مبدع حقیقة ھے وہ کل کائنات کا
پایا نه کوئي چاہ ذقن دیدۂ تر سا
چشموں سے بہت کھیلتے ھیں اشکوں کا چرسا
ناقوس برھمن سے صداے اذاں سنی
مسجد سے میں نے قصد کیا سومنات کا

فقط دل سے ھیں اعضاے رئیسه
کرے سلطاں نه آزادي کي خواهش

کچھه نہیں اختر مجھے عشق مجازي سے حصول
اب تو معشوق حقیقي سے ھے اپنا اختلاط
پر پتنگوں کے جلا کر صبحدم گُل کر دیا
بزم عالم میں یہي کیا شمع کا محصول تھا

بدن صاف په رنگیني دکھاؤ صاحب
قول هارے هو تو گُل چھلّوں کے کھاؤ صاحب
کہیں تار نظر بد نه نزاکت په پڑے
بال کی اوٹ میں جاتے هو تو جاؤ صاحب

کیا یہی وہ اشعار ہو سکتے ہیں جو میر و مرزا کے مذاق سے ملے جلے کہے جائیں بہر حال ان کے مقابل میں ہم طرح اور ہم قافیہ کیسے ؟ ہم مضمون اشعار بھی پوری طرح نہیں مل سکتے - لیکن باوجود اس کے میر و مرزا آفتاب و ماہتاب کی طرح آسمان شاعری پر چمک رہے ہیں - یہاں اُن کے چند معمولی شعر جو کسی حد تک ہم قافیہ و ہم مضمون ہیں لکھے جاتے ہیں —

میر

هر شي حیات کا هے سبب جو حیات کا
نکلے هے جي هي اُس نے لیے کائنات کا
اشجار هوویں خامه و آبِ سیه بحار
لکھنا نه تو بهي هو سکے اُس کي صفات کا
اُس کے فروغِ حسن سے جھمکے هے سب میں
شمعِ حرم هو یا که دِیا سومنات کا
عالم کسو حکیم کا باندها طلسم هے
کچھه هو' نه اعتبار بهي هو کائنات کا

کچھه بهي معاش هے یه کي اُس نے ایک چشمک
جب مُدتوں همارا جي دیکھنے کو ترسا

کیا کهیے کیا رکھے هیں هم تجھسے یار خواهش
اِک جان و صد تمنا اِک دل هزار خواهش

سب سے آئینه نمط رکھتے هیں' خوباں اختلاط
هوتے هیں یه لوگ بهي کتنے پریشاں' اختلاط

پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے
دیکھا تم کو بھي واہ وا صاحب

دل کا اُلجھنا اپنا ایسا نہیں کہ سلجھے
ھیں دام زلف میں ھم اُس کے اسیر صاحب

کس گلہ کا ہے پس از مرگ یہ عذرِ جانسوز
پاؤں پر شمع کے پاتے ھیں پرِ پروانہ

سودا

خال کا دانہ ملے ھے خرمن گوھر کے نرخ
حُسن گندم‌گوں کے مزرع کا یہ کچھہ محصول ھے

مرے سجود کي دیر و حرم سے گزري قدر
رکھوں ھوں دعویٰ ترے در پہ جبہہ سائي کا

دھن غنچے کا جب دیکھوں ھوں گوش گل پہ گلشن میں
تو اپنا درد دل کہنا کسي سے یاد آتا ھے

شاہ اختر کے زیادہ اشعار کا انتخاب تحصیل حاصل سمجھا گیا ؛ کیونکہ جن جذبات و خیالات کي روشني اُن شعروں میں نظر آ رھي ھے اُسي کا پرتو اوروں میں بھي ھوتا - سخن فہم ناظرین کے لیے اس روش کے اتنے ھي اشعار صحیح رائے قائم کرنے کے لیے کافي ھوں گے - ایسے شعروں کے انتخاب سے یہ غرض و غایت نہیں کہ سلطان عالم اختر زمرۂ شعرا میں کوئي حیثیت ھی نہیں رکھتے تھے ' بلکہ مدعاے اصلي یہ ھے کہ جس جامعیت و مشابہت کے ساتھہ ممدوح کو پیش کیا جاتا ھے وہ صورت اساتذہ کے ھم پہلو بنانے کے لیے کافي نہیں -

مثنوی حُزن اختر کو پڑھکر اُس کے حُسن و قُبح پر راقم سطور نے جو رائے قایم کی ہے اُس کي تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱—شاہ اختر کي پر گوئي بغیر کسي حجت و تاویل کے مُسلّم ہے -

۲—جہاں تک شعر میں وزن عروضي کا تعلق ہے اُن کی بندشیں صاف اور چست ہوتي ہیں عام شعرا کی طرح معمولي حروف کو بھي حتي الوسع ساقط الوزن ہونے نہیں دیتے -

۳—پورے کلام کو پڑھکر بآساني اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ فن شعر سے کافی آگاہي رکھتے ہیں اور جس شعبے میں قلم اُٹھاتے ہیں اُس کي اکثر اصطلاحیں اور خصوصیات نمایاں کرتے جاتے ہیں -

۴—اپنے خانگي اور پرائیویٹ حالات ' جن کو عموماً شعرا پوشیدہ رکھتے ہیں ' پوری جرأت اور کافي وضاحت کے ساتھہ بے تکلف سینے سے سفینے میں منتقل کر دیتے ہیں اور یہي وہ خصوصیت ہے جس میں کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھي اُن کا حریف نہیں -

۵—مضامین کے اعتبار سے اُن کے کلام میں کوئی جدت نہیں پائي جاتي وهي فرسودگي جن کے تذکرے صفحات ما سبق میں جا بجا ہو چکے ہیں بکثرت موجود ہے جس کو پڑھکر پڑھنے والے پر ایسا اثر نہیں ہوتا جیسا کہ قدرةً آپ بیتي کو سن کر ہونا چاهیے -

۶—رعایت لفظي اور استعارات و تشبیہات کي بلائیں اُن کے کلام پر اُسي طرح مُسلط ہیں جس طرح اُن کے معاصرین ؟ وزیر ؟ رشک ؟ برق اور امانت وغیرہ کے مجموعۂ سخن کو مغلوب کیے ہوئے ہیں -

مثنوي حزن اختر ۷۴ عنوانوں پر منقسم ہے ممکن ہے کہ یہ تعداد سنہ ۷۴ھ کي مناسبت سے مقرر کي گئي ہو - ان عنوانوں میں تین عنوان بخصوصیت شاعرانہ تلازمات اور تشبیہ و استعارات کے مرکز ہیں -

اول صفحہ (۱۰۱) پر "ساقي نامہ و حال بیوفائي مطلوب‌الہ
نواب خجستہ صاحب کربلائي۔"

دوم صفحہ (۱۱۳) پر "ساقي نامہ در انتظام جواھر گفتہ
بیوفائي چلد صاحبات محل در قید"

سوم صفحہ (۱۳۳) پر "گفتار در صرف زر خود بہ زن
ساقي نامہ بالتزام ساح -"

یہ تینوں مضامین علي‌الترتیب صفحہ (۱۰۱) سے شروع
صفحہ (۱۲۵) پر ختم ہوئے ھیں - پہلے عنوان میں گانے بجانے ا
راگ راگنیوں اور آلات سرود کا مذکور ھے ۔ مثلاً :—

صدا دے مغنّي کو اے غمگسار
کہاں ھے ذرا لاے اُس جا ستار

کدھر بین ھے اور کہاں دائرا
کہو چھیڑے قوال ڈھولک کو آ

صدا زیر و بم دي سنادے ھمیں
وہ رقاصۂ خوش دکھادے ھمیں

وہ مدھم وہ پنچم وہ دھیوت لگے
نکھاد فلک جس پہ تحسیں کرے

دوسرے عنوان میں چمن اور گل و ریاحین ۔ اور جواھرات
رعایت لفظی کے ساتھہ گنائے گئے ھیں مثلاً :—

چہک بلبل لکھنؤ باغ میں
ھُما میں دکھا فرق اور زاغ میں

کلي جب کھلے دست بقچہ کُھلے
زر و سیم میں روپے نسریں تلے

کدھر ھے وہ بیلا جو نوشہ بنائے
گُل اشرفي ھے کہاں نذر لائے

وہ الماس معني کو هووے چمک
که روشن رهیں رات دن سب فلک
تراشوں وہ فیروزۂ رنج کو
که قارون رکھے پلّے میں گنج کو

تیسرے عنوان میں هر قسم کے اسلحه کی تفصیل سے بزم سخن کو رزم‌گاہ بنایا گیا ھے :—

لگا مہرے تیغِ مضامیں میں زنگ - هوا نیزۂ فکر جس طرح سنگ
بنا خنجرِ دهن دس کي طرح - سپر فهم کی هے مگس کي طرح
طبیعت کي تیغ اصفهاني جو تهي - مضامیں کی سیفِ خواني جو تهی
وہ خاشاک کي طرح بد تر هوئي - یه بحرِ تقارب بهي خنجر هوئی

ان اشعار سے اس زمانے میں جب که اُن اشیاء کے دیکھنے والے تو درکنار سمجھنے والے بهي ناپید هوئے جا رهے هیں لغت نویسوں کے لیے ایک مفید ذخیرہ جمع هو سکتا ھے -

---

مثنوي حزن اختر جو الناظر پریس میں مولوی محبوب علي صاحب ناظم دائرہ ادبیه لکھنؤ نے چھپوائي ھے ' اُس میں مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم نے ایک مقدمه بهي لکھا ھے ' مولانا سے اس مثنوی کے نام کے متعلق تسامح هو گیا ھے ' یعنی وہ لکھتے هیں که '' یه مثنوي آج سے ۶۵ برس پیشتر ۱۲۶۶ هجري میں جب که بادشاہ قید فرنگ میں تھے تصنیف هوئي اور اس کے کئی سال بعد یعني ۱۲۷۶ هجري میں خود ظل‌الله جهاں پناہ کے مطبع واقع متیا برج میں چھپ کر اهل دربار اور بازار میں تقسیم هوئي '' - (صفحه ۷) -

اغلباً یه تسامح حزن اختر کے اعداد (۱۲۶۶) سے هوا ھے - حال آں که اِس سنه میں بادشاہ لکھنؤ هي میں سریرآرائے سلطنت تھے - لکھنؤ

سے اُن کی روانگی سنہ ۱۲۷۱ ھجری میں واقع ہوئی ہے پھر کس طرح سنہ ۱۲۶۶ ھجری میں مقید زندان فرنگ ہو سکتے ہیں چناں چہ مثنوی میں روانگی کا زمانہ اس طرح ظاہر کیا ہے :—

کہ اب میراں جی کا مہینا رقم
کہ جس میں ہوا حکم تھا یہ عَلَم
دلا ہفت و بستم تھی اُس ماہ کی
چھٹی سلطنت جس میں محمد شاہ کی
اکہتّر تھے سنہ بارہ سو پر زیاد
تو میری زباں سے رکھہ اب اس کو یاد

واقعہ یہ ہے کہ حزن اختر میں بادشاہ نے ۱۲۶۶ اشعار لکھے ہیں اسی مناسبت عددی سے اس کا نام حزن اختر رکھہ دیا ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے :—

رکھا حزن اختر جو شعروں کا نام - یہی نام رکھکر کیا ہے تمام

اس کے بعد ۱۲۷۴ ھجری تک وہ مقیّد رہے اور آزاد ہوکر ۱۲۷۶ ھجری میں اس مثنوی کو چھپوادیا - مزید اور مکمل ثبوت ذیل کی تاریخ سے ملتا ہے :—

حضرت سلطانِ عالم دیں پناہ
اَخترِ اوج و کمال و برتری
حزن اختر مثنوی تصنیف کرد
واقعی خوش داد دادِ شاعری
الغرض مطبوع شد اَحسن ز حکم
گفتمش تاریخ - حزنِ اختری
۱۲۷۶ ھ

اس تاریخ کے مصنف شاہی کاتب محمد عبدالرحمن صاحب احسن ہیں -

شاہ اختر کی فہرست تصانیف طویل الذیل ہے - جن کے موضوع بھی مختلف ہیں - صرف منظومات میں چھہ دیوان ' اور مثنویاں ہیں ' پھر مراثی کی تین جلدیں علیحدہ ' اور قصائد اُردو و فارسی کی متعدد جلدیں مزید بر آں - ظاہر ہے کہ ایسے سحر نویس کے کلام کا انتخاب معمولی کام نہیں -

اس وقت تک اُن کی غزلوں کے جتنے اشعار درج کیے گئے ہیں وہ خاص مذاق کی پسند کے موافق تھے - لیکن اب کچھہ ایسے اشعار بھی نقل کیے جاتے ہیں جو اپنی بعض خوبیوں کے لحاظ سے نہ صرف عام پسند کہے جا سکتے ہیں بلکہ اہل مذاق کی داد و تحسین کے جائز مستحق ہو سکتے ہیں :—

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا
آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

پڑا ہے پانؤں میں اب سلسلہ محبت کا
بُرا ہمارا ہوا - ہو بھلا محبت کا

ہاتھوں سے دل نکل کر بانسوں اُچھل پڑا ہے
ڈھونڈھیں فلک پہ قدسی کچھہ کھو گیا ہے میرا

بہت زخم جرّاح تو نے بھرے ہیں
مرے داغ کا کوئی مرہم نہ نکلا

جس کی جو بات ہے تا مرگ رہی اُس کے ساتھہ
ایک پیوند بھی اس جامے میں جوڑا نہ گیا

دل تلک چھین لیا وصل میں اے خانہ خراب
خارِ فرقت کے سوا اب نہیں گھر میں تنکا

مرہم کوئی لگائے جو دو چار داغ ہوں
اختر کا تن تو سر سے ہے پا تک جلا ہوا

وسعتِ خُلد سے بڑھکر ہے کہیں حُبِّ وطن
تنگیِ گور سے بد تر ہے فضائے غربت

ہم بھی شریک جلسۂ ابنائے دہر تھے
ٹھوکر نہ مار قبر پہ اے خوش خرام عیش

پوچھتا ہے جو کوئی مجھکو کہ ہمراہ ہے کون
شرم سے کہتے ہیں وہ ؟ ہے یہ ہمارا عاشق

اس دوستی میں ہو گئے اے مہرباں تمام
جب تک تم آؤ آؤ ہوئے ہم یہاں تمام

دکھاتے ہیں جو یہہ صنم ؟ دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی کو ہم دیکھتے ہیں

غمزہ و عشوہ و انداز و ادا نے مارا
ناتواں ایک یہ ؟ چو رنگ ہوا چار کے ہاتھ

نکالوں کس طرح دل سے تری مژگاں کے تیروں کو
مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

جان عالم اختر کے کمال شاعري کي بعض رَوشوں نے ایسے سخن گسترانه میداں دکھائے که اُن سے دامن کشاں گزر جانا ممکن نه ھوا اور مجبوراً — ع - رفته رفته می شود بسیار گو ' کا مصداق بننا پڑا - طوالت اگرچه مخل فصاحت ھوتي ھے لیکن بعض اوقات — ع - بنتي نہیں ھے بات مکرر کہے بغیر' اس خیال سے پھر اعادۂ سخن کیا جاتا ھے که شاہ جان عالم اختر اپنے واقعات و واردات کی بدولت جس قدر سوز و گداز اور جذبات روحاني کے ھم پہلو رہ چکے ھیں اُن کی مطابقت میں وہ اثرات اُن کے کلام سے مترشح نہیں ھوتے ' جن کا ظاھر ھونا مقتضاے نفسیات ھے ' بر خلاف اس کے تمام مجموعۂ کلام پر تعیش و اطمینان کا رنگ چھایا ھوا ھے - وہ واقعات بیان کرتے ھیں اور حد سے زیادہ وضاحت کو کام میں لاتے ھیں ' لیکن الفاظ میں ایسي تاثیر اور بیان میں ایسا سوز و گداز پیدا نہیں کر سکتے جس کو سن کر سننے والا بے چین ھو جائے - اس بنا پر کہنا پڑتا ھے که وہ صرف خارجي اور سطحی شاعري کے عَلَم بردار رھے - جذباتي اور داخلي شاعري میں سپر انداخته نظر آتے ھیں -

(باقی آیندہ -)

غیبی آواز

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

قسم اِس دل کی، چسکا ہے جسے گو بُت پرستی کا
مگر پہچانتا ہے جو مزاجِ اشیائے ہستی کا
قسم اِن تیز کانوں کی، کہ ہنگامِ قدح نوشی
مشیت کی زباں رہتی ہے جن سے محوِ سر گوشی
قسم اِس جان کی، خُو ہے جسے فطرت پرستی کی
گِنا کرتی ہے راتوں کو جو ضربیں قلبِ ہستی کی
قسم اُس نور کی، کشتی جو اِن آنکھوں کی کھیتا ہے
جو نقشِ پا کے اندر عزمِ رہرو دیکھ لیتا ہے
قسم اِس ذوق کی، حاوی ہے جو آثارِ قدرت پر
ضمیرِ کائنات آئینہ ہے جس کی بصیرت پر
قسم اِس حِس کی، جو پہچان کر تیور ہواؤں کے
سناتی ہے خبر طوفان کی طوفان سے پہلے
قسم اِن اُنگلیوں کی دوستو! جو دیکھ لیتی ہیں
چٹانیں چھو کے بے ترشے ہوئے اصنام کی نبضیں
قسم اِس آنکھ کی، جو درس بینش مجھکو دیتی ہے
زمیں کی بھاپ میں جو بجلیوں کو دیکھ لیتی ہے

قسم اِس فکر کی ، سوگند اِس تخئیلِ محکم کی
جو سنتی ہے صدائیں جنبشِ مژگانِ عالم کی
قسم اِس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے
اُٹھو، جاگو، بڑھو، مُنہ ہات دھو، آنکھوں کو مل ڈالو
خبر لو، انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو!
اُٹھو، وہ صبح کا غُرفہ کُھلا، زنجیر شب ٹوٹی
وہ دیکھو پَو پھٹی، غُنچے کِھلے، پہلی کرن پھوٹی!!

تبصرے

اُردو کے لغات

(از پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم - اے)

(۱)

هندستانی اکیڈیمی نے اپنی چند سالہ زندگی میں اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے اپنی ضرورت ، قیام اور بقا کا ثبوت پہونچا دیا ہے ۔ اس کا تماہی رسالہ هندستانی اس سلسلے کی ایک بین و نا قابل تردید دلیل ہے ، امید کہ یہ رسالہ نہ صرف اُردو ادب و تاریخ کے لیے مفید ثابت ہوگا بلکہ متحدہ هندستان کی مشترکہ زبان کے مسئلہ کے حل کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر رہے گا -

رسالے کے پہلے نمبر میں جتنے مضامین ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کو افادی نظر سے پڑھا جائے ، آج میں ان میں سے صرف ایک مضمون کے متعلق جو اردو لغت کے متعلق ہے کچھہ عرض کرنا چاہتا ہوں -

یہ مضمون لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد اردو جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی کا ہے ، - مسعود حسن صاحب کو ادبیات اردو سے جو خاص شغف ہے اس کا ثبوت ان کی شایع کردہ کتابوں اور رسالہ ادب کے صفحات سے ملتا ہے اُن کا اردو کا کتب خانہ بھی جیسا کہ مجھے خود اُن کی زبانی معلوم ہوا تھا اچھا خاصہ ہے ، اور اس مرتبہ انھوں نے اس میں سے اردو کے متعلق لغات کا حال لکھا ہے ، اگرچہ مضمون نا مکمل ہے ، لیکن چونکہ وہ تاریخ و سنہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے ، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تیرھویں صدی کے ربع اول تک کی تصانیف پر مشتمل ہے ، اس لیے ایک طالب علم اس کو اُس زمانہ تک کی لغاتی تصانیف کے لئے ایک مکمل فہرست سمجھہ سکتا ہے اور اسی

لیے میں اس میں اُن کتابوں کا اضافہ کرنا چاھتا ھوں جن کا اس میں ذکر نہیں ھے -

پروفیسر صاحب موصوف کي اس رائے سے مجھے کامل اتفاق ھے کہ اگر ایک ایک صاحب علم ایک ایک شُعبے کو لے لے تو بہت جلد اردو تصانیف کي ایک مکمل فہرست مرتب ھو سکتي ھے ؛ اُنھوں نے یہ تحریک ھي پیش نہیں کي ھے بلکہ اس مضمون کو لکھ کر اس طرف عملي قدم بھي بڑھایا ھے ؛ امید کہ دوسرے مستند بزرگ اس طرف توجہ کرینگے -

(۲)

خالق باري کے متعلق اس وقت تک جتنے مضامین شائع ھو چکے ھیں ؛ اُن میں سب سے بہتر و مدلل مضمون جناب پروفیسر محمود شیراني کا تھا جو پہلے رسالہ اردو میں شائع ھوا اور اس کے بعد اُن کي مشہور تصنیف "پنجاب میں اردو" کا جزو بن گیا ؛ - پروفیسر مسعود حسن صاحب نے خالق باری پر اظہار خیال کرتے ھوئے پروفیسر شیراني کے شکوک کی طرف بالکل توجہ نہیں کي ھے اور جب تک ان شکوک کو رفع نہ کیا جائے یہہ کتاب یقیني طور سے خسرو دھلوي کی نہیں کہي جا سکتی؛ مجھے امید ھے کہ ھمارے لائق ادیب بہت جلد اس طرف توجہ کرینگے -

اسي سلسلے میں دونوں فاضل استادوں نے عبدالواسع ھانسوي کي ایک کتاب کا ذکر کیا ھے؛ پروفیسر شیراني اس کو نصاب سہ زبان کے نام سے موسوم کرتے ھیں اور پروفیسر مسعود حسن نے اُسے غرائب‌اللغات کے نام سے یاد کیا ھے - پروفیسر مسعود حسن کو اگرچہ یہ کتاب نہیں ملي ھے ؛ لیکن چونکہ ایسے لغات کا پتہ چل گیا ھے؛ جن میں اس کا ذکر ھے ؛ اس لیے میرا خیال ھے کہ ان کا بتایا ھوا نام صحیح ھے -

لیکن میرے لیے ایک دوسری مشکل بھي آن پڑي ھے، وہ یہ ھے کہ میرے پاس ایک کتاب کا قلمي نسخہ ھے، جو خالق باري کے طرز پر لکھی گئی ھے، اور اُن کی ترتیب عموماً یہ ھے کہ پہلے وہ عربی، پھر فارسي اور آخر میں هندي یا اردو لفظ آتا ھے، اور پروفیسر شیراني نے خالق باري اور رسالہ سہ زبان کے الفاظ کا مقابلہ کرنے میں جو الفاظ دیے هیں، اُن کو دیکھتے هوئے یہ کہا جا سکتا ھے کہ یہ عبدالواسع هانسوي کی تصنیف نصاب سہ زبان ھے، مثلاً نصاب سہ زبان نے اعضائے انساني کے یہ هندي نام دیے هیں —

بیشاني — ماتھا، آنکھ — لہوچن
دیدہ — پتری، کان — سرون
گال — کپول، پہلو پسلی وغیرہ وغیرہ

اب میرے نُسخے میں بھي یہي الفاظ هیں :—

۱ — جبہ، بیشاني، ماتھا کہے
۲ — عین، چشم، لہو چن جان
۳ — قرۃ، مردمک، پتري جان
۴ — اذن، گوش سرون، پہچان
۵ — خد رخسار کپول جوکھ
۶ — جنب، پہلو، پسلي مان

میں نے طوالت کے خوف سے صرف ضروري مصرعہ هی نقل کر دیا ھے، اس کے علاوہ پروفیسر شیراني کا بیان ھے کہ:—

"متناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کر دیا ھے، مثلاً لغات اعضائے انساني، اجناس غلہ، میوجات، ترکاریہا و گلہا، ادویات وغیرہ وغیرہ، خاتمہ میں مصادر مشہورہ و غیر مشہورہ دے دیے هیں -"

میرا نسخہ بھي بالکل اسي طرح مرتب کیا گیا ھے ؛ اور اس کے آخر میں بھي مصادر ھیں ؛ اس لیے میرا پہلا خیال یہ ھوا کہ یہ وھي کتاب ھے ' لیکن میري حیرت کي انتہا نہ رھي جب میں نے کتاب کے اوپر ' سر ورق پر ؛ اور آخر میں اس کتاب کو مصادرالّلطائف کے نام سے موسوم پایا ؛ - میں نے سمجھا کہ ممکن ھے کہ اس کا نام غلط لکھہ گیا ھو ؛ لیکن خاتمے کي عبارت نے جو کاتب کے قلم سے ھے ؛ مجھے اور زیادہ مشبّہ بنا دیا ؛ - کہ اس میں اس کتاب کي تصنیف کا سہرا کسي دوسرے ھي " فاضل اجل " کے سر بندھا ہوا ھے ؛ وہ عبارت یہ ھے :—

" تمام شد نسخہ مصادراللطائف عرف جان پہچان تصنیف مُلّا پیر محمد صمداني قدس‌الله سرہ ' راقم‌الحروف احقرالعباد محمد عبدالغني عفي عنہ قوم انصاري معروف بہ لقب لاھوری ؛ ساکن سہسوان قاضي محلہ منجملہ محلات لاھوري محلہ ؛ جہت خواندن برخوردار طالب علم مظہر علي نوشتہ شد "

ان حالات میں ان دو صورتوں کے سوا کسي تیسری کي گنجائش نہیں ' یا تو یہ کوئي دوسري کتاب ھے یا پھر کاتب نے کتاب و مصنف دونوں کے نام غلط لکھہ دیے ؛ - بہر حال اس خیال سے کہ ناظرین ھندستاني میں سے کوئي صاحب اس پر مزید روشني ڈال سکیں اس کے متعلق کچھہ مزید معلومات بھی پیش کر دینا چاھتا ھوں -

اس کتاب میں ۳۰۹ شعر ھیں ' ان میں سے ۲۴۵ اشعار اسماے ذات و صفات کے متعلق ھیں اور ۶۴ اشعار میں مصادر ھیں - پہلے حصے کا پہلا شعر یہ ھے :—

صمد پاک نرنجن جان   نبي پیغمبر بسیٹھ بکھان

چونکہ ہر مصرعے میں تین الفاظ کا التزام رکھا گیا ھے اس لیے مصادر میں بھی یہ کیا گیا ھے کہ پہلے مصرعہ میں تین مصدر دیے ھیں اور دوسرے میں علی الترتیب اُن کے معنی ؛ مثلاً

کردن ، گفتن ، شنیدن ، جان

کرنا ، کہنا ، سننا ، مان

اسی سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ھے کہ پروفیسر شیرانی صاحب عبدالواسع کو عہد اورنگ زیب کا مصنف بتاتے ھیں ؛ پروفیسر مسعود حسن صاحب کوئی تاریخ نہیں دیتے البتہ یہ بتانے پر اکتفاء کرتے ھیں کہ وہ عجائب اللغات کی تصنیف کے وقت زندہ تھے ؛ - ان کے متعلق ایک مفصل مقالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی روداد سنہ ۱۸۸۷ع صفحہ ۱۲۱ میں شایع ہوا تھا ؛ لیکن افسوس کہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں - *

(۳)

ایک دوسری کتاب اللہ خدائی کا پروفیسر صاحب نے ذکر کیا ھے اور لکھا ھے کہ یہ نام مصنف نے خود رکھا ھے ، اور کریما و مامقیما اور خالق باری کی طرح اس کے ابتدائی یہ الفاظ نہیں ھیں - میرے پاس اس قسم کی ایک کتاب کا دریدہ ورق ھے ، جس کی ابتداء بالکل اسی طرح ہوتی ھے ؛ اور کیا عجب ھے کہ خالق باری کی طرح اس کا نام بھی اللہ خدائی ہو ، - اس کے ابتدائی شعر یہ ھیں :—

اللہ خدا کرتار - الخالق آفرینندہ سرجنہار

الرسول پیغمبر بسیٹھ - الاصحاب یاران مسینہ

الدنیا گیتی سنسار - الاحمق نادان گوار

الجنت بہشت سرگ - السقر دوزخ نرک

* میرا خیال ھے کہ اپنے پہلے شعر کی وجہ سے یہ کتاب صمد باری یا صمد نامہ کے نام سے مشہور ہو گئی ھے -

الیوم روز دیس - الشعر موی کیس

اللیل شب رات - القول گفتار بات

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس میں بھی عربی، فارسی اور اردو کی ترتیب باقی رکھی گئی ہے -

لیکن ان سب سے اہم چیز جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک اور ہی لغت ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی دریافت کی عزت مجھ ہی کو ملی ہے، اس وقت تک ہم کو جتنے لغت ملے ہیں، وہ سب کے سب ہندی سے متعلق ہیں پھر بعض مناسب الفاظ کی حیثیت سے مرتب ہیں جیسے صمد باری وغیرہ اور بعض صرف قافیہ کی رعایت سے لیکن جو لغت میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ عربی فارسی اور ہندی کا نہیں بلکہ عربی فارسی اور گجراتی کا ہے، دوسرے اس کی ترتیب صراح وغیرہ کے طریقے پر آخری حرف کے اعتبار سے کی گئی ہے، یعنی پہلے اُن الفاظ کو لکھا گیا ہے جو الف پر ختم ہوتے ہیں، پھر ب، پھر پ علیٰ هذا القیاس۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو بات ہے، وہ یہ کہ ترتیب میں عربی و فارسی کے الفاظ کو اصل لغت نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ گجراتی الفاظ کو، ان سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ہر لفظ کی تشریح سے حاشیہ بھرا ہوا ہے اور یہ حاشیہ تمام تر عربی میں ہے -

---

اردو کی پیدائش کے متعلق جو اسباب بیان کیے جاتے ہیں اُن کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو گجرات ہی کا صوبہ ہندستان کا وہ صوبہ ہے، جو سیاسی، مذہبی، اور تجارتی حیثیت سے مرکزیت رکھتا تھا، اس لیے میرا خیال ہے کہ اردو کی اولین بنیاد اسی صوبے میں ڈالی گئی - اور اس کے ثبوت میں میرے پاس بہت کچھ دلیلیں

موجود هیں جن کو کسي وقت مفصل طور سے پیش کروں گا ـ میرا خیال ہے کہ، مرثیہ مثنوي اور مذهبي شاعري میں گجرات کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے اور هندستاني اکیڈیمی کا فرض ہے کہ وہ اس کی حفاظت و اشاعت کا سامان کرے ـ

موجودہ نسخہ ۱۱۵۱ع کا لکھا ہوا ہے ' بدقسمتي سے نہ کتاب هي کا نام معلوم ہو سکا اور نہ مصنف کا ـ کاتب نے خاتمہ پر یہ عبارت لکھي ہے :—

"تم الکتاب بعون الله الکریم ' علی ید الفقیر شیخ عطاءالله بن شیخ مهران في رابع عشر من الجمادي الثاني سنه ۱۱۵۱ احدي و خمسون ومایة بعد الالف من الهجرة النبویه صلی الله تعالی علیه و صحبه اجمعین" ـ اسکے بعد فارسی کے چھہ شعر هیں ' جو بظاهر کاتب کي طرف منسوب کیے جاسکتے هیں ـ لیکن آخری شعر میں جو دعوی کیا گیا ہے وہ اس خیال کو مشتبہ بنادیتا ہے ' شک کي دوسری وجہ یہ بھي ہے کہ جو اشعار یہاں پر لکھے هیں ' وہ کاتب خاتمہ کتاب پر نہیں لکھتے ، اُن کے چند مقرر شعر هیں جو هر قلمی نسخوں کے مطالعہ کرنے والے کو بہت جلد یاد هو جاتے هیں ' اشعار یہ هیں :—

ختم مي گردو کتاب اے دوستاں
بے نظائر در فصول داستاں (دلستان)

گر خطائے رفتہ است اندر کلام
هست امیدم ز اخلاقِ کرام

کہ ببخشا یند از روي کرم
ننگرند اندر خطائے بیش و کم

الکماس دیگر است باصد رجا

از همه یاران با صدق و صفا

چون رسند این جا مرا یاد آورند

فاتحه خوانند و آنگه بگذرند

انچه آمد در ضمیرم اے کبار

وا نسودم حبۀ از صد هزار

یه کتاب ۷۱ اوراق پرمشتمل هے - هر صفحه پر نو مصرعے هیں لیکن بہت سے مصرعے حاشیه پر بهي ملتے هیں ، اس کے تمام اشعار کي موجوده مقدار تقریباً ۷۰۰ هوتي هے - هر لفظ کے متعلق عربي میں حاشیے پر تشریح کي گئي هے - شارح نے بعض جگه اپنا نام ابراهیم دیا هے - چند جگهوں پر حاشیه فارسي میں بهي هے -

اس لغت کو هندي یا اردو نه کهنے کا ایک بڑا سبب تو یه هے که اس میں جو الفاظ دئے گئے هیں وه تقریباً ۹۰ في صدي وه الفاظ هیں جو صاف گجرات میں بولے جاتے هیں - دوسرے شارح نے بعض جگه خود تشریح کردي هے که هندي میں اس کا دوسرا نام هے ، یہاں پر هم کو یه هرگز نه بهولنا چاهیے که اردو کا قدیم تر نام گجري ، گوجري یا بولي گجرات بهي هے ، اور اس لغت میں جو الفاظ هیں وه اسي گجري زبان کے هیں اس لیے في صدي بقیه الفاظ یہاں کے هندوؤں کي گجراتي میں نهیں ملتے اور اسے وه مسلمانوں کے اثر کا نتیجه بتاتے هیں -

اس کتاب کي ابتداء ان اشعار سے هوتي هے :—

باب الالف

الاله پرستیده پوجیا

المعلوم دانسته بوجهیا

المحمد ستوده بکهانیا

المعروف شناخته پچهانیا

اور خاتمه ان الفاظ پر هے :-

العطارد اشاد کاندهی

الهدوة باد گرد آندهی

الرمکة مادیان گهوری

الرداء چادر پچهوری

یه کتاب میرے ایک دوست مسٹر عبدالله عریضی بی-اے* کے کتب خانے میں هے جب میں نے اس صوبے کی ورناکولر سوسائٹی کے صدر دیوان بهادر دهرو صاحب کو یه کتاب دکهائی تو وه بهت خوش هوئے انکی تحریک پر میں اسے ادٹ کر رها هوں ؟ اور گجرات ورناکولر سوسائٹی اس کو شایع کریگی -

اس قسم کے دوسرے رسالوں پر اگر کبهی موقع ملا تو عرض کروں گا -

(٥)

تحفةالهند کے متعلق مجهے صرف اتنا عرض کرنا هے که آج سے برسوں پهلے علامه شبلی رح نے بهی اس کا ایک نسخه دریافت کیا تها

* کاش اکبر مرحوم زنده هوتے تو دیکهتے که لوگوں نے اُن سے سیکڑوں برس پهلے هی سے گاندهی و آندهی کا قافیه باندهه رکها هے -

اور اس پر الندوہ میں مضمون بھی لکھا تھا پروفیسر صاحب نے جس لغت کا ذکر کیا ھے - وہ یقینی اسی کا جزو ھے -

(۲)

یوروپین مصنفین کے متعلق اُنھوں نے لکھا ھے کہ ان کا ماخذ مولانا عبدالحق صاحب کا فاضلانا مضمون ھے ؟ - اس سلسلے میں ، میں اُن کی توجہ سر جارج گریرسن کی شائع کردہ "هندستان کی لسانی پیمایش جلد ۹ حصہ اول (Linguistic Survey of India) کی طرف مبذول کرانا چاھتا ھوں جہاں اُنھوں نے نہایت محنت سے اُن تمام کتابوں کو جمع کر دیا ھے جو اھل یورپ اور دوسرے لوگوں نے اس سلسلے میں لکھی ھیں ، اس طویل فہرست میں اُن کو بہت سے نام ملجائیں گے -

اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ھے کہ جب جہانگیر نے انگریزوں کو تجارت کی اجازت دیدی اور اُنھوں نے سنہ ۱۶۱۱ع میں سورت میں اپنا کار و بار شروع کیا تو مقامی زبان کو سیکھنے کے لیے سنہ ۱۶۳۰ع میں اُنھوں نے ایک لغت مرتب کیا جس کا حال گریرسن نے ان الفاظ میں بیان کیا ھے :—

"Mr. Quaritch, in his Oriental Catalogue published in 1887, mentions a Ms. Dictionary then in his possession (No. 34,724 in the Catalogue) which he doubtfully dates as "Surat about 1630."

This is a Dictionary of Persian Hindustani, English and Portuguese, and he describes it as a great curiosity as being the first work of its kind. It was probably compiled for the use of the English Factory at Surat. The Persian is given in Native and in Roman letters, the Hindustani in Gujrati and Roman letters. It is a small folio manuscript on Oriental tinted paper."

اُس کے علاوہ اٹھارہویں صدي کے بعض طبي لغات یا بحري لغات جو انگریزي ، لاطیني هندي (هندستاني) اور عربي الفاظ پر مشتمل هیں کتب خانةالاصلاح دیسنه (ضلع پٹنه) میں موجود هیں ، اگر میرا وهاں جانا هوا تو انشاءالله اُن کے متعلق مفصل طور سے کچھه عرض کر سکوں گا ۔

مجھے امید کامل هے که پروفیسر موصوف ان معروضات پر غور فرمائیں گے ممنون هے که اُردو زبان کے مختلف لغتوں کا جو گلدسته وه تیار کر رهے هیں ، اُس کي تعمیر و تکمیل میں یه چند پنکھڑیاں بھي کام آجائیں ۔

اردو لٹریچر کی تاریخ

(مصنفہ مسٹر رام بابو سکسینہ)

از مرزا احسان احمد، بی - اے ، ایل ایل ، بی (علیگ)

اس میں شبہہ نہیں ، کہ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھ کر ایک قابل قدر علمی خدمت انجام دی ، لیکن چونکہ وہ نقش اول تھا ، اس لیے اس میں اکثر خامیاں رہ گئیں ، یعنی اُردو شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی ؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے ؟ مُلکی اور قومی حالات نے اس پر کیا کیا اثر ڈالے ؟ خود اس نے ملک اور قوم کو کس حد تک متاثر کیا ؟ اس کے ارتقاے تدریجی کے کیا کیا دور ہیں ؟ اور ہر دور کی خصوصیات کیا تھیں ؟ اس نے کیا کیا قالب بدلے ؟ کیا کیا صورتیں اختیار کیں ؟ اِن سوالات کا جواب آب حیات سے بمشکل مل سکتا ہے ، حالانکہ یہی چیزیں اُردو لٹریچر کی تاریخ کا اصلی سرمایہ ہیں ، محض شعرا کے لطائف و ظرائف سے ایک نکتہ شناس نگاہ کو سیری نہیں ہو سکتی -

آب حیات کے بعد بھی جو اکثر تذکرے عالم وجود میں آئے ، افسوس ہے ، کہ ان میں بھی یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے ، یعنی تحقیق و تنقید سے بہت کم کام لیا گیا ہے ، جس کے بغیر کوئی تذکرہ تاریخی حیثیت سے قابل قدر نہیں ہو سکتا ، شعرالعجم کی امتیازی خصوصیت یہی ہے ، کہ بجاے لطائف و ظرائف کے اس میں خصوصیات شاعری اور ان تمام اسباب و علل پر جن سے شاعری متاثر ہوتی ہے ، زیادہ تر بحث کی گئی ہے ، چنانچہ اس کو پڑھنے کے بعد فارسی شاعری کے ارتقاے تدریجی کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے ،

اس بنا پر ایک ایسے تذکرے کي سخت ضرورت تھی جس میں اُردو لٹریچر کے عہد بہ عہد ترقي کا ہر ممتاز پہلو نمایاں کیا جائے ، اور شعرا کي خصوصیات کلام پر تنقیدي نظر ڈالي جائے ہم کو نہایت مسرت ہے ، کہ ہمارے فاضل دوست مسٹر رام بابو سکسینہ نے اس گرانقدر تصنیف میں اس کمي کي ایک بڑي حد تک تلافي کردي ہے -

یہ کتاب انگریزي میں ہے اور اس کے دو حصے ہیں ، جو ۱۹ ابواب پر مشتمل ہیں ، پہلے چودہ ابواب میں شاعري کے مختلف مدارج ترقی پر تحقیقي حیثیت سے نظر ڈالي گئي ہے ، اور نہایت مرتب طریقے پر عہد بہ عہد کی خصوصیات اور انقلاب و تغیّر کا تذکرہ کیا گیا ہے ، اس کے بعد تین ابواب میں اُردو نثر کي ابتدائي حالت اور اس کی عہد بہ عہد ترقیوں کا ایک مسلسل اور مربوط بیان ہے ، اٹھارویں باب میں اُردو ڈراما کي مختصر تاریخ ہے ، اور آخری باب میں اُردو لٹریچر کي ترقي اور کارناموں پر ایک عام تبصرہ کیا گیا ہے ، غرض پوري کتاب پڑھنے کے بعد اس امر کا کافي اندازہ ہو جاتا ہے ، کہ اُردو کي ابتدا کیونکر اور کب ہوئی ؟ اس نے کس ماحول میں پرورش پائي ؟ شاعري کے کیا کیا رنگ قائم ہوے ؟ ہر دور کي خصوصیات کیا کیا تھیں ؟ نثر کي ابتدائي حالت کیا تھي ؟ اس کے کیا کیا انداز بدلے ؟ علمي حیثیت سے زبان میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں ؟ غرض مسٹر رام بابو کے ، اس آئینہ تاریخ میں اُردو لٹریچر کے جمال ارتقا کے وہ مختلف جلوے نظر آسکتے ہیں ، جن سے اور تذکرے خالي ہیں -

تصنیف زیر تنقید کي ایک بڑی خوبي تسلسل بیان ، اور ترتیب خیال ہے ، جس کي وجہ سے اردو لٹریچر کے سلسلۂ تاریخی کي تمام لڑیاں سامنے آجاتي ہیں ، اور پڑھنے والے کو جس ترتیب کے

ساتھہ جس قسم کي معلومات کي ضرورت محسوس ہوتي ھے؟ اسي ترتيب کے ساتھہ اسي محل اور موقعے پر اسکو ملتي جاتي ھيں؟ اس خصوصيت کا صحيح طور پر اندازہ کرنے کے ليے ضروري معلوم ھوتا ھے؟ کہ جس طرح لائق مصنف نے مختلف ابواب کي تقسيم کي ھے؟ اس کو مختصر الفاظ ميں ظاھر کرديا جائے -

سب سے پہلے زبان کي تاريخ ابتدا پر بحث کي گئي ھے ' يعني اس کا اصلي منبع وجود کہا ھے؟ فارسي اور ديگر مغربي زبان نے اس پر کيا کيا اثر ڈالے؟ مولوي محمد حسين آزاد کے نزديک اُردو کا ماخذ برج بھاشا ھے' ليکن فاضل مصنف نے اس رائے سے اختلاف کيا ھے' اور يہ دکھلايا ھے' کہ اُردو کا گہوارۂ وجود در اصل وہ خاص ديسي زبان ھے' جو عام طور پر دلي اور ميرتھہ کے اکناف و حوالي ميں رائج تھی' برج بھاشا متھرا اور اُس کے قُرب و جوار ميں مستعمل تھي؟ علاوہ فارسی کے انگريزي اور پرتگالي زبانوں نے اردو کو ايک بڑي حد تک متاثر کيا' سنہ ۱۵۴۰ ع ميں پرتگاليوں نے ھندستان کے خاص خاص بندرگاھوں پر مستقل حيثيت سے قبضہ کرليا تھا' اور مشرق کے ممتاز تجّار ميں ان کا شمار ھوتا تھا' ملک کے اندر ان کي مختلف آباديان قائم تھيں' حکومت ' تبليغ مذھب اور تجارت کے تعلق سے ان کو عوام سے اختلاط اور راہ و رسم پيدا کرنے کا موقعہ ملا' سب سے پہلے پرتگاليوں نے ھندستان ميں مغربي چيزوں کو رو شناس کرايا' اس طور پر اردو لغت ميں خفيف رد و بدل کے ساتھہ بہت سے جديد الفاظ کا ذخيرہ جمع ھوگيا' مثلاً آلپين (Alpin) الماري (Almara) بوتل (Bottle) ارغنون (Organ)' کارتوس (Cartridge) صابون (Soap) کوچ (Sofa) توال (Towel) گارد (Guard)' بالٹي (Bucket)' کمرہ (Room) وغيرہ وغيرہ -

اس کے بعد فاضل مصنف نے اُردو لٹریچر پر ایک عام تبصرہ کیا ھے ' جس سے مختلف مدارج ترقی کا ایک اجمالی خاکہ نگاھوں کے سامنے آجاتا ہے ' جس کی تفصیل ابواب ما بعد میں کی گئی ھے ' اُردو شاعری کی عام خصوصیات پر بحث کرنے کے بعد اس کو مختلف دوروں میں تقسیم کیا ھے ' اور ھر دور کی خصوصیات پر محققانہ نظر ڈالی ھے ' دکن کے ابتدائی دور شاعری کے تذکرے کے بعد دلی کے دور شاعری کو لیا ھے ' اور اس کو تاریخی اصول پر مختلف حصوں میں تقسیم کیا ھے ' جو حسب ذیل ھے :—

پہلا دور — آرزو اور حاتم -

دوسرا دور — میر اور سودا -

تیسرا دور — مصحفی اور انشا -

چونکہ اس دور کے بعد شاعری کا مرکز لکھنؤ کی طرف منتقل ھو گیا ' اس لیے اس کے بعد تاریخی حیثیت سے لکھنؤ کے دور شاعری کا تذکرہ ضروری تھا ' جس کو فاضل مصنف نے حسب ذیل تقسیم کیا ھے :—

ناسخ اور آتش کا دور ' واجد علی شاہ کا دور -

چونکہ مرثیہ گوئی کو لکھنؤ کی سر زمین سے خاص تعلق رھا ھے ' اس لئے اسی سلسلہ میں فاضل مصنف نے ایک مستقل باب میں مرثیہ اور ممتاز مرثیہ گویوں مثلاً انیس ' دبیر وغیرہ پر تبصرہ کیا ھے -

نظیر اکبرآبادی اور نصیر دھلوی کو چونکہ کسی خاص اسکول سے تعلق نہ تھا ' اس لیے ان کی خصوصیات شاعری اور حالات کا تذکرہ ایک علیحدہ باب میں کیا گیا ھے -

اس کے بعد دلی کے خزاں رسیدہ چمنستان شاعری میں دوبارہ بہار آگئی ' اور کچھ ایسے ارباب کمال پیدا ھو گئے جن کی سحر طرازیاں

اُردو ادب کے لئے سرمایۂ ناز ھیں' اس لیے اس کو دلي کي شاعری کا چوتھا دور قائم کر کے لایق مصنف نے ممتاز ترین شعرا' مثلاً غالب' ذوق وغیرہ کا تذکرہ کیا ھے -

آخری دور کا تعلق رامپور اور حیدرآباد سے ھے' یہ زمانہ امیر اور داغ کي زمزمہ سنجیوں کا ھے' جن کي خاموشی کے بعد اردو شاعري میں ایک نئي تحریک کا آغاز ھوتا ھے' جس کے علمبردار آزاد اور حالي ھیں' جن کي شاعرانہ جدت طرازیوں کو لایق مصنف نے ایک علیحدہ باب میں دکھلایا ھے -

اس کے بعد اُردو نثر کا حصہ شروع ھوتا ھے' جس کي تاریخ ارتقا کے فاضل مصنف نے تین دور قائم کئے ھیں' پہلا ابتدائی دور جس کا خاص تعلق کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ھے' یعني جب انگریزوں کا تسلط ھندستان میں قائم ھوا' اور ان کو اغراض حکومت کے لیے دیسی زبان کي تعلیم و اشاعت کے طرف خاص توجہ کرني پڑي' دوسرا دور غالب اور سر سید احمد خان کا ھے' جب کہ اردو زبان نے ایک خاص علمي اور ادبی حیثیت اختیار کي' اور تیسرا دور سرشار اور سرور کا ھے' جب کہ اُردو ناول اور افسانہ نگاری کو ترقی ھوئي -

اس کے بعد لایق مصنف نے ایک مستقل باب میں اُردو ڈراما کي مختصر تاریخ لکھي ھے' اور آخري باب میں اُردو لٹریچر کي عام ترقی کا تذکرہ کیا ھے' جو در اصل ابواب ما سبق کا خلاصہ ھے -

اس تفصیل سے اب آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ھیں' کہ لائق مصنف نے اپنے موضوع بحث کے مختلف پہلوؤں کو کس حسن ترتیب کے ساتھہ پیش کیا ھے' یہ صرف ترتیب و تقسیم کي

خوبی کا نتیجہ ہے، کہ آخر تک پڑھنے والے کی توجہ ہٹنے نہیں پاتی، اور نہ اس کے دماغ میں کوئی انتشار پیدا ہونے پاتا ہے -

علاوہ حسن ترتیب کے اس تصنیف کی دوسری نمایاں خصوصیت تحقیق و تنقید ہے، جو در اصل اس قسم کے تاریخی تذکروں کی جان ہے۔ لائق مصنف نے صرف شعرا کے عام ذاتی حالات اور واقعات زندگی پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کی خصوصیات کلام پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ فاضل مصنف صرف افسانہ نگار نہیں ہے، بلکہ تنقیدی نظر بھی رکھتا ہے، ممکن ہے، کہ فاضل مصنف کی تمام رایوں سے کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ فاضل مصنف نے اس نازک فرض کو نہایت خوبی کے ساتھہ انجام دیا ہے، اور جس نکتہ شناسی کے ساتھہ اردو شاعری کے محاسن و معائب پر تنقید کی ہے، وہ موجودہ بزم ادب کی خاص توجہ کی مستحق ہے -

لائق مصنف کے نزدیک فارسی کی کورانہ بیہم تقلید نے اردو شاعری میں متعدد معائب پیدا کردیے، قدیم شعرا کے لیے یہ نا ممکن تھا - کہ وہ فارسی زبان کو بالکل نظر انداز کر دیتے، لیکن انہوں نے جوش تقلید میں اس حد تک غلو سے کام لیا کہ ہندستان کو بالکل بھول گئے، اور اپنی خاص انفرادی حیثیت قائم نہ رکھہ سکے، چنانچہ ہر ہر قدم پر فارسی شاعری کے دست‌نگر بن گئے، بہار کا منظر کھینچا ہے، تو وہی ایران کے گل و بلبل، شمشاد و قمری، نرگس و سوسن، سنبل و ریحان کا خواب دیکھتے ہیں، لیکن چمن زار ہند میں ان کو کوئی رنگینی نظر نہیں آتی، عشق و محبت کی بزم آرائی مقصود ہے، تو صرف لیلیٰ و مجنوں،

فرہاد و شیریں، کے پُر گداز واقعات ان کے حُسن خیال کی آرایش کا سرمایہ ہیں، ہندستان کے جانبازان محبت کا نام تک نہیں آتا، شجاعت اور بہادری کی مثالیں پیش کرنی ہیں، تو بجز رستم، افراسیاب اور اسفند یار کے اپنے ملک کے بہادروں کی مطلق خبر نہیں، نقاشی اور صنعت گری کا نمونہ دکھانا ہے، تو صرف مانی اور بہزاد کی مصوری ان کی تمام تشبیہات کا ماخذ ہے، عالم آب کا سماں دکھلانا ہے، تو صرف جیحوں اور سیحوں کی موجیں اُن کی چشم تخیل کے سامنے رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن گنگا اور جمنا کی روانی ان کی تخیلات میں کوئی تموّج پیدا نہیں کر سکتی، بلند پروازی کے جوش میں ان کو صرف کوہ لوند کی چوٹیاں نظرآتی ہیں، لیکن ان کی فکر ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیوں سے کبھی بھولکر بھی نہیں ٹکراتی، ہندستان کے بادشاہوں کو عدل و انصاف میں نوشیرواں سے، سخاوت میں حاتم سے، تزک و احتشام میں قیصر و سکندر سے تشبیہ دیجاتی ہے، غرض اردو کی قدیم شاعری کا جو کچھہ سرمایۂ خیال ہے، وہ صرف فارسی شاعری کی صدائے بار گشت ہے، اس غلامانہ تقلید نے اردو شاعری سے واقعیت کے عنصر کو بالکل فنا کر دیا، اور طبیعتیں صرف فرضی اور خیالی نقش آرائیوں کی خوگر ہو گئیں -

ان حالات نے اردو شاعری کو جادۂ اصلیت سے بالکل متجاوز کر دیا، شعریت کی روح فنا ہو گئی، ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین کے اعادۂ پیہم نے دل و دماغ کو جدّت، تنوّع، اور لطافت سے خالی کر دیا، ضائع و بدائع، دور از کار تشبیہات و استعارات، مبالغہ آفرینی، قافیہ بندی وغیرہ یہی چیزیں شاعری کا معیار کمال سمجھی جانے لگیں، دائرہ خیال صرف چند مخصوص مضامین تک محدود

ہو کر رہ گیا ، انداز بیان میں کوئی ندرت یا جدت باقی نہ رہی صرف ایک ہی ، موضوع تھا ، جس پر مختلف طریقوں سے طبع آزمائیاں کی جاتی تھیں ، ایک ہی خاکہ تھا ، جس کو خفیف ترمیم و تغیّر کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا ، ایک ہی شاہراہ تھی ، ایک ہی منزل تھی ، ایک ہی قسم کے مسافر تھے ، ایک ہی طرح کی رفتار تھی ، حالانکہ تخیّلات کی وسیع اور گونا گوں شاہراہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں ، پورا صحیفۂ کائنات معہ اپنی تمام لا زوال رنگینیوں کے سامنے تھا ، لیکن ایک دماغ جو مدت سے مصنوعی جذبات کے ادا کرنے کا عادی ہوچکا تھا ، اس پر جمال حقیقت کی شعاعیں کیونکر پرتو افگن ہو سکتی تھیں ، غرض فارسی کی تقلید کی بندشوں نے اردو شاعری کو کچھ اس طرح جکڑ دیا ، کہ اس کو اپنے فطری نشو و نما کے لیے مطلق موقعہ نہ مل سکا ، اور وہ تمام معائب جو اس قسم کی غلامانہ تقلید کے ضروری نتائج ہیں ، اس میں پیدا ہوگئے ، یعنی تصنع و تکلف ، تنگ خیالی ، ابتذال ، پستی ، لطیف اور بلند جذبات کا فقدان ، حقائق سے گریز ، مدافعانہ ذہنیت ، لفظ پرستی ، سطحیت وغیرہ جن کی وجہ سے اردو شاعری محض ایک بے حس اور بے جان مشین بن کر رہ گئی ، جس کی حرکت صرف چند پامال مقررہ قواعد کے بل پر قائم تھی -

یہ خیالات در اصل فاضل مصنف کے ہیں ، جن کو میں نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے ، مجھکو ان معائب کے وجود سے انکار نہیں ، تقلید اور کورانہ تقلید فی نفسہ ایک مبتذل حرکت ہے ، اس لیے اس کے اثرات و نتائج کا مبتذل ہونا ضروری ہے ، لیکن ہمارے فاضل دوست کی یہ شکایت صحیح نہیں ، کہ قدیم شعرا نے ” فارسی کی نامانوس اور شاندار ترکیبوں کے سامنے بھاشا کی

شیرینی اور نزاکت کو نظر انداز کر دیا ؟ ممکن ہے کہ فارسی شاعری میں اس قدر بلند اور شریفانہ جذبات نہ ہوں جتنا کہ عرب کی شاعری میں پائے جاتے ہوں یا اس میں عاشقانہ احساس کی اس قدر شدت اور گرمی نہ ہو جتنی کہ ہندی میں محسوس ہوتی ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ جہاں تک زبان کی شیرینی اور نزاکت کا تعلق ہے دنیا کی کوئی زبان مشکل سے فارسی کا مقابلہ کر سکتی ہے اردو شاعری میں جو کچھ شیرینی لطافت اور رنگینی ہے وہ صرف ذوق فارسیت کا پرتو فیض ہے البتہ غالب کی سی بعض طویل اور نامانوس ترکیبوں کے استعمال سے ضرور احتراز کرنا چاہئے مثلا

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اگر آیا کی جگہ پر آمد کر دیا جائے تو پورا شعر فارسی بن جاتا ہے مثلاً دور حاضر کے ایک مشہور بزرگ فن کا شعر ہے

گویا نسب فراق میں میں سر سے تا قدم
آئینۂ تحمل ایذائے درد تھا

اگر لایق مصنف کا منشاء اسی قسم کی نا ہموار اور نا موزوں ترکیبوں سے ہے تو بے شبہہ مجھ کو ان کی رائے سے اتفاق ہے اردو زبان کو عربی اور فارسی کے مغلق اور دقیق الفاظ و تراکیب سے جہاں تک ممکن ہو پاک کرنا ہمارے شعرا کا فرض اولیں ہونا چاہیے لیکن فارسیت کو قطعاً خارج کر دینا در اصل اردو شاعری کی رنگینی لطافت اور شیرینی کو غارت کرنا ہے -

جو لوگ فارسیت کا ذوق صحیح رکھتے ہیں ، ان کے کلام سے اس امر کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے ، کہ فارسی کی لطیف اور نازک ترکیبیں شعر میں کیا حُسن اور خوبی پیدا کر دیتی ہیں ، بعض اوقات ایک مختصر سی نازک ترکیب پورے شعر میں جان ڈالدیتی ہے ، مثلاً

لُٹا دے دولتِ کونین اور میرے لیے

بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے ،

غور کیجیے صرف ایک تبسمِ عاجز نواز کی پُر لطف ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو کس قدر پُر کیف اور دلکش بنا دیا ہے !

چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں :—

اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا ،

روکو نہ اپنی نعزشِ مستانہ وار کو ،

کرم کچھ آج ہے ساقی کا وہ طرب انگیز ،

کہ جرعہ جرعہ ہے موجِ ترنم سحری ،

ہم اس سے بے خبر نہیں ، کہ سادگی ، زبان کی ایک بڑی خوبی ہے ، لیکن ہم اُس کے قایل نہیں ، کہ جو الفاظ اور عام محاورے روزانہ گفتگو میں بولے جائیں ، وہی شعر میں بھی استعمال کیے جائیں ، شاعر عام سطح سے ایک بلند تر ہستی ہے ، اُس کے تخیلات غیر معمولی ہوتے ہیں ، وہ خشک فلسفیانہ تحریر نہیں کرتا ، اس کا مطمعِ نظر قلب انسانی کے لطیف احساسات کو مشتعل کرنا ہے جس کے لیے ضروری ہے ، کہ پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا جائے جو عام روش سے کسی قدر الگ ہو ، جس میں کوئی خاص طرفگی ہو ، کوئی خاص ندرت اور جدت ہو ، ورنہ وہ شاعر کہلائے جانے کا

مستحق نہیں ہو سکتا ، اس بنا پر اردو شاعري کے طرز ادا کی جدت اور لطافت کو اگر قائم رکھنا منظور ہے ، تو فارسي کي لطیف ترکیبوں سے کبھي کنارہ کشي اختیار نہیں کي جا سکتی لایق مصنف کے اس خیال سے بھي مجھکو اتفاق نہیں ہے ، کہ "قافیہ اور ردیف کي پابندیوں نے اردو شاعری کو مشین بنا دیا اور اُس کے دائرہ خیال کو محدود کر دیا " ۔

یہ تجربہ مغربي تعلیم کا نتیجہ اثر ہے ، مجھکو اس سے انکار نہیں ، کہ محض قافیہ کي رعایت سے شعر کہنا در اصل ذوق شاعری کو پست اور مبتذل کرنا ہے ، لکھنؤ کے قدیم شعرا کے دواوین اُٹھا کر دیکھیے تو ایک ہي قافیہ اور ردیف در تہن تین چار چار غزلیں تک ملیں گي ، لیکن ایک شعر بھي ایسا نہیں مل سکتا ، جس میں کوئي لطیف خیال یا کیفیت ادا کي گئي ہو ، اور آج بھي مشاعروں میں یہي تعریفیں کی جاتي ہیں ، کہ "کیا انوکھي ردیف ہے " ! کیا بولتا ہوا قافیہ ہے " ! اس طرح کي قافیہ پیمائي ہمارے نزدیک شعریت کے نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں ، اور نہ ہم فن عروض کی غیر ضروري اور مہمل بندشوں ، مثلاً ایطاے خفي اور ایطاے جلي وغیرہ میں پھنس کر خیالات کي فطري رو میں روکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ، لیکن ہمارے لائق دوست کو غالباً اس سے انکار نہ ہوگا کہ موسیقت اور ترنم شاعری کا ایک ضروری عنصر بلکہ جزولاینفک ہے ، روح کو نغمے سے جو خاص تعلق اور مناسبت ہے ، وہ محتاج بیان نہیں ، چونکہ شاعر کا اصل مقصد روح انساني کو مشتعل اور متاثر کرنا ہے ، اس لیے اس کے موزوں فقروں میں موسیقت کا ہونا ضروري ہے ، موسیقت صرف ایک ذوقي چیز ہے ، جو چند اجزا کی باہم ترکیب سے پیدا ہوتي ہے ، الفاظ سنجیدہ ہوں ، ان کي نشست و ترکیب

صحیح اور موقعے کے مطابق ہو، جس قسم کا خیال ہو، اسی کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب کیا جائے، ترکیبیں جو استعمال کی جائیں ان کے باہم دروبست میں چستی اور شگفتگی ہو، ان چیزوں کے ساتھ ساتھ قافیہ ایک بڑی حد تک ترنم اور موسیقت پیدا کرنے میں معین ہوتا ہے، بلینک ورس میں ممکن ہے، کہ شاعر کو اپنے اظہار خیال کے لیے زیادہ آزادی محسوس ہوتی ہو، لیکن بغیر قافیے کے شعر میں خوش نوائی اور خوش آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی، جو مسلمہ طور پر شاعری کا ضروری جزو ہے، یہ خیال بھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں، کہ قافیہ کی وجہ سے تسلسل خیال میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، ممکن ہے کہ یہ دقت زیادہ تر ان لوگوں کو محسوس ہوتی ہو، جو زبان پر کامل قدرت نہ رکھتے ہوں، لیکن قادرالکلام شعرا نے باوجود قافیے کی پابندی کے تسلسل خیال کے وہ نمونے پیش کیے ہیں، جن کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، میر انیس کے مرثیے، مولانا حالی کا مسدس، ڈاکٹر اقبال اور علامہ شبلی کی قومی تاریخی اور سیاسی نظمیں کیا اس الزام کی تردید کے لیے کافی نہیں ہیں؟ خود فارسی شاعری کو لیجیے جو اس بدعت کی موجد ہے، کیا تسلسل خیال اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے فردوسی کا شاہ نامہ دنیاے ادب کا اعلیٰ ترین شاہکار نہیں ہے؟ کیا قافیہ اور ردیف کی بندشوں کی وجہ سے حافظ، سعدی اور امیر خسرو عشق و محبت کی لطیف کیفیتوں کی مصوری میں کامیاب نہیں رہے ہیں؟ کیا قاآنی نے مناظر قدرت کی مصوری کے بہترین نمونے پیش نہیں کیے ہیں؟ کیا عمر خیام کی رباعیات میں حیات انسانی کے نکتہ ہاے لطیف کی جھلک نظر نہیں آتی؟ کیا اسرار و حقائق کے لحاظ سے مثنوی مولانا روم کے مقابلے میں انگریزی شاعری کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ ہمارے فاضل دوست

کے نزدیک انگریزی شاعری نے اس وقت ترقی کی ' جب اس نے قافیے اور ردیف کی پابندیوں کو ترک کر دیا ' لیکن ایران کے "رندان لم یزل" نے ان قیود کو مد نظر رکھتے ہوئے جس تلوع ' جس وسعت ' جس خوبی اور لطافت کے ساتھ مختلف اضافے شاعری پر اپنے گراں ارز نتائج افکار پیش کیے ہیں ' اس کی مثال دنیا کی کوئی شاعری مشکل سے پیش کر سکتی ہے -

ردیف سے گو کلام کا حُسن بڑھ جاتا ہے ' لیکن وہ ایک غیر ضروری قید ہے ' اس لیے اس کو ترک کر دینے میں شعریت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا ' البتہ وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر ہمارے نزدیک قافیہ کا وجود ضروری معلوم ہوتا ہے ' بغیر اس کے شعر نغمۂ بے آہنگ ہے لیکن ہم از کم ہم اتنی ترمیم ضرور چاہتے ہیں ' کہ قافیے کے متعلق جو بعض جزئی اور غیر ضروری قیدیں عائد کر لی گئی ہیں ' ان کو ترک کر دینا چاہیے ' قافیے کا اصل مقصد خوش نوائی اور ترنم آفرینی ہے ' اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے ' کہ دونوں قافیوں کے آخری حروف بھی یکساں ہوں ' مثلاً موجودہ اصول کے مطابق " حیات " کا قافیہ " نشاط " جائز نہیں ہو سکتا ' لیکن ہم کو اس سے اختلاف ہے ' ہمارے نزدیک دو ہم آواز الفاظ کا قافیہ جائز ہونا چاہیے ' کیونکہ اس حالت میں بھی ترنم قائم رہتا ہے ' اور ہم کو صرف ترنم سے تعلق ہے ' چنانچہ شعر میں حیات کا قافیہ " نشاط " یا " نخص " کا قافیہ " تجسس " یا " حفیظ " کا قافیہ " عزیز " باندھا جائے ' تو اس میں کیا نقصان ہے ' شعر کی موسیقیت اور خوش آہنگی میں کوئی فرق نہیں آتا ' اس ترمیم سے ایک طرف شعریت بھی قائم رہتی ہے اور دوسری طرف نسبتاً شاعر کو ذرا آزادی مل جاتی ہے ' بہر حال موسیقیت اور

ترنّم کو مد نظر رکھتے ہوئے قافیے کی بندشیں جو ضرورت سے زائد سخت ہیں ، اگر ہلکی کر دی جائیں ، تو یہ ایک قابل قدر اصلاح ہوگی -

مختلف اصناف شاعری پر لایق مصنف نے جو عام تبصرہ کیا ہے ، وہ اگرچہ مختصر ہے ، لیکن لایق توجہ ہے ، اُردو شاعری میں بہ نسبت اور اصناف سخن یعنی قصیدہ ، مثنوی قطعہ رباعی وغیرہ کے غزل کا سرمایہ بہت زیادہ ہے اور آج بھی اسی صنف سخن پر بکثرت طبع آزمائیاں کی جاتی ہیں ۔ اس کے متعلق مصنف نے شکایت کی ہے کہ غزل کا میدان کس قدر محدود ہے اور اس صنف میں کس قدر تصنع اور سوقیانہ پن پیدا ہو گیا ہے - افسوس ہے کہ غزل آج بھی ان معائب سے خالی نہیں -

لایق مصنف نے غزل پر ریویو کرتے ہوئے بہت زیادہ اختصار سے کام لیا ہے ، حالانکہ اس موضوع کی اہمیت کسی قدر تفصیل کی طالب تھی ؛ یعنی اس کے دکھلانے کی ضرورت ہے ، کہ تغزل کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں ؟ اس کے اصلی عناصر کیا ہیں ؟ کس قسم کے جذبات اس میں ادا ہونے چاہئیں ؟ زبان کس قسم کی ہونی چاہیے ؟ انداز بیان میں کن کن باتوں کا لحاظ ہونا چاہیے ؟ اور پھر اس معیار پر اُردو تغزل کے معائب و محاسن کا اندازہ کیا جائے اور اس سلسلے میں خاص طور پر شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی جائیں ، تا کہ لوگوں کو یہ صاف نظر آ جائے کہ ان کے سامنے جو چیز تغزّل کے نام سے پیش کی جا رہی ہے ، اس کو فی نفسہ تغزل سے کوئی تعلق نہیں ، بلکہ صرف الفاظ کا ایک نظر فریب طلسم ہے ، جو درد آشنا قلوب کے لیے اپنے اندر کوئی مستقل سامان لذت نہیں رکھتا -

غزل کا اصلی موضوع سخن عشق و محبت ہے ، اس لیے سب سے

پہلے یہ دکھانا ضروری ہے ، کہ امر عشق کی نوعیت کیا ہے ؟ اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہیں ؟

دلی کے شاعری کی خوبی اور لطافت کی خاص وجہ یہ تھی ، کہ اکثر شعرا بادۂ تصوف کے ذوق شناس تھے ، جیسا کہ لایق مصنف نے تصریح کی ہے ، اور اکثر صوفی منش شعرا کا نام لیا ہے ، مثلاً شاہ مبارک آبرو گوالیار کے مشہور صوفی شاہ محمد غوث کی سلسلۂ اولاد میں تھے ، شاہ حاتم ، جان جاناں مظہر ، شیخ شرف الدین ، مضمون ، میر درد ، اکابر صوفیہ میں تھے ، جن کے ذوق عرفان کی جھلک میر ، سودا ، اور اس دور کے دیگر شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے ، واقعہ یہ ہے کہ جوش و اثر اور سوز و گداز جو شاعری اور خصوصاً عشقیہ شاعری کی جان ہے ، اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا ، جب تک شاعر اس جرعۂ آتشین کا لذت شناس نہ ہو ، چونکہ تصوف کا اصل مقصد روح انسانی کا تزکیہ ، اور شریفانہ اخلاق کی تربیت ہے ، اس لیے اس کا ایک دوسرا لازمی اثر یہ ہوتا ہے ، کہ جب تک شاعری ان ارباب نظر کے ہاتھ میں رہتی ہے ، اس کا دامن ابتذال سے پاک رہتا ہے ، ان کی فکر و نظر کا مقصود شاہد بازاری نہیں ، بلکہ جمال حقیقی ہوتا ہے ، اس لیے ان کی زبان سے وہ الفاظ اور خیالات نہیں نکلتے ، جو پاکیزگی اور متانت کے خلاف ہوں -

یہ امر خاص طور پر غور کے قابل ہے ، کہ وہی تغزل جو دلی میں رہ کر احساسات کو برانگیختہ کرتا تھا ، لکھنؤ پہونچ کر آخر اس میں اس قدر ابتذال اور پستی کیوں آ گئی ؟ وہ اس قدر بد مزہ اور بے کیف کیوں ہو گیا ؟ حالانکہ علم و فضل کی کمی نہ تھی ، مربیان فن کا قحط نہ تھا ، فرمانروایان اودھ کی فیاضیوں کا یہ عالم تھا ، کہ شعرا دلی سے کھنچے چلے آتے تھے ، شاہی دربار ارباب سخن

سے بھرا پڑا تھا، در و دیوار سے شاعری کی صدائیں آرہی تھیں، ناسخ کی علمی قابلیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن ان کی شاعری کے متعلق فاضل مصنف کی یہ رائے ہے :—

"ان کی غزلیں بجز شاندار لفظی طلسم کاریوں کے صحیح اور پُر درد جذبات و احساسات سے خالی ہیں، تصنع و تکلیف ان کی نمایاں خصوصیت ہے، ان کے اعلیٰ ترین اشعار کو بھی پڑھکر دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، تشبیہات دوراز کار اور بے کیف ہوتی ہیں، عامیانہ خیالات کو پر شکوہ الفاظ میں ادا کرتے ہیں، لفظی صناعی اور زینت و آرائش کے سامنے جذبات کی لطافت کا بالکل لحاظ نہیں رکھتا، اکثر ناموزوں، ثقیل اور بھونڈے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں، جن کو غزل کی نزاکت برداشت نہیں کرسکتی . . . . . ."

امیر مینائی بھی بہت بڑے عالم تھے لیکن ان کی شاعری میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے -

اسی طرح امیر و داغ کا موازنہ کرتے ہوئے لایق مصنف نے امیر کی شاعری کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے، اس سے مجھکو بہت کم اتفاق ہے، ہمارے نزدیک دونوں میں وہی فرق ہے جو ایک مولوی اور شاعر میں ہوتا ہے، اس سے انکار نہیں، کہ داغ کے کلام میں بعض اوقات ابتذال کی بھی جھلک نظر آجاتی ہے، لیکن امیر نے اس سے کہیں زیادہ مبتذل اور عامیانہ خیالات ادا کیے ہیں، اگرچہ لایق مصنف کو یہ امر تسلیم ہے، کہ دونوں میں حدت، اور روحانی جوش و اثر کی کمی ہے، تاہم انکا فیصلہ یہ ہے کہ :—

"با وجود اپنی تمام کمزوریوں کے جہاں تک الفاظ کے شکوہ، انداز بیان کی سلجیدگی، اور احساس کی نزاکت کا تعلق ہے، امیر کا درجہ داغ سے بڑھا ہوا ہے۔ امیر فن عروض کے بہتر استاد تھے۔ ان سے نظم کی غلطیاں نہیں ہوئیں لیکن داغ سے اکثر لغزشیں ہو جاتی ہیں"۔

ہمارے لائق دوست کو غالباً مولانا روم کا یہ شعر معلوم ہو،

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات،
شعر میگویم بہ از قند و نبات،

فن عروض کی استادی، پر شکوہ الفاظ یا مولویانہ ثقاہت کا نام شاعری نہیں، اصل چیز احساس کی شدت اور نزاکت ہے، یعنی یہ دیکھنا ہے، کہ شعریت کی روح کس کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے؟ موازنے کے لیے ضروری ہے، کہ دونوں کے هم معنی اشعار لے کر ان کے معائب و محاسن پر بحث کی جائے، لیکن لایق مصنف نے صرف ایک مجمل رائے پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ فیصلے کے لیے وجوہ و اسباب کا دکھانا ضروری ہے۔ اس لیے هم بھی طوالت کے لحاظ سے اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث چھیڑنا نہیں چاهتے، لیکن اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں، کہ لکھنؤ کی غزل گوئی میں "نزاکت احساس" کی تلاش فضول ہے۔ البتہ دور حاضر نے چند شعرا ایسے پیدا کردیے ہیں، جن کی لطافت آفرینیوں نے تغزل کو معجزہ بنا دیا ہے، اس لیے وہ فاضل مصنف کی خاص توجہ کے مستحق ہیں، هم کو مسرت ہے، کہ لایق مصنف کی نگاہیں محض لفظی طلسم کاریوں کی فریب خوردہ نہیں ہیں، بلکہ لطیف احساسات

کو ڈھونڈھتی ہیں۔ اس لیے ہمکو امید ہے کہ آیندہ دور حاضر کے شعرا کے کلام پر ریویو کرتے ہوئے اُن کا یہ فرق جستجو قائم رہیگا، اور اپنی رائے کی تایید میں مثالوں سے احتراز نہ کرینگے، موجودہ تصنیف میں مثالوں کی کمی نہایت شدّت سے محسوس ہوتی ہے، اور ایک ادبی تذکرے کا یہ بہت بڑا نقص ہے۔

علاوہ اس کے لایق مصنف نے شعرا کے انتخاب میں اصول فن کا لحاظ نہیں رکھا۔ یعنی بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ کیا ہے، جو فن کے لحاظ سے کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے، کسی ملک یا قوم کی تاریخ ادب لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ جتنے شعرا گذرے ہوں، ان کا تذکرہ ضروری ہے، قطع نظر اس سے کہ انہوں نے فن ادب کو کوئی خاص ترقی دی یا نہیں، ایران نے ہزاروں لاکھوں شعرا پیدا کیے، لیکن شعرالعجم کے فاضل مصنف نے صرف انہی شعرا کو لیا ہے، جو کسی خاص طرز کے موجد تھے، یا جنھوں نے من حیث الفن شاعری میں کوئی قابل قدر اضافہ یا اصلاح کی، ہمارے لایق دوست کو بھی اسی اصول پر شعرا کا انتخاب کرنا چاہیے تھا، مثلاً فن کے لحاظ سے بے شبہہ ناسخ کا تذکرہ ضروری تھا، کیونکہ وہ ایک طرز خاص کے بانی تھے، اگرچہ وہ طرز اُردو غزل کے لیے پیغام موت تھا۔ لیکن اُن کے شاگردوں کے تذکرے کی کیا ضرورت تھی، وزیر، برق، رشک، وغیرہ نے شاعری کو کیا ترقی دی بجز اس کے کہ اپنے استاد کے رنگ کو اور بھی پست و مبتذل کر دیا، خواجہ آتش کی عظمت سے کس کو انکار ہے، لیکن صبا، خلیل، رند وغیرہ نے اُردو شاعری پر کیا احسانات کیے ہیں، جن کا تذکرہ کیا جائے، اسی طرح قلق، امانت، اسیر، درخشان، اختر کی وہ کون سی گران قدر ادبی خدمات ہیں،

جن کی بناء پر اُردو شاعری کی تاریخ ارتقا میں جگہ دی گئی ہے؟ تعجب ہے کہ لایق مصنف نے جہاں اور آرزو تک کا تذکرہ کیا، لیکن شعرائے دلی میں سے خواجہ میر اثر ایسے صاحب کمال کو بھول گئے -

فاضل مصنف نے علاوہ امیر و داغ کے اکثر ہمعصر اور ہم مذاق شعرا کا موازنہ بھی کیا ہے، اور ان کی خصوصیات کلام کو الگ الگ دکھایا ہے، مثلاً میر و سودا، ذوق و غالب، انیس ودبیر وغیرہ وغیرہ، اگرچہ اس کام کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت تھی، تاہم مختصر الفاظ میں جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، اس سے لایق مصنف کی نکتہ شناسی کا اندازہ ہوتا ہے، البتہ ذوق کی جس حد تک تعریف کی گئی ہے، اس میں ہمارے نزدیک کسی قدر مبالغہ ہے، ذوق نے جس حد تک زبان میں صفائی، سلاست اور روانی پیدا کی، اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اس لحاظ سے (جیسا کہ لایق مصنف کا خیال ہے) ذوق کو غالب پر ترجیح دی جائے تو چنداں بیجا نہ ہوگا، اگرچہ غالب کی اکثر غزلیں زبان کی سادگی اور حسن و لطافت کی اعلی ترین نظیریں ہیں، لیکن ذوق کے کلام میں اکثر عامیانہ اور مبتذل خیالات نظر آتے ہیں، جن سے غالب کا دامن شاعری تقریباً پاک ہے، واقعہ یہ ہے، کہ غالب کی سطح دماغی اس قدر بلند ہے، کہ وہاں تک ذوق کا وہم بھی مشکل سے پہونچ سکتا ہے، اس لیے دونوں کا موازنہ بالکل فضول ہے -

اب تک عام خیال تھا، کہ اُردو شاعری کے جدید دور مذاق کی ابتدا حالی، اور آزاد کے زمانے سے ہوئی، لیکن یہ کس کو معلوم تھا، کہ اس سے بہت قبل نظیر اکبرآبادی نے جدید ذوق شاعری

کی بنیاد ڈالدی تھی ' جس پر حالی وغیرہ نے بعد کو رفیع الشان عمارتیں تعمیر کیں ' چنانچہ فاضل مصنف نے گیارھویں باب میں نہایت خوبی کے ساتھہ اس قدیم شاعر کی خصوصیات شاعری کو بے نقاب کیا ھے ' اور یہ دکھایا ھے ' کہ صحیح معنوں میں اگر کوئی شاعر ھندستانی کہا جاسکتا ھے ' یعنی جس نے ھندستان کے طرز تمدن ' اخلاق و عادات ' اور مختلف قدرتی مناظر کی مصوری کی ' تو وہ نظیر اکبرآبادی کا وجود ھے ' انہوں نے بقول مصنف ' ھندستان کے اکثر میلوں اور تہواروں مثلاً ھولی ' دیوالی ' بسنت ' عید وغیرہ پر بھی نظمیں لکھیں ' جن سے ان کی مذھبی روا داری ' وسعت اخلاق ' فطرت شناسی ' اور جزرسی کا اندازہ ھوتا ھے -

اُردو شاعری کے جدید دور ترقی کا تذکرہ کرتے ھوئے ' فاضل مصنف نے تین اسکول قائم کیے ھیں ' ایک تو قدامت پرستوں کا گروہ ھے ' جو کسی جدید انداز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ' جو ایک قدم بھی آگے بڑھنا نہیں چاھتا ' جس کے نزدیک حیات انسانی کے زندہ حقائق کی مصوری جرم ھے ' جس کی شاعری صرف بزرگوں کی صدائے بازگشت ھے ' یہ لوگ در اصل شاعر نہیں ھیں ' بلکہ ایک قدیم طرز کی نقّالی کرتے ھیں -

اس میں شعرا کی وہ جماعت بھی ھے ' جو اگرچہ قدیم طرز سخن کی کامیاب پیرو ھے ' لیکن ایک ھی قسم کے خیالات اور مضامین کے اعادۂ پیہم نے اس کی شاعری کو نوجوان طبقے کے لیے بالکل بد مزہ اور بے کیف بنا دیا ھے ' ھمارے لائق دوست کا خیال ھے ' کہ واقعات کی موجودہ رفتار اور جدید مذاق شاعری کے سیلاب نے اِن قدامت پرست بزرگوں کو بہت کچھہ

سامنے سے ہٹادیا ہے ، جن کا وجود اردو لٹریچر کے لیے کسی حیثیت سے مفید نہیں ، لیکن افسوس یہ ہے کہ ملک میں اس جماعت کا اب بڑی عوام پر بہت کچھ اقتدار و اثر قائم ہے ، اور ہمارے فاضل دوست کو شاید یہ معلوم ہے کہ اسی مقدس گروہ میں وہ نفوس بھی شامل ہیں ، جو عام طور پر اقلیم سخن کے جم و کے سمجھے جاتے ہیں ، لیکن کم نظری اور تنگ خیالی کا یہ عالم ہے ، کہ ان کے آستانۂ قدس پر کبھی کوئی شوریدہ سر نہوا ہو کر کہتا ہے کہ ” ذرا گوشۂ عزلت سے سر باہر نکال کر افق حیات کی گوناگوں رنگینیوں کا نظارہ کیجئے “ تو اندر سے دردناک آواز میں جواب آتا ہے ، کہ ” ان کو ان کے ماتمکدوں میں رہنے دیجئے اور آہ و زاری و نالہ و بکا کرنے دیجئے ، اگر وہ آپ کی بزم عشرت میں شریک ہونا نہیں چاہتے تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے “ اس میں کیا نقصان ہے ، یہ فاضل مصنف کے غور کرنے کی چیز ہے !

دوسرا گروہ اس کے بالکل بر عکس ہے ، جو سر تاپا مغربی انداز خیال کا دلدادہ ہے ، جس کو قدیم طرز سخن میں کوئی خوبی یا لطافت نظر نہیں آتی ، جو بلا لحاظ اپنی قومی ضروریات یورپ کی کورانہ تقلید اور نقالی پر آمادہ ہے ، جو اسلاف کے کارناموں کو محض دفتر بے معنی سمجھتا ہے ، اور ہر چیز میں مغربیت کی شان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کو پروا نہیں کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے ، اس سے قوم کی روح کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے ، وہ کہاں تک خود ان کے دل و دماغ کی فطری صلاحیت کے مطابق ہے یا اس میں اس آب و ہوا کی بھی جھلک نظر آتی ہے ، جس میں اسی کی پرورش ہورہی ہے ،

لیکن اِن دونوں فرقوں سے الگ ایک تیسرا درمیانی گروہ ہے؛ جو خاص عظمت اور اہمیت کا مستحق ہے، کیونکہ اِس کا نقطۂ نظر دونوں طبقوں کے افراط و تفریط سے پاک ہے وہ ماضی اور حال دونوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے، وہ اِسلاف کے گراں بہا ترکۂ علمي کا قدر شناس ہے، لیکن اِسی کے ساتھہ موجودہ حالات واقعات زندگي سے چشم پوشي بھی نہیں کرنا چاہتا، وہ اُن تاجروں میں نہیں ہے، جو ایک ملک میں خریدتے ہیں اور دوسرے ملک میں لیجا کر بیچدیتے ہیں، بلکہ وہ ذوق شاعری کا معمار وصناع ہے، جس کی قوت متخیلہ زمین کی خام پیداوار لیکر اُس کو مختلف جدید اور خوبصورت سانچوں میں ڈھالدیتي ہے اور خود اپنی اور نیز اپنی ملک و قوم کے دل و دماغ کي ضیافت کے لیے نئے نئے سامان مہیا کرتي ہے، درحقیقت یہي وہ اسکول ہے، جو اُردو شاعری کا صحیح معنوں میں مدرس ہے، اور جس کے وجود سے اُردو لٹریچر کي آیندہ ترقی کی تمام اُمیدیں وابستہ ہیں -

اس تصریح کے بعد فاضل مصنف نے اِس اسکول کے چند ممتاز شعرا مثلاً حالی، آزاد، سرور، اکبر الہ‌آبادي وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، اور نہایت نکتہ رسی کے ساتھہ اُن کي خصوصیات شاعری پر تنقید کي ہے، اور یہہ دکھایا ہے کہ اِن ارباب فن کے ابر قلم کے رشحات سے اردو شاعري کا خزاں رسیدہ چمن کس طرح دفعتاً لہلہا اُٹھا، لیکن تعجب ہے، کہ اِس سلسلے میں فاضل مصنف نے علامہ شبلي کی جدید تاریخي، سیاسي اور اخلاقی نظموں کو نظر انداز کردیا، اگر چہ لائق مصنف نے علامہ مرحوم کے حالات میں اِس کي طرف معمولي طور پر اشارہ کردیا

هے لیکن حقیقت یہہ هے ، که نظمیں یہہ خاص اهمیت کی مستحق هیں ، حالی ، آزاد وغیرہ نے اردو شاعری کے دائرہ خیال کو جس حد تک وسیع کیا ، اس سے کون انکار کر سکتا هے ، لیکن سیاسی اور تاریخی نظموں کو غالباً سب سے پہلے مولانا هي نے ، رواج دیا ، علاوہ اس کے "طنز لطیف" کی آمیزش بھی مولانا هي کا کارنامہ فخر هے ، یہہ نظمیں در اصل اردو شاعری کے سرمایۂ سخن میں ایک قابل قدر اضافہ هیں ، جس کو اردو لٹریچر کا کوئي مورخ آسانی کے ساتھہ نظر انداز نہیں کر سکتا ۔

علاوہ تنقید کلام کے فاضل مصنف نے جس احتیاط اور ضروری اختصار کے ساتھہ شعرا کے عام حالات زندگي قلمبند کئے هیں ، وہ تصنیف زیر بحث کي ایک قابل قدر خصوصیت هے ، آب حیات کے مصنف کي طرح همارے لائق دوست نے شعرا کے لطائف و ظرائف پر اپنا وقت صرف نہیں کیا هے ، بلکه ان کي زندگي کے جستہ جستہ اور ضروري واقعات بیان کرنے کے بعد زیادہ تر اُن کي خصوصیات کلام پر بحث کرنے کي کوشش کي هے ، اور اکثر جدید معلومات کا اضافہ کیا هے ، مثلاً عام خیال هے ، که ولي نے سب سے پہلے اردو میں باضابطہ دیوان مرتب کیا ، لیکن فاضل مصنف نے اس شرف اولیت کي تردید کي هے ، اور یہہ دکھایا هے ، که ولي سے قبل گولکنڈہ کے اکثر سلاطین شاعري میں خاص شہرت رکھتے تھے -

اس تصریح سے آپ اندازہ کر سکتے هیں که لایق مصنف نے نه صرف قابل قدر معلومات کو یکجا کر دیا هے ، بلکه اکثر غلط فہمیوں کا ازالہ بھي کیا هے ، علاوہ شعرا کے حالات اور عام تنقید شاعري کے ، ایک خاص مسئله هے ، جس کے وجوہ و اسباب پر غور

کرنا اردو لٹریچر کے مورخ کا بہت بڑا فرض ہے ؛ یعنی دلی کو اردو کا وطن کہا جاتا ہے ؛ اس لیے فطری طور پر اس کی ابتدا وهیں سے ہونی چاهیے تھی ؛ لیکن بجائے اس کے دلی سے سیکڑوں کوس دور اردو شاعری کا مرکز ہم کو دکن میں نظر آتا ہے ؛ آخر اُس کی کیا وجہ ہے ؟ تعجب ہے کہ اتنے اہم مسئلے کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہو سکی ؛ لیکن فاضل مصنف نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے ؛ جس نے اس تصنیف کی تاریخی وقعت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے ۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے اُس دور کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے ؛ بہمنی سلطنت کا بانی ایک مشہور برهمن مسمی گنگو کا خاص چیلہ یا شاگرد تھا ؛ وہ جب تخت نشین ہوا ؛ تو اس نے نہ صرف اپنے گرو کا نام اختیار کر لیا ؛ بلکہ گنگو کو اپنا وزیر مال مقرر کر دیا ؛ گنگو سے پہلے برهمنوں کو حکومت میں کوئی دخل نہ تھا ؛ لیکن اس کی تقرری کے بعد سے شاهان دکن کے وزراے مال عام طور پر برهمن هونے لگے هندوؤں کی اس تقرری سے زبان کی ترقی میں فوری تحریک پیدا هوئی ۔ اور هندو مسلمانوں میں باهم دوستانہ تعلقات قائم هوگئے ؛ یہاں تک کہ ابراهیم عادل شاہ کے حکم سے حکومت کا حساب کتاب جو پہلے فارسی میں رکھا جاتا تھا ؛ برهمنوں کی زیر نگرانی هندی میں لکھا جانے لگا ؛ جس کی وجہ سے هندی سرکاری دفاتر کی زبان بن گئی ؛ اس لیے اس کی ترقی لازمی تھی ؛ جنوبی هند میں هندوؤں کی حیثیت نا قابل اعتنا نہ تھی ؛ مسلمان سلاطین اپنے قیام اقتدار کے لیے اکثر هندو حکمرانوں سے مدد لیا کرتے تھے ؛ اس سیاسی تعلق نے هندو اور مسلمانوں میں ایک عام اختلاط کی راہ کھول دی ؛ جس سے زبان کو معتدبہ فائدہ پہنچا ؛

غرض گولکنڈہ اور بیجا پور کی تین صدیوں کی خودمختاری کے دور میں ہندو مسلمانوں میں باہم جس قدر خوش گوار تعلقات قائم رہے ، ہندوستان کے کسی اور حصے میں یہ حالت نہ تھی ، یہ صرف اسی روا داری اور یگانگت کا اثر تھا - کہ ہندو کثیر تعداد میں سرکاری عہدوں پر مامور تھے ، اگر چہ اکثر خانہ جنگیاں پیش آتی تھیں ، تاہم سلاطین تجرات اور شاہان بہمنی کو بہ نسبت فرمانروایان دلی کے جن کے نظام حکومت کو شمال کی طرف سے اکثر حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا ، نظم سلطنت اور پُر امن ترقی کے لیے زیادہ مواقع حاصل تھے ، غرض ہندو مسلمانوں کے باہمی محبت آمیز تعلقات ، سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کی کیثر تعداد کی تقرری ، دفاتر سرکاری میں ہندی کا استعمال ، عام رواداری اور فراخ دلی ، یہ اسباب تھے ، جن کی اثر سے دکنی زبان کو غیر معمولی اشاعت و ترقی ہوئی ، اور اس نے بہت جلد ادبی حیثیت اختیار کرلی ، جنوبی ہند میں صوفیوں کی موجودگی نے اور بھی تحریک پیدا کر دی ، یہ لوگ مذہبی اور قومی تعصبات سے آزاد تھے ، عوام تک پہونچنے کے لیے وہ دیسی زبان کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے ، ان میں سے اکثر شاعر تھے ، اور دیسی زبان میں عوام کے خیال سے شعر لکھتے تھے -

فاضل مصنف نے اُردو نثر کے مختلف مدارج ترقی پر بھی محققانہ نظر ڈالی ہے ' تعجب کی بات ہے ' کہ باوجود اس کے نہ شاعری کا بازار چاروں طرف گرم تھا ' اور اُردو نثر کی ترقی صحیح معنوں میں حکومت برطانیہ کے تسلط تک رکی رہی ' یعنی جب تک انگریزوں نے اغراض حکومت کے لیے ملکی زبان کی اشاعت و ترقی

کی طرف خاص توجہ نہیں کی ' اس وقت تک اردو نثر کو خاص علمی یا ادبی حیثیت حاصل نہیں تھی ' صرف نثر مرصع ' نثر مسجع اور نثر عاری کا رواج تھا ' جن میں بجز لفظی تکلف اور آرائش کے اور کچھ نہ ہوتا تھا ' یہ نثر نہ تھی ؛ بلکہ نثر کے پردے میں ایک قسم کی شاعری تھی ؛ اس کی وجہ جیسا کہ فاضل مصنف نے بتائی ہے ؛ یہ تھی کہ در حقیقت وہ دور شاعری کا تھا ؛ فارسیت کا مذاق چاروں طرف پھیلا ہوا تھا ؛ یہاں تک کہ خط و کتابت بھی عام طور پر فارسی میں ہوتی تھی ؛ کتابوں کے مدحیہ دیباچے ؛ تقریظیں اور تبصرے ؛ یا شعرا کے تذکرے جو لکھے جاتے تھے ؛ ان کی زبان فارسی ہی ہوتی تھی ؛ شاعری گھر گھر پھیلی ہوئی تھی ؛ یہاں تک کہ اکثر خطوط نظم میں لکھے جاتے تھے ؛ شاعر ہونا فضل و علم کا ضروری جزو سمجھا جاتا تھا ؛ غرض شاعری کے ہنگامہ آرائیوں میں اردو نثر کی آواز دب کر رہ گئی تھی ؛ اور کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا -

اردو نثر کی ابتدائی تصنیف عام طور پر دہ مجلس خیال کی جاتی ہے ؛ جس کو فضلی نے سنہ ١٧٣٢ء میں محمد شاہ کے زمانے میں لکھا تھا ' یہ فارسی کی کتاب روضۃالشہدا کا ترجمہ تھا ؛ اس کے علاوہ دوسری قابل ذکر تصنیف نو طرز مرصع ہے ؛ یہ امیر خسرو کے قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے ؛ اس کی تکمیل میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے سنہ ١٧٩٨ء میں نواب شجاع‌الدولہ فرمانروائے اودھ کے عہد حکومت میں کی تھی ؛ لیکن جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے ؛ موجودہ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو نثر کی بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی ؛ چنانچہ محققین کو جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے ؛ اس سے اردو نثر کی تاریخ کا آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہونا معلوم ہوتا ہے ؛

جو نثر کے قدیم نمونے دستیاب ہوئے ہیں ، وہ سب مختصر رسالے ہیں ، جن میں گجرات اور دکن کے فقرا ، درویشوں اور صوفیوں کے حکیمانہ اقوال و امثال درج ہیں ، یہ رسالے زیادہ تر مذہبی کتابوں کے ترجمے ہیں ، جو اگرچہ علمی حیثیت نہیں رکھتے ، تاہم ان سے اس زمانے کی زبان کی نوعیت کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل ہو سکتی ہے ، شیخ عین الدین گنج الاسلام المتوفی سنہ ۷۰۵ ھ کے مذہبی رسائل ، معراج العاشقین ، جس کو خواجہ بندہ نواز حضرت سید گیسو دراز نے نشاط العشق سے ترجمہ کیا تھا ، چال ترنگ ، ملباس ، مولفہ شاہ میرانجی شمس العشاق ساکن بیجا پور وغیرہ اس زمانے کے انداز تحریر کے قابل اعتنا نمونے ہیں ۔

لیکن جیسا کہ لایق مصنف نے تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے ، موجودہ اردو نثر کی حقیقی تاریخ کا مطلع انیسویں صدی کا آغاز ہے ، جب کہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو صحیح طور پر '' بابائے نثر اردو '' کہے جاتے ہیں ، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے صدر یا پرنسپل تھے ، ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے ، اور سنہ ۱۷۵۹ع میں بمقام ایڈن برا پیدا ہوئے تھے ، سنہ ۱۷۸۳ع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے طبی مشیر کی حیثیت سے ہندستان آئے ، اور یہ محسوس کیا کہ اصول حکومت کے لحاظ سے انگریز افسروں کے لیے بہ نسبت فارسی کے ہندستانی زبان کے سیکھنے کی ضرورت زیادہ تھی ، چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے خود اپنا قدم اٹھایا ، اور دیسی لباس پہن کر مختلف صوبوں کی سیر و سیاحت کی جہاں ہندستانی بہترین صورت میں مستعمل تھی ، اور دیگر مشرقی زبانوں ، فارسی ، سنسکرت وغیرہ پر بھی کافی عبور حاصل کیا ، ڈاکٹر موصوف کی کامیابی نے کمپنی کے ملازمین میں ایک نئی روح پھونک دی اور ہندستانی زبان کے مطالعہ

ـ عام توجه پیدا ہو گئی ، لارڈ ولزلی نے اس تحریک کی محسوس کرکے کمپنی کے خزانے سے ڈاکٹر موصوف کی نہایت کے ساتھ مالی امداد کی اور سنہ ۱۸۰۰ع میں برٹش اروں کو ملکی زبانوں کی تعلیم دینے کی غرض سے ان کو یم کالج کی پرنسپلی پر مقرر کر دیا ، جہاں انہوں نے رہ کر نی زبان کی اشاعت و ترقی میں غیر معمولی سرگرمی سے کام خود بھی ہندستانی زبان میں قواعد ، علم‌اللسان ، لغت وغیرہ د کتابیں تصنیف کیں ' کالج میں ان کی سعی و کوشش کی ہندستانی اہل فن کا ایک مستقل گروہ جمع ہو گیا تھا ' ی نگرانی میں اردو ہندی کی ترقی میں سر گرم عمل تھا ' ، سے چند قابل ذکر افراد کے نام یہ ہیں ' میر امّن دہلوی ' ر علی حسینی ' سید حیدر بخش حیدری ' کاظم علی جوان ' لف علی ولا ' حفیظ‌الدین احمد ' اکرام علی خاں ' لال ، بینی نرائن ، مرزا علی لطف ـ

وہ ان دنیاوی اہل فن کے اس دور میں کچھ ایسے ارباب فضل و دا ہونے ، جن کی بدولت اردو میں مذہبی لٹریچر کا اضافہ لاً شاہ ولی‌اللہ رحمۃاللہ علیہ کے خلف ثانی شاہ رفیع‌الدین نے جید کا پہلا ترجمہ اردو زبان میں کیا ، مولوی شاہ عبدالقادر نے ۱۲ھ میں سلیس اور با محاورہ زبان میں دوسرا ترجمہ کیا ، اسمعیل دہلوی نے اکثر کتابیں اردو میں تصنیف کیں ، جن ب سے زیادہ مشہور تقویت الایمان ہے ـ

وہ تصانیف و تراجم کے اس زمانے میں لغت اور قواعد زبان پر کتابیں عالم وجود میں آئیں ؛ چنانچہ فاضل مصنف نے

اکثر یوروپین ارباب قلم کا تذکرہ کیا ھے ؛ جنھوں نے اس میدان میں خاص سرگرمي سے کام لیا -

عیسائي مبلغین کي جد و جہد سے اردو لٹریچر کو جو فائدے حاصل ہوئے ' ان کا بھي تذکرہ فاضل مصنف نے کیا ھے ' جس سے اندازہ ھوتا ھے ' کہ ان مبلغین نے اردو کي توسیع و اشاعت میں کس حد تک حصہ لیا ' مرزا محمد فطرت نے انجیل جدیدہ کا ترجمہ اردو میں کیا تھا ' جو کلکتے میں سنہ ۱۸۰۵ع میں شائع ھوا تھا ' ریورنڈ ایچ مارٹین نے سنہ ۱۸۱۴ع میں یونانی سے اس کو اردو میں منتقل کیا ' سیرام پور کے مبلغین نے سنہ ۱۸۱۶ع سے لے کر سنہ ۱۸۱۹ع تک اس تین سال کے زمانے میں پوري انجیل کا ترجمہ کر ڈالا -

اُردو نثر کے ابتدائي مراحل ارتقا کا یہ اجمالي خاکہ ھے ' جس کو فاضل مصنف نے پیش کیا ھے ' اس سے آپ اندازہ کر سکتے ھیں ' کہ نہ صرف قابل قدر معلومات یکجا جمع کر دیے گئے ھیں ' بلکہ ان حالات و اسباب پر بھي روشني ڈالي گئي ھے ' جنھوں نے اردو نثر کو ابتدا میں خاص طور پر متاثر کیا ' اور یہی اس تذکرے کی نمایاں خصوصیت ھے -

اس کے بعد فاضل مصنف نے غالب اور سر سید کے دور کی خصوصیات پر تبصرہ کیا ھے ' جو در اصل اردو نثر کي معراج ترقي کا زمانہ ھے ' یعني اُردو زبان اس قابل ھوئي ' کہ اس میں سنجیدہ علمي اور ادبي تصانیف کي جا سکیں ' اس دور کي ممتاز ترین ھستیاں جنھوں نے اُردو کو قدیم طرز انشا کے مہمل اور غیر ضروری تکلف و آرائش سے پاک کرکے علمي اور ادبی زبان بنایا ' سر سید ' آزاد ' حالي ' نذیر احمد ' شبلي ' محسن‌الملک ' چراغ علي ' سید علی بلگرامي ' سید حسین

بلگرامي ، عزیز مرزا ، وغیرہ ھیں ، جن کي خصوصیات انشا پردازي پر فاضل مصنف نے نکتہ شناسي کے ساتھہ ریویو کیا ھے ، غالب کو آج دنیا عام طور پر صرف ایک شاعر کي حیثیت سے جانتي ھے ، لیکن فاضل مصنف کي یہ رائے بالکل صحیح ھے ، کہ جس بنیاد پر ان بزرگان فن نے اردو نثر کي فلک بوس عمارتیں تعمیر کیں ، اس کا باني اول در اصل یہي یگانۂ روزگار تھا ، جس کے رقعات کے انداز تحریر کي سادگي ، رواني اور سلاست نے اردو نثر میں ایک جدید رنگ کی شاہ راہ کھول دي ، جس کا اثر حالي ، آزاد ، سر سید وغیرہ کے طرز تحریر میں نظر آتا ھے ۔

اس دور میں اُردو نثر کو جو غیر معمولي ترقي اور اشاعت حاصل ھوئي ، فاضل مصنف نے اس کے اسباب پر بھي کافي روشني ڈالي ھے ، مثلاً سید احمد دھلوي کي مذھبي اصلاحات اور اُن کے موافقین اور مخالفین کي باھمي بحث آرائیاں ، جن کي وجہ سے اکثر مذھبي رسائل اور کتابیں وجود پذیر ھوئیں ، چونکہ ان کا مقصد عوام کے دل و دماغ کو متاثر کرنا تھا ، اس لیے سادہ اور سلیس طرز تحریر اختیار کی گئي ، دوسرے سامان طبع کي فراھمي نے کتابوں کي تصنیف و تالیف میں خاص تحریک پیدا کر دي ، علاوہ اس کے اخبارات اور رسائل بھي عالم وجود میں آنے لگے ، سنہ ۱۸۳۲ع میں دفاتر سرکاري کي زبان بجائے فارسی کے دیسی زبان قرار دي گئي ، جس کي وجہ سے اردو کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ھو گئی ، لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے اردو لٹریچر کو متاثر کیا ، وہ دلي کالج کا وجود تھا ، جس نے نذیر احمد ، آشوب ، آزاد ، حالی ، ضیاءالدین ، ذکاءاللہ ایسے افراد کامل پیدا کیے ، جو جدید اُردو لٹریچر کے بانیان خاص میں شمار کیے جاتے ھیں ، دلي

کالج میں پہلے سے علاوہ مشرقي تعلیم کے مغربي علوم و فنون کي بھي تعلیم کا محکمہ قائم تھا سنہ ۱۸۲۷ع میں ایک انگریزی کلاس خاص طور پر قائم کیا گیا ، اگر چہ اُس وقت انگریزي زبان کے خلاف ایک عام تعصب کا جوش پھیلا ہوا تھا ؟ تاہم اس کا خیر مقدم امید افزا تھا ، چنانچہ سنہ ۱۸۳۱ ع میں تقریباً تین سو طلبہ اس کلاس میں داخل ہوئے ، اور رفتہ رفتہ انگریزي لٹریچر کے مطالعہ کا شوق عام ہوتا گیا ، اور طبیعتیں لفظي صناعیوں اور تکلف آرائیوں سے ہٹ کر سادگي ، روانی ، سلاست ، اور حقیقت سنجي کي طرف مائل ہو گئیں ، جو اس دور کا خاص کارنامہ فخر و امتیاز ہے ، سنہ ۱۸۴۲ ع میں ایک علمي انجمن قدیم دلي کالج سے متعلق قائم کي گئي ، جس کے روح و رواں پروفیسر رام چندر اور امام‌بخش صہبائي تھے ، اس انجمن کي بدولت اکثر کتابیں شایع ہوئیں ، جن میں سے زیادہ تر انگریزي تصانیف کے ترجمے تھے ، ان تراجم کي اشاعت نے اردو طرز انشا کو سادہ ، اور تصنیفی حیثیت سے کار آمد بنانے میں بہت زیادہ مدد دي ، سنہ ۱۸۶۴ ع میں ایک دوسري علمی انجمن دلی میں وجود پذیر ہوئي ، جس کے فاضل سکریٹري راے بہادر ماسٹر پیارے لعل آشوب تھے ، اس انجمن کي جد وجہد سے بھی اردو لٹریچر کو معتدبہ فائدہ پہونچا ، غرض یہ اسباب تھے ، جنھوں نے اردو لٹریچر کو اس قابل بنا دیا ، کہ آج اس میں علمي ، ادبي اور تاریخي تصانیف کا ایک گراں‌قدر ذخیرہ نظر آتا ہے -

فاضل مصنف نے سر سید ، آزاد ؟ حالي ، شبلي ، نظیر احمد وغیرہ کي خصوصیات انشاپردازي پر جو اظہار رائے کیا ہے ، ارادہ تھا ، کہ اس پر ذرا تفصیل کے ساتھہ ریویو کرتا ، لیکن افسوس ہے ، کہ

طوالت کے خوف سے اس وقت اس فرض کو انجام نہیں دے سکتا ، لیکن اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا ، کہ علامہ شبلی کے انداز تحریر کے متعلق انہوں نے جو کچھہ لکھا ہے ، اگر چہ وہ صحیح ہے ' لیکن علامہ مرحوم کی انشا پردازانہ حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت زیادہ مختصر اور نا کافی ہے ، سر سید بے شبہہ طرز جدید کے بانی خاص تھے ، لیکن ان کا طرز تحریر ضرورت سے زیادہ خشک ہے ، یہی حال حالی کا بھی ہے ، آزاد میں ضرورت سے زیادہ رنگینی ہے ، اور جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے ، اپنے رنگ خاص میں بے مثل ہیں ، لیکن وہ رنگینی سنجیدہ علمی مضامین کے لیے موزوں نہیں ، نظیر احمد کو زبان پر بے شبہہ قدرت تھی ' لیکن اکثر عامیانہ محاورے اور مبتذل فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں ، لیکن شبلی کا انداز تحریر "آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے ، افسوس ہے ، کہ فاضل مصنف نے مولانا کے اس وصف جامعیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کی ، اس کے لیے تفصیلی موازنہ اور مثالوں کی ضرورت تھی ، غالباً اختصار کے لحاظ سے فاضل مصنف نے اس طرف توجہ نہیں کی ، تاہم بحیثیت ناقد کے ان کا یہ ایک ضروری فرض تھا ، یعنی پہلے یہ دکھاتے کہ انشا پردازی کی اصلی خصوصیات کیا ہیں ' اور پھر اس پر نظر ڈالتے ، کہ وہ خصوصیات کس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں ، اس تفصیل سے صاف ظاہر ہو جاتا ، کہ شبلی کا طرز تحریر در اصل اردو انشا پردازی کی معراج ہے -

موجودہ اردو انشا پردازی میں جیسا کہ فاضل مصنف نے دکھایا ہے ، دو خاص جدید انداز نظر آتے ہیں ، ایک تو وہ رنگ ہے ، جس کی ابتدا مولانا ابوالکلام آزاد نے کی ، یعنی بڑے بڑے

پُر شکوہ عربی اور فارسی الفاظ اور طویل ترکیبوں کا استعمال ، لیکن ابوالکلام کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ھے ، اس لیے ان کا طرز تحریر ان معائب سے محفوظ رھا ، جو عام طور پر ان کی رنگ کی نقالی کرنے والوں میں نظر آتے ھیں ، اس رنگ کی پیروی کے لیے ذوق صحیح اور خاص قابلیت کی ضرورت ھے ، جو ھر شخص کا حصہ نہیں ، اس کے جواب میں کچھ لوگوں نے ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور ہندی الفاظ کی بھرتی شروع کر دی ؟ لیکن خوش قسمتی سے اردو لٹریچر کے اس قسم کے بھی خواھوں کی تعداد نہایت محدود ھے ۔

دوسرا انداز "تخئیلی نثر" کا ھے ، جس کو بعض اوقات "ٹیگورین انداز" کے نام سے یاد کیا جاتا ھے ، یہ صرف نثر نما شاعری ھے ، جس میں صرف خوبصورت اور پُر شکوہ الفاظ کی نمایش ھوتی ھے ، جو اکثر ابتذال کی حد تک پہونچ جاتی ھے ' مجھ کو فاضل مصنف کے اس رائے سے بالکل اتفاق ھے ' کہ یہ دونوں انداز اردو لٹریچر کے صحیح نشو و نما کے لیے مناسب نہیں ' ھر شخص ٹیگور اور ابوالکلام نہیں ھو سکتا ' اور نہ ھر بڑے آدمی کی خوامخواہ تقلید ضروری ھے ' ھمارے نزدیک اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ جس کی تقلید سے اردو لٹریچر کو گرانبہا فائدے پہونچ سکتے ھیں ' وھی انداز تحریر ھے ' جس کی بنیاد سر سید نے رکھی تھی ' اور جس کو شبلی کے معجز نگار قلم نے اٹھاکر آسمان تک پہونچا دیا اعتدال ھر چیز کے حسن کا اصلی راز ھے ؟ اس لیے ھمارے خیال میں اردو انشا پردازی کو ان دونوں انداز کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھنا بھی خواھان اردو کا سب سے مقدم اور ضروری فرض ھے ۔

اس سلسلے میں فاضل مصنف نے قدیم اُردو صحافت کا بھی تذکرہ

کیا ھے ' جس سے ظاھر ھوتا ھےکہ سنہ ۱۸۳۸ع میں آزاد کے والد باقر حسین نے دلي سے "اردو اخبار" کے نام سے ایک اخبار نکالا' جس میں زیادہ تر علمي اور ادبي بحثیں رھتی تھیں اور ذوق ' مومن' غالب وغیرہ کي غزلیں شایع ھوتي تھیں ' سنہ ۱۸۵۰ع میں منشي ھر سکھہ رائے نے لاھور سے کوہ نور کے نام سے ایک ھفتہ وار اخبار کي بنیاد ڈالي ' جس نے غیر معمولی اشاعت حاصل کي ' بعد کو ھفتے میں دوبار اور سہ بار شائع ھونے لگا ' اس کے بعد مختلف مقامات سے متعدد اخبار نکلنے شروع ھوئے' جن میں اودھہ اخبار کو خاص ' اھمیت حاصل ھے ' جس کو منشي نول کشور نے سنہ ۱۸۵۹ع میں جاري کیا تھا اس میں انگریزی جرائد کے اقتباسات اور خبروں کے ترجمے زیادہ تر شایع ھوتے تھے ' سنہ ۱۸۷۷ع میں سر زمین لکھنؤ سے اودھہ پنچ کا طلوع ھوا ' جس کی اشاعت نے اردو لٹریچر اور صحافت کو خاص طور پر متاثر کیا ' یہ خاص طور پر ظریفانہ پرچہ تھا ' جس کي زبان نہایت صاف ' سادہ اور شستہ تھي ' سنہ ۱۸۸۳ع میں ایک دوسرا اخبار "ھندستانی" نامی لکھنؤ سے شائع ھوا ' جس میں مسائل حاضرہ اور سیاسیات پر سنجیدہ بحثیں شایع ھوتي تھیں' سر سید کے قائم کردہ اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق ادبي اور علمي خدمت کے لحاظ سے خاص عظمت کے مستحق ھیں ' سنہ ۱۸۸۷ع میں پیسہ اخبار وجود پذیر ھوا ' جس کي اشاعت نے اردو صحافت کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ' علاوہ اس کے فاضل مصنف نے موجودہ زمانے کے جرائد ادبیہ پر بھي ایک سر سري نظر ڈالي ھے ' ضرورت تھي ' کہ اس موقعے پر ان رسائل کو ان کے ادبي فرائض سے ذرا آگاہ کر دیا جاتا ' کیونکہ صحیح ذوق ادب کي اشاعت بہت

کچھہ انہیں کي فرض شناسي پر منحصر ھے' لیکن افسوس ھے' کہ فاضل مصنف نے اس کو نظر انداز کر دیا' ممکن ھے' کہ آیندہ کے لیے اُٹھا رکھا ھو۔

ناول اور افسانہ نگاري کے دور پر ریویو کرتے ھوئے فاضل مصنف نے دکھایا ھے' کہ اُردو کے قدیم افسانے زیادہ تر ایراني افسانوں سے ماخوذ ھوتے تھے' مثلاً الف لیلہ ' داستان امیر حمزہ صاحب قرآن' طلسم ھوشربا' بوستان خیال' حاتم طائي' کے قصے باغ و بہار وغیرہ جن میں بجز دیوؤں' جادوگروں اور پریوں کے مافوق الفطرت واقعات اور دور از کار تخیلات کي سحر کاریوں کے سوداگري' جذبات صحیح کي ترجماني اور واقعیت کا عنصر نہایت کم ھوتا تھا' مرزا رجب علي بیگ سرور لکھنوي نے فسانۂ عجائب اور دیگر مختصر افسانے لکھہ کر کسي قدر ناول کو ترقي دي' لیکن اُن کا سرمایۂ خیال بھي وھي قدیم افسانے تھے' علاوہ اس کے زبان میں غیر معمولي تصنع و تکلف تھا' جو افسانہ نگاري کے لیے کسي طرح مناسب نہیں' ڈپٹي نذیر احمد نے البتہ جدید افسانہ نگاري کے میدان میں ایک بڑي حد تک کامیابي حاصل کي' چنانچہ ان کے افسانوں میں بجاے حیرت انگیز اور مافوق الفطرت واقعات کے موجودہ زمانہ کے تہذیب وتمدن' اور اخلاق و عادات کي تصویر نظرآتي ھے' زبان کي سادگي اور شیریني' انداز بیان کي دلاویزي اور لطافت نے ان کے فسانہ طرازي میں خاص حُسن پیدا کردیا ھے' سجاد حسین' جوالا پرشاد برق' احمد علي شوق کي خدمات بھي اس میدان میں کچھہ کم قابل قدر نہیں ھیں' لیکن اس وادي کے اصلي ھیرو پنڈت رتن ناتھہ سرشار اور عبدالحلیم شرر ھیں' جنھوں نے موجودہ مذاق کے رو سے اس فن کو غیر معمولي

ترقي دي، چنانچہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں وہ تمام خصوصیات موجود هیں، جو جدید انداز کے لحاظ سے ناول کے لیے ضروري هیں. یعني ایک متعین پلاٹ هو، اس کے مختلف کیرکٹر هوں، هر کیرکٹر کی خصوصیات علیحدہ اور متعین هوں، واقعات میں باهم ربط اور تسلسل هو، جو حالات بیان کئے جائیں، وہ خلاف قیاس اور فطرت انساني کے منافي نہ هوں، مشاهدہ صحیح اور عام تجربات زندگي پر مبني هو. انداز بیان پریشان گوئي اور بے راهہ روي سے پاک هو، زبان صاف، سادہ اور شیریں هو، شرر نے تاریخي ناولوں کا اضافہ کر کے ایک قابل قدر ادبي خدمت انجام دي، محض سوقیانہ گپ زني اور بازاری قصوں سے کوئي نتیجہ نہیں، همارے نزدیک ناولوں میں اخلاقی پہلو کا لحاظ ضروری هے -

دور حاضر میں بهي افسانہ نگاروں کی کمي نہیں هے، لیکن جیسا کہ لایق مصنف نے لکھا هے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز منشي پریم چند کا وجود هے، جن کے مختصر افسانے انداز بیان کي دلکشي، زبان کي سادگي، ترکیبوں کي فصاحت، واقعات کی مصوري، جذبات کي اندازہ شناسي کے لحاظ سے غیر معمولي قدر و عظمت کے مستحق هیں، همارے لائق دوست نے لکھا هے، کہ اُردو داں طبقہ کي بے اعتنائي اور ناقدر شناسي کي وجہ سے منشي پریم چند، کي توجہ حال میں هندي کي طرف مبذول هوگئي هے، اگر یہ صحیح هے، تو هم کو نہایت افسوس هے، اور یقیناً یہ اُردو لٹریچر کي بدقسمتي هے، اگر هم اس یگانۂ فن کے ادبي احسانات کے اعتراف سے گریز کریں، لیکن همکو منشي پریم چند کي عالي حوصلگي سے توقع هے، کہ وہ چند

نا اهلوں کے عدم اعتراف سے متاثر هو کر اُردو کو فراموش نہ کرینگے -

نیاز فتحپوری کی "نثر نما شاعری" پر لایق مصنف نے جو اظہار خیال کیا ھے ' وہ صحیح ھے ' یعنی یہ معلوم ھوتا ھے ' کہ کوئی شخص خواہمخواہ بلا وجہ تکلف کر رھا ھے ' تصنع و تکلف خواہ نثر میں ھو یا نظم میں ' تمام ادبی لطافت کو خاک میں ملا دیتا ھے ' فاضل مصنف نے نیاز صاحب کو کسی قدر تہذیب و اصلاح کا مشورہ دیا ھے -

اُردو ڈراما کے مختلف مراحل ارتقا پر بھی فاضل مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھہ تبصرہ کیا ھے ' جس سے ظاھر ھوتا ھے ' کہ اُردو ڈراما کی بنیاد "اندر سبھا" کے زمانے سے قائم ھوئی ' جس کو ناسخ کے شاگرد امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش پر لکھا تھا ' لیکن یہ صحیح معنوں میں ڈراما نہ تھا ' بلکہ محض نوابین اودھہ کی عیش پرستی ' اور اوباشانہ طرز زندگی کا نقشہ تھا ' تاھم عوام میں بہت زیادہ مقبول ھوا ' اور یہاں تک شہرت حاصل کی کہ جرمن زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا ' جو بمقام لیپزگ سنہ ۱۸۹۲ع میں شایع ھوا ' طالب بنارسی اور احسن لکھنوی نے ڈراما کے عام لہجے اور زبان میں بہت زیادہ اصلاح کی ' اب گفتگو کے لیے بجائے اشعار کے مقفی فقرے استعمال کیے جانے لگے ' اندر سبھا میں گفتگو تک اشعار میں ھوتی تھی ' بیتاب دھلوی نے راماین اور مہا بھارت لکھکر اس زمین کو اور بلند کیا ' جس کو آگے چل کر آغا حشر کے نکتۂ رس دماغ نے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ' اور اُردو ڈراما میں انگریزی ڈراما کے خصوصیات کی جھلک نظر آنے لگی ' لیکن اب بھی اُردو ڈراما بہت کچھہ اصلاح و ترقی کا محتاج ھے ' ابھی تاریخی ' سوشل اور علمی ڈراموں کی کمی ھے -

مجھہ کو فاضل مصنف کے ان خیالات سے اتفاق ھے ' کہ ڈراما لٹریچر کی ایک اھم شاخ ھے ' اس سے قوم اور ملک کی اصلاح میں بہت کچھہ کام لیا جا سکتا ھے ' اُردو ڈراما کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری ھے ' کہ یوروپین ڈراما کے بہترین شاھکار اور نمونے ترجمہ کے ذریعہ سے ملک عام پر لائے جائیں ' تا کہ لوگوں کو اس امر کا صحیح طور پر اندازہ ھو جائے کہ ڈراما کے عناصر اصلی کیا ھیں لیکن ھمارے لائق دوست کی اس رائے کا تسلیم کرنا مشکل ھے کہ "پردے کا وجود اُردو ناول اور ڈراما کی ترقی کے لیے سد راہ ھے ' کیونکہ جب تک مرد و عورت میں باھمی اختلاط کی آزادی نہ ھو ' اس وقت تک صحیح جذبۂ عشق کا امکان نہیں ' جس کی ڈراما میں ضرورت ھے " یہ ایک طویل بحث ھے ' جس کو ھم اس موقعے پر چھیڑنا نہیں چاھتے ' لیکن ھم صرف اتنا دریافت کرنا چاھتے ھیں ' کہ مرد و عورت کا وہ آزادانہ اختلاط جس کو لائق دوست ڈراما کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ھیں ' کس قسم کا ھونا چاھیے ' اگر اس سے وہ آزادی مقصود ھے ' جو مغرب کی جنس لطیف کو حاصل ھے ' تو ھم اس قسم کے آزادانہ اختلاط کے خیر مقدم کے لیے تیار نہیں ھیں ' جس سے اخلاق کا آئینہ غبار آلود ھو جائے ' اور نہ ھمارے نزدیک ناول اور ڈراما کی ترقی کے لیے اس قسم کی بے باکانہ راہ و رسم ضروری ھے ' فاضل مصنف نے اپنے تبصرے کے آغاز میں یہ تسلیم کیا ھے ' کہ قدیم ھندوستان میں ڈراما غیر معمولی ترقی کے درجے تک پہونچ چکا تھا ' جیسا کہ سنسکرت کے ڈراموں سے ظاھر ھوتا ھے ' کیا اُس زمانے میں مرد و عورت کی اخلاقی حالت اسی قدر پست تھی ' جیسا کہ یورپ میں نظر آ رھی ھے ' میں پردے کی موجودہ ضرورت سے زائد سخت بندشوں میں کچھہ ترمیم ضرور چاھتا ھوں ' لیکن جنس لطیف کو مغربی خواتین کا پیام آزادی دے کر اس کے آبگینۂ عصمت کو جو اس

کی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے ' ٹھکرانا نہیں چاہتا ۔

آخری باب میں اُردو لٹریچر کی عام ترقی اور کارناموں پہ نظر ڈالتے ہوئے فاضل مصنف نے جن فیاضانہ الفاظ میں اُردو زبان کی عام صلاحیت اور دیگر محاسن کا تذکرہ کیا ہے ' وہ یہ ہیں :—

" اُردو زبان میں مسلمہ طور پر بہت زیادہ وسعت ' شیرینی اور لطافت ہے ' یہ علم اور تہذیب کی زبان ہے ' جس میں ہر قسم اور ہر رنگ کے خیالات اور احساسات کے ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے .. ..

" قومی ترقی و اصلاح کے موجودہ دور میں اُردو جو ہندو مسلم اتحاد کا نشان ہے اس کی اہمیت کو گھٹایا نہیں جا سکتا ۔ "

" اُردو صحیح معنوں میں ہندستان کی عام مشترک زبان ہے ' کیونکہ تمام ہندستان میں اور ان مقامات میں بھی جہاں اُردو بولی نہیں جاتی عام طور پر سمجھی جاتی ہے ۔ "

یہ تنقید کسی قدر ضرور طویل ہو گئی ' لیکن تصنیف زیر بحث کی حیثیت اسی کی مقتضی تھی ' لیکن پھر بھی حقیقت یہ ہے ' کہ اکثر مواقع پر مجھ کو اختصار سے کام لینا پڑا ' تاہم جو کچھ عرض کر سکا ' وہ غالباً اس تصنیف کی نمایاں خصوصیات کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہو ' یہ تو ممکن نہیں ' کہ کوئی تصنیف ہر قسم کے معائب اور فروگذاشتوں سے قطعاً پاک ہو ' یا مصنف کی تمام رائیں مان لینے کے قابل ہوں ' لیکن جہاں تک موجودہ انداز تحقیق و تنقید کا تعلق ہے ' اِس کتاب کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

رسید کتب :-

سلطان شہید ـــ مصنفۂ محمود خاں محمود بنگلوري قیمت ۱۲ آنہ -

محمود خاں نمبر ۹۴ بلاکیلی روڈ کنٹونمنٹ بنگلور

اس میں سلطان ٹیپو شہید کے حالات زندگي، ان کے جنگي، علمي اور سیاسي کارناموں کا تذکرہ ھے - جا بجا ولولہ خیز نظمیں بھي درج ھیں -

شوپنہار ـــ دفتر ایوان اشاعت گورکھپور - قیمت ۱ روپیہ ۸ آنہ -

جرمني کے مشہور فلسفی شوپنہار کے حالات زندگي اور اس کا فلسفہ از جناب احمد صدیق مجنوں - بي، اے -

زھر عشق ـــ ایوان اشاعت گورکھپور مرتبۂ احمد صدیق مجنوں گورکھپوري - قیمت ۱ روپیہ ۸ آنہ -

نواب مرزا شوق کي مشہور و معروف مثنوي کو جناب احمد صدیق مجنوں گورکھپوري نے ایک عمدہ مقدمہ کے ساتھہ شایع کیا ھے -

تذکرۂ مشاھیر کاکوري ـــ مطبع اصح المطابع، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ - قیمت درج نہیں ھے - مولفہ مولوي حافظ علي حیدر صاحب علوي کاکوروي --

اس میں کاکوري کے علما ـ فقرا، شعرا اور مشاھیر اُمرا کے نثر و نظم و کلام کے انتخابات اور اُن کے تاریخي حالات درج ھیں -

تلاش حق جلد اول و دوم — جامعۂ ملیۂ اسلامیہ پریس
قرول باغ دہلی - قیمت فی جلد ۱ روپیہ -
مہاتما گاندھی کی خود نوشتہ سوانحعمری - مترجمہ ڈاکٹر
سید عابد حسین ، ایم - اے - پی - ایچ - ڈی -

ہندستانی فونٹیکس (بزبان انگریزی) —
مطبوعہ پریس ، دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد
باہمی - اسٹیشن روڈ ، حیدرآباد دکن - مصنفۂ ڈاکٹر
محی الدین قادری زور ایم - اے - پی - ایچ - ڈی -
قیمت ۲ روپیہ ۸ آنہ -
حیدرآباد کی اردو صوتیات پر مغربی انداز میں لکھی
گئی ہے -

گلشن گفتار — دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی
اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن -
مصنفۂ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی -
یہ شعراے اردو کا قدیم ترین تذکرہ ہے جسے سید محمد ،
ایم - اے نے ترتیب دیا ہے -

دولت غزنویہ — مولفہ مولانا محمودالرحمن ندوی
قیمت ۲ روپیہ -
شیخ علی بخش ، احمد بخش ، مالکان کتب خانہ دارالادب
اندرون بھاٹی دروازہ ، لاہور -
سلطان محمود غزنوی اور اُس کے جانشینوں کے ملکی اور
علمی کارنامے اور غلط فہمیوں کا ازالہ -

اداریہ

ھندستانی اکیڈیمی کے اراکین اور ممبروں کا انتخاب اگر چہ بالکل سرکاری طور پر ھوتا ھے، تاھم اِس کے اراکین یہ اچھی طرح سمجھتے ھیں کہ کسی علمی و ادبی ادارے کا سرکاری حیثیت میں محدود و مقید رھنا اُس کی حقیقی ترقیوں کے لیے کچھہ زیادہ مفید نہیں ھے، ملکی علم و ادب مشترکہ طور پر اھل ملک کی چیز ھے اور وہ اِس دولت عامہ و ملکیت مشترکہ پر اِسی طرح کا حق رکھتے ھیں جس طرح اکیڈیمی کی یہ کارکن جماعت، اِس لیے ھندستان اور خصوصاً صوبہ متحدہ کے تمام ارباب علم و فضل سے سرشتہ تعلقات قائم رکھنے اور اُن کے مفید مشوروں سے اکیڈیمی کو مستفید بنانے کی غرض سے اکیڈیمی کی مجلس منتظمہ نے یہ تجویز کی کہ اکیڈیمی کی جانب سے ایک سالانہ ادبی کانفرنس منعقد کی جایے جس میں اُردو اور ھندی کے ماھرین علم و ادب یکجا ھو کر دونوں زبانوں کے وسائل ترقی پر تبادلۂ خیال کریں اور اِس طرح باھمی تجویز اور مشورے سے ملکی لٹریچر کی اصلاح و ترقی کا کام انجام پائے، لوگوں میں علمی بیداری اور ادبی مذاق پیدا کرنے کے لیے مشاھیر ادب کو مختلف مباحث و موضوعات پر مضامین لکھنے اور تقریر کرنے کی دعوت بھی دی جایے، اور اکیڈیمی جن لکچروں کا سالانہ اھتمام کرتی ھے وہ بھی اِسی کانفرنس کے زمانے میں دیے جائیں -

چنانچہ پہلی ادبی کانفرنس سنہ ۱۹۳۰ع میں منعقد ھوئی تھی جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور انشا پردازوں نے اپنے گرانقدر علمی مقالوں سے کانفرنس کو مستفید فرمایا تھا - اب دوسری

ادبی کانفرنس کا انعقاد ۴ و ۵ و ۶ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع کو قرار پایا ھے اکیڈیمی کے اراکین اور کارکن جماعت نے اردو اور انگریزی اخباروں میں اعلان شایع کرائے ھیں ، ھندی اور اردو کے بہی خواھوں سے دعوت ناموں اور پرائیویٹ مراسلات کے ذریعہ کانفرنس میں شرکت کی درخواست کی ھے ، مہمانوں کے قیام و طعام اور اُن کی آسائش و مدارات کا بھی انتظام کیا ھے -

ھم کو کافی امید ھے کے جو حضرات اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھتے ھیں وہ کانفرنس میں شریک ھو کر اسے ضرور کامیاب بنائینگے -

---

اس سال کانفرنس میں نہایت اھم مباحث کے پیش ھونے کی امید کی جاتی ھے مثلاً تالیف و تصنیف کے باب میں اکیڈیمی کا طریق کار کیا ھونا چاھیے ؟ دوسری زبانوں سے اگر ترجمے کرائے جائیں تو اُن کی نوعیت کیا ھوگی ؟ آیا لفظی ترجمے کرائے جائیں یا اُن کے مطالب اور خلاصے پر اکتفا کیجائے - مستقل تصانیف کے لیے کن امور کا لحاظ رکھنا ضروری ھوگا - پھر ان کتابوں کا درجہ ، انشا و ادب کے اعتبار سے کیا ھونا چاھیے ، علوم و فنون کی کتابوں کے لیے یہ امر بھی غور طلب ھے کہ وہ طلبہ کے کام کی ھوں یا عوام اور اھل علم کے لیے ، اسی سلسلے میں رسم خط اور زبان کا مسئلہ بھی آجاتا ھے - اصطلاحات علمیہ کے تراجم کا مسئلہ بھی اکیڈیمی کے پیش نظر ھے - اس باب میں بھی اھل علم اور اختصاصین کی رائیں طلب کی جائینگی -

---

غیر ملکی الفاظ و اصطلاحات کے ترجمے کے علاوہ ایک اھم مسئلہ خود ھندستانی لفظوں کا ھے ، ھندستان ایک زراعتی ملک ھے مگر ھمارے ، شعرا اور انشا پردازوں نے اپنی تمام توجہ شہری امور کی طرف

موقوف رکھی اس لیے دیہات کی صدھا چیزیں ایسی ھیں جن کو ھم دیکھتے ھیں اور جانتے ھیں مگر صحیح طور پر اُن کے نام نہیں بتاسکتے اس میں زراعتی آلات ، پھلوں کی قسمیں، زراعتی کاروبار ، گھاسوں ، پھولوں مچھلیوں اور چڑیوں کے نام سب آ جاتے ھیں ۔ جن لوگوں کو اُردو کی توسیع کا خیال ھے اُن کا فرض ھے کہ " لالہ و گُل " " نسرین و نسترن " سنبل و ریحان " ماھی سقنقور و ھما " کے علاوہ اُن ناموں کو بھی متعین کرلیں جن کا مسمیٰ تو ہر برا ھمارے گرد و پیش رھتا ھے مگر ھمارے پاس الفاظ نہیں ھوتے جن سے اُن کو پکار سکیں ۔

ھمیں اُمید ھے کہ کانفرنس اس مسئلہ میں اکیڈیمی کی خاص طور پر رھنمائی کریگی ۔

ھندستانی کے پہلے نمبر میں نظم و شعر کی بابت بظاھر کچھہ حوصلہ شکن باتیں قلم سے نکل گئی نہیں، جس سے بعض حضرات نے تو یہاں تک سمجھہ لیا کہ شاید نظم و شعر کو سرے سے رسالے میں جگہ نہ مل سکے گی ، حالانکہ اُصولاً ایسا نہ تھا البتہ " نظم و شعر " کے نام کے ساتھہ ھی ذھن کے سامنے " غزل بکف " حملہ آوروں بلکہ بلوائیوں کا ایک ھجوم نظر آیا جس سے سہم جانا ایک قدرتی امر تھا ، غزل اور غزل گوئی کو کیا کہئے کہ اپنی بھی کل کائنات یہی ھے ، لیکن یہ کیا ضرور ھے کہ اپنی غلطیوں کی رعایت سے رسالے کو بھی اس سے " آلودہ " و " ملوث " بنایا جائے ۔

من نہ کردم شما حذر بکنید

ایک محفوظ اور سنجیدہ مشورہ ھے جس کے عرض کرنے اور سننے میں طرفین کو تکلف و تامل نہ کرنا چاھیے ، بہر صورت غزل کو کہ اس میں یا وہ گوئیوں اور ھرزہ سرائیوں کا زیادہ امکان و اندیشہ ھے ۔ مسلسل

نظموں کو بشرطیکہ وہ سلجھیدہ ؟ شگفتہ اور ولولہ خیز ہوں ہم نہایت شوق و مسرت سے رسالے میں لینے کے لیے طیار ہیں -

---

هندستانی اکیڈیمی اردو اور هندی میں سالانہ دو خطبوں کا اهتمام کرتی ہے؟ چنانچہ اب کے سال اردو میں ڈاکٹر عبد الستار صدیقی ایم - اے' پی - ایچ - ڈی صدر شعبۂ عربی و فارسی - الٰہ آباد یونیورسٹی "سامی لسانیات" پر اُردو میں اپنا مقالہ پیش فرمائیں گے -

---

یونیورسٹی کے طلبہ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے اکیڈیمی نے ۵۰۰ روپیے اُردو اور ۵۰۰ هندی کے لیے مقرر کیے هیں یہ انعامات اِس صوبے کے اُن طلبہ کے لیے مختص هیں جو یونیورسٹی میں تعلیم پاتے هوں مضامین کے لیے جو موضوعات مقرر کیے گئے هیں وہ حسب ذیل هیں —

(۱) کسی ادبی موضوع پر ایک مضمون -

(۲) مسلسل واقعاتی نظم -

(۳) افسانہ -

(۴) ڈراما -

(۵) طنزیات -

اِمسال اکیڈیمی نے نظم و نثر کی کتابوں پر جو انعامات دیے هیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے —

(۱) "معراجِ سخن" پر سید خورشید حسن عروج کو ۵۰۰ روپیے-

(۲) "المبین" پر مولانا سید سلیمان اشرف کو ۵۰۰ روپیے -

(۳) "نفسیات ترغیب" پر سید وهاج الدین کنتوری کو ۵۰۰ روپیے -

۱ — ہندستانی میں جو مضامین لیے جائیں گے اُن کا معقول
معاوضہ دیا جائے گا -

۲ — معاوضے کا فیصلہ مجلس مدیران کے اختیار میں ہو گا -

۳ — مضمون نگاروں کو چاہئے کہ مضامین صاف اور خوش خط
حروف میں کاغذ کے ایک طرف لکھہ کر روانہ کریں -

۴ — مضمون بیس پچیس صفحے سے زیادہ نہ ہو ، اور اگر اس سے
زیادہ طوالت نا گزیر ہو تو مضمون ایسے متعدد ٹکڑوں میں
ہونا چاہئے جو اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت
رکھتے ہوں -

مرتب

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI.

ہندوستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ کے مقاصد

(۱)—اردو اور ہندی ادب کی حفاظت اور اس کی ترقی و نشوونما کی کوشش کرنا۔

(الف)—مختلف مضامین کی مطبوعات میں سے منظور شدہ کتابوں پر انعام دینا۔

(ب)—معاوضہ وغیرہ کے ذریعہ غیر زبان کی کتابوں کے ترجمے کرانا اور ان کو شائع کرنا۔

(ج)—یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں وظائف دے کر یا دوسرے ذرائع سے ہندی اور اردو زبانوں میں تصنیف یا ترجمے کے کاموں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

(د)—اکیڈمی کے محسنوں کو اعزازی فیلو منتخب کرنا۔

(ہ)—ایک کتب خانہ قائم کرنا اور اس کا انتظام رکھنا۔

(و)—مشہور ارباب علم و فضل کو علمی مقالات کے لیے مدعو کرنا۔

ہندستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ
کی مطبوعات

۱ — قرون وسطی میں ہندستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات —
از علامہ عبداللہ بن یوسف علی — ایم، اے — ایل ایل، ایم — سی
بی — اے — مجلد ۱ روپیہ ۴ آنہ —

۲ — ایضاً غیر مجلد ۱ روپیہ —

۳ — اردو سروے رپورٹ از مولوی سید محمد ضامن علی صاحب
ایم، اے — ۱ روپیہ —

۴ — مغلوں سے پہلے عرب اور ہندستان کے تعلقات — از مولانا سید سلیمان
صاحب ندوی — ۴ روپیہ —

۵ — ناتن (جرمن ڈراما) مترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمان صاحب —
ایم — اے — ایم — آر — اے — ایس — ۲ روپیہ ۸ آنہ —

۶ — فریب عمل (ڈراما) مترجمہ بابو جگت موہن لال صاحب رواں —
۳ روپیہ —

۷ — کبیر صاحب — مصنفہ پنڈت منوہر لال زتشی — ۲ روپیہ —

زیر طبع کتابیں

۱ — قرون وسطی کا ہندستانی تمدن — از رائے بہادر مہا مہوپادھیائے
پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا —

۱ — ہندی شاعری — از ڈاکٹر اعظم کریوی —

۲ — ترقی زراعت — از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب
ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت —

۴ — عالم حیوانی — از بابو برجیش بہادر صاحب بی، اے — ایل ایل — بی
ایٹہ —

باہتمام رام چندر پرساد ورما — کایستھ پاٹھ شالہ پریس — الہ آباد —
ناشر — ڈاکٹر تارا چند، ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد —

ہندستانی

ہندستانی اکیڈمی کا سہ ماہی رسالہ

جولائی سنہ ۱۹۳۱ء

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI

ہندستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ الہ آباد

سالانہ چندہ آٹھ روپیہ

ہندستانی - جولائی سنہ ۱۹۳۱ ع
ایڈیٹر: اصغر حسین -

مجلس مدیران

۱ — ڈاکٹر تارا چند ایم ، اے - ڈی ، فل - صدر -
۲ — پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ؛ صدر شعبۂ عربی و فارسی -
۳ — مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم ؛ اے - صدر شعبۂ فارسی و اردو یونیورسٹی لکھنؤ -
۴ — منشی دیا نرائن نگم بی ؛ اے -
۵ — مولوی اصغر حسین - سکریٹری -

فہرست مضامین

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI

هندستاني

هندستاني اکیڈیمي کا تماهي رسالہ

جلد ۱ } جولائي سنہ ۱۹۳۱ع { حصہ ۳

*ولي کے معاصر هاشم علي
کا
ديوان مراثي

(از مولانا سيد سليمان ندوي)

(مضمون پڑھنے سے پہلے میں معذرت کرلوں کہ یہ سفر کي حالت میں صرف ایفائے عہد کي بنا پر لکھا گیا ھے)

اُردو کي جائے پیدائش بننے کا فخر خواہ هندستان کے کسي گوشہ کو حاصل هو، مگر اس میں کسي شبہہ کي گنجایش نہیں کہ دکن کا ملک وہ پہلي سر زمین ھے جہاں اُردو شاعري کا بیج نصب کیا گیا، اور اس نے پودا بن کر وهاں نشو و نما حاصل کي، شمالی هند کے رهنے والوں نے جب اس پودے کے پھول اور اُس کی بو باس کو دیکھا، تو بے ساختہ اُس کي آبیاري کو آمادہ هوئے اور چند روز کے بعد اُس کي قلم اپني سر زمین

---

* یہ مضمون اکیڈیمی کي دوسري ادبي کانفرنس منعقدہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں پڑھا گیا تھا -

میں لگا کر اُس کو سدا بہار بنا دیا؟ قائم کے زمانہ تک اُردو کو دکنی کا طعنہ سننا پڑتا تھا :—

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

اِک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

تاریخ اُردو کی نئی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو نظم نے دلی کے تخت طاؤسی کے بجائے مسند دکن کے زیر سایہ نشو و نما پائی سلطان قلی قطب شاہ نے ۹۱۸ ھجری میں قطب شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی، تو بیجا پور، احمد نگر اور گولکنڈہ تینوں میں شیعیت اور اور تفضیلیت کی اشاعت ہوئی، ساتھ ھی عزا اور میلاد کی مجلسیں قایم ہونے لگیں، جن میں محتشم کاشی وغیرہ کے فارسی بندوں کے ساتھ ملک کی دیسی زبان میں بھی شاعری کا رواج ہوا۔

یہ بھی اردو زبان کی تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ اُردو میں عشق و محبت کی داستان سرائیوں سے پہلے مذہبی نظموں کی ترانہ سنجی پیدا ہوئی چنانچہ سلطان قلی اور اس کے بھتیجے محمد علی قطب شاہ، اور دوسرے شعراء شجاع الدین نوری اور نصرتی نے مرثیے لکھے، لیکن غالباً مرثیوں کے صنف میں سب سے زیادہ جو شخصیت نمایاں ہے وہ ھاشم برھانپوری کی ہے۔

ھاشم برھانپوری کے مجموعۂ مراثی کا نام دیوان حسینی ہے، شاہ اودھ کے کتبخانے میں اس کا ایک نسخہ تھا، جس کا ذکر اسپر نگر کے کیٹلاگ میں ہے، آجکل اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب‌خانہ میں اس کا ایک نسخہ ملتا ہے جس کا ذکر آجکل کے بعض تحریرات میں کیا گیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے مارچ سنہ ۱۹۳۱ ع کے سفر پونہ میں محبی پروفیسر شیخ عبدالقادر (دکن کالج پونہ) کے کتب خانے میں اس کا مکمل

نسخہ میری نظر سے گذرا، جس سے ہاشم علی اور اس کے اس دیوان مراثی کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں -

هاشم علي برهانپوري

نام کے سوا اس شاعر کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملے، جو کچھہ معلوم ہوتا ہے وہ خود اسی مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے -۔اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس کے آخر میں خوش قسمتی سے کاتب نے جو شاعر کا معاصر تھا، چند سطریں حوالۂ قلم کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام علی محمد خاں ہے اور ہاشم علی اس کا عجیب و غریب مرکب نام تخلص ہے، چنانچہ اس دیوان کے آخر میں ہے :—

"تمام شد دیوان حسینی گفتۂ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی -"

اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی میں مرتب ہوا ہے، اس کا سال ولادت اور سال وفات نہیں معلوم، مگر اس کے اس دیوان میں اس کے ایک مرثیہ کی تمہید میں ایک فارسی عبارت ہے، جس میں مذکور ہے کہ ۲۰ رمضان ۱۱۴۸ھ کو اس کے ہم مشرب و ہم عقیدہ دوست حافظ فضل الدین نے خواب دیکھا کہ ضریح سے صدائے غیب آئی اور ہاشم علی کو یہ مرثیہ سنانے کی فرمایش سنائی دی، عبارت یہ ہے :—

"از جملہ تفضلات امام شہید کہ برین عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ کلام ربانی، فضل الدین در عالم رویا بتاریخ بستم ماہ مبارک رمضان ۱۱۴۸ ہجری مشاہدہ نمود (ص ۷۲) -"

اس کے بعد اس دیوان میں ایک مسمط مرثیہ ہے جس کا نام شاعر نے درد نامہ رکھا ہے، اس کے آخر میں یہ دو شعر ہیں :—

جب منجم نے کیا اس درد نامہ کا حساب

غین و قاف و سین و طا آیا رقم اندر کتاب
۱۰۰۰ ۱۰۰ ۶۰ ۸ (۱۱۶۸ ھ)

سن کے یو تاریخ کوں سینہ میں دل ہوتا کباب

ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادی کا بچن

اس لحاظ سے یہ ولی دکنی کا معاصر ہے جس کا سال وفات ۱۱۵۵ ھ ہے - عام طور سے ہاشم علی اس کا نام سمجھا جاتا ہے ' مگر اوپر کے اقتباس سے جو اس کی زندگی میں لکھا گیا ہے ہویدا ہے کہ اُس کا نام علی محمد خاں تھا اور "ہاشم علی" پورا اُس کا تخلص ہے ' گو یہ اسلوب تخلص شعراء کی طرز و روش کے خلاف ہے ' مگر واقعہ یہی ہے کہ یہ اس کا تخلص ہے ' نام نہیں ' چنانچہ اس کے دیوان کے ہر قصیدہ اور نظم کے آخر میں یہی تخلص آیا ہے ' مثلاً

چو طرف ہاشم علی ہے سر بسر

انقلاب و فتنۂ و آشوب و شر

بول توں بلبل صفت ہاشم علی

صبحدم میں مدح اولاد علی

زندگی دنیا کی ہے ہاشم علی خواب و خیال

جو رہا سویا وہ چوکا ' جاگنا ہیگا محال

تجے ہاشم علی محشر میں دریائے گنہ سیتیں

بھروسا ہے وہ شہ اوپر وہاں سیں پار اُتاریگا

عام طور سے اس کو برهانپوري کهتے هیں، شاید یه اس کي جاے پیدایش هو، مگر اُس کے دیوان میں ایک شعر یه هے :—

گجرات میں پڑي جب یه مرثیه کوں یاراں

سن کر چلے هیں رونے دکھني دکهن کو اپنے

اس سے ظاهر هوتا هے که اُس کا قیام گجرات میں تها ـ

دیوان حسیني

چونکه هاشم علي کا یه دیوان سراسر مرثیوں کا مجموعه هے اس لیے شاعر نے اس کا نام "دیوان حسیني" رکھا هے، چنانچه وه خود کهتا هے :—

توں لکها هے کربلا کا یوں بیاں هاشم علي

هے یو "دیوان حسیني" نام اس دیوان کا

معلوم هوتا هے که یه هر سال ماه محرم میں نیا مرثیه تصنیف کرتے تهے، کهتے هیں :—

تجهکو هاشم علي حسین سرور

هر برس مرثیه لکهاتے هیں

اپني شاعري کي برتری کا بهي اس کو خیال تها :—

شاعروں نے شعر بولے گر چه رنگیں دلکشا

اے عزیزاں یو سخن هے اس دل بریاں کا

عربي سے بهي واقفیت تهي، بعض مصرعے پورے عربي میں هیں :—

یه بشارت بهشت کے در پر

اد خلوا خالدین سلام علیک

ربنا اغفرلنا خطایا نا

بالنبي الامین سلام علیک

فارسي میں بهي بعض مرثیے کهے هیں، جن کي زبان اچهي خاصي هے، حافظ کي فارسي غزل ع دل مي رود ز دستم صاحبدلاں خدا را

پر مصرعے لگائے ھیں -

ایسا معلوم ھوتا ھے کہ مرثیوں کے علاوہ وہ غزلیں وغیرہ نہیں کہتے تھے چنانچہ ایک جگہ مقطع میں یہ اقرار ھے :-

بجز مدح نہیں شعرِ ھاشم علي
کہو راستي کے سخن پر سلام

دوسري جگہ ھے :—

شاعري میں یوں مقرر ھے تجھے ھاشم علي
جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط

ایک اور مرثیہ کا مقطع ھے :—

شعر ھاشم علي کے تئیں یاراں
مدح مولا ملي دیکھیو خالص
ھاشم علي ھمیشہ ثنا خوان شاہ کا
جز مدح و منقبت سخن اُس نے لکھا نہیں

موجودہ نسخہ

دیوان حسیني کا یہ پیش نظر نسخہ میرے خیال میں نہایت ھي پرانا ھے ؛ اور خود مصنف کي زندگي میں لکھا گیا ھے ' جیسا کہ دام ظلہ کے الفاظ سے ظاھر ھے ؛ یہ نسخہ ۲۴×۲۸ کي تقطیع پر پرانے کشمیري کاغذ پر خوشخط نستعلیق میں لکھا ھوا ھے ؛ جدول اور بیچ کي لکیریں سرخ ھیں ؛ اصل دیوان اسي خط اور جدول میں ھیں ؛ دیوان حروف ابجد کي ترتیب پر الف سے یا تک مرتب ھے ؛ مگر شروع میں بیچ میں بعض بعض حروف کي ردیفوں سے بلد اور آخر میں بعض نئي نظمیں جدولوں کے بغیر دوسرے خط میں اضافہ کي گئي ھیں ؛ جس سے معلوم ھوتا ھے کہ دیوان کي ترتیب کے بعد شاعر نے جو مرثیے کہے ھیں ' وہ اپني اپني جگہ پر اپنے

ایسے حروف میں بڑھائے گئے ہیں ؛ چنانچہ نسخۂ مذکور کے آخر میں یہ تصریح بھی ملتی ہے :—

"این جلد تا مرثیہ ہندی نو کہ در دیوان مرزا صاحب مشفق مہربان انیس خفی و جلی محمد علی سلمہ ربہ نبود، احقر عباد محمد علی غفراللہ تعالیٰ ذنبہ برائے یاد و بود نوشت ؛ امید کہ ہر کہ بخواند بدعائے خیر فقیر حقیر را یاد نماید ـ

نوشتہ بماند سیہ بر سفید

نویسندہ را نیست فردا امید

تمت تمام شد دیوان حسینی گفتہ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی ـ"

اس نسخہ میں (۴۲۰) صفحے ہیں ؛ اور ہر صفحہ میں تقریباً سترہ شعر ہیں، اور یہ کل کے کل مختلف اصناف سخن میں سر تا سر مرثیے ؛ سلام اور بیان مصائب کربلا ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ آج سے دو سو برس پہلے اردو کے ایسے شاعر موجود تھے ؛ جنہوں نے صرف مرثیوں کا ایسا ضخیم مجموعہ یادگار چھوڑا ؛ اور اس حیثیت سے یہ نسخہ غالباً ہندستان میں اپنی طرز کا تنہا اور یکتا ہے ـ

زبان کی خصوصیات وہی ہیں جو ولی کے کلام میں ہیں ؛ مثلاً

ستیں اور سیں	بجائے	سے
یو	,,	یہ
کوں	,,	کو
سوں	,,	سے
منے	,,	میں
مہانے	,,	میں

کتیں	بجاے	کے تئیں=کے لیے
مجے	,,	مجھے
انجھو	,,	آنسو
تمن	,,	تم
ھمن	,,	ھم
ھیگا	,,	ھوگا
کسوں	,,	کسي
سونے	,,	سلے
ایتا	,,	اتنا

جمع الف نون کے ساتھہ؛ یہاں تک کہ ھندي لفظوں کي بھي؛ جیسے انکھیاں؛ پلکاں؛ انجھواں؛ مت (کلمہ نفي) کو "متہ" (ھاے کے ساتھہ) چنانچہ ایک مرثیہ جس میں ردیف متہ ھے؛ ت کے بجاے ہ کي ردیف میں جگہ دي ھے -

ھندي لفظوں کا بکثرت استعمال؛ جیسے بچن بات کے معني میں مُکھہ منہ کے معني میں :—

رو رو سکینہ غم سوں کبھی پھر نہیں سونے

بابا کے مُکھہ سوں میٹھي بچن کربلا ملي

سیس سر کے معني میں؛ نمانا؛ جھکانا؛ من دل کے معني میں؛ دولن بجاے دلھن :—

بیٹھي گھونگھٹہ میں سیس نما درد سیں خموش

روتي ھے آج من میں دولن کربلا ملي ،

سجن بمعني محبوب :—

جب سیں چلے ھیں میرے سجن کربلا ملي

دیسے بمعنی دیکھے ع چہرہ خورشید سا دیسے تیرا

باج بمعنی بن ع آج تجھہ باج سیہ پوش ہوا کعبہ ز غم

جگت بمعنی دنیا ع ہاشم علیؔ ہو جگت میں سبھی ملال

اندھکار بمعنی اندھیرا ع آج تجھہ باج جگت بیچ ہے اندھکار حسین

اوجاری بمعنی اُجلا ع دو جگ کے اُوجاری پر ایتا ستم

چلدر بمعنی چاند پھر محرم کا چلدر آیا نہوتا کاشکے

قتل سرور کی خبر لایا نہوتا کاشکے

کرن بمعنی کان دونو گالوں اوپر زلفاں پڑی چھوتی کرن ہے ہے

نینن بمعنی آنکھہ کیا نور نینن ہے ہے

چرن بمعنی قدم ع افسوس ہے نہ لائی، گھرمیں چرن توں اپنی

اکاس بمعنی فضا ع غم کے داغاں سے بھرا سارا اکاس

داس بمعنی غلام اے شہ دیں کمتریں ہاشم علی

ہے تمہارا بندۂ و مملوک و داس

زرا اوپر کے دوسرے مصرعے کی فارسی و ہندی ترکیب کی آمیزش ملاحظہ ہو۔

نگر بمعنی شہر سن نگر میں شور محشر ہر گلی

ہے شبِ قتلِ شہیداں آج رات

اس نگر سے کوئی خاص شہر غالباً مراد نہیں، کہ دوسری جگہ وہ کہتا ہے :—

اس درد سوں ہاشم علی لاگے دلاں میں تلملے

نگروں نگر، گلیوں گلی کہتے ہیں یاراں وا حسین

صاف شعر

باوجود اس قدامت کے مرثیہ کے بہت سے شعر صاف ہیں :—

ظلم کیا برملا ھائے فلک کیا کیا
فاطمہ کا دل جلا ھائے فلک کیا کیا
جس کے گلے مصطفا بوسہ لیا بارھا
شمر کا خنجر رکھا ھائے فلک کیا کیا
عابدین بیمار تھا شاہ گرفتار تھا
تجھکوں سزاوار تھا ھائے فلک کیا کیا
شکوۂ دوراں لکھوں غم کي یو باتاں لکھوں
کاں (کہاں) تلک ھردم کہوں ھائے فلک کیا کیا

جس وقت شاہ رن سوں پیاسا جگر سدھارا
بیتاب کھول سر کوں زینب نے یوں پکارا
دیکھو رسول احمد، فرزند کوں تم اپنے
افسوس کربلا میں بے سر پڑا ھے مارا
یہ کوفیان بیدیں، مہماں بولائے ھم کو
بن جور بن جفا سوں کرتے نہیں مدارا

ھوا پھر کر محرم کا مہینا
نبي کے آل کا توٹا سفینا
سدھارا تشنۂ لب فردوس کوں وہ
جہاں میں کوئی نہ تھا جس کا قرینا
سلیماں تخت کو چھوڑا ھے روتا
گرا خاتم نبي کا جب نگینا
کہا شہ نے حرم سوں نہیں ھے چارا
مجھے شربت شہادت کا ھے پینا

نہ یہ تبدیل پاوے آج تقدیر
ہوئے حق کے قضا اوپر رضینا
سکینہ نے کہا وہ دن نہ آوے
جہاں میں بے پدر ہو مجھکو جینا
یہ دشت کربلا ہے ہائے بابا
کہاں مکہ کہاں جد کا مدینا

ان مرثیوں میں سرتاپا پُر درد مضامین؛ ماتم؛ بین؛ یتیمي اور بیکسي کے حسرت انگیز واقعات بیان کیے گئے ہیں؛ مناظر قدرت؛ لڑائي کا نقشہ؛ گھوڑے کي تعریف؛ تلوار کے تشبیہي مضامین اور مبالغہ کي رنگ آمیزي مطلق نہیں؛ بلکہ درد و غم کے صرف فطري مضامین ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں؛ ایک مرثیے کا عنوان ہے :—

نمونۂ کلام

"توجہ نمودن شہر بانو بعد از شہادت امام زادہ علي اصغر و بیان کردن حالات و مکالمہ نمودن با او"

دیکھو کہ ایک معصوم ننھے بچہ کي موت کا کتنا پُر اثر فطري بیان ہے -

کہتیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
بالے اصغر باج میں کس کا جھولاؤں پالنا
اے جان مادر کہاں ہے تو پھر کر میں تجھکو کہاں ملوں
بیٹھي اکیلي کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
بر میں سولاؤں میں کسے دود پلاؤں میں کسے
جاماں پناؤں میں کسے کس کا جھولاؤں پالنا
سویا ہے گردن ڈال کیوں؛ اولجھے زلف کے بال کیوں
رنگین لوہو سیں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

تو کھول انکھیاں میں دیکھوں؟ تو بول بتیاں میں سنوں
روتا نہیں تو کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
تو چھوڑ مجھکو کہاں گیا؟ توں دود کس کا کہوں پیا
بسرا ہے مہری کیوں میا کس کا جھولاؤں پالنا
بھیکا لہو میں ہے گلا؟ لیتی ہوں تیری میں بلا
توں پاس اپے مجھہ بولا کس کا جھولاؤں پالنا
جاؤں ؟دھر میں کیا کروں؟ یہ گود خالي لے پھروں
اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
یہ دیکھہ میرا حال توں؟ توري موں سر کے بال کوں
میں دل کي حالت کیا کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
تھے کھیلنے کے دن ترے؟ کیا عمر تھي کیا سن ترے
نہیں چین مجھکو بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا
نہیں بھولي مجھکو توں کبھوں؟ تجھہ یاد کرنے میں رہوں
رو رو کے تجھہ بن دن بھروں کس کا جھولاؤں پالنا
یہ بہن تیري غمگسار؟ بیٹھي ہے روتي زار زار
تو اُٹھہ سکینا کر پوکار کس کا جھولاؤں پالنا
توں روٹھہ ہٹ کر کہاں گیا؟ میں تجھکوں لاؤں پھر منا
مت ہوئے مجھسوں تو جدا کس کا جھولاؤں پالنا
تیري صورت پر میں فدا؟ پھرتا نظر میں توں رہا
جب کہ لحد میں توں گیا کس کا جھولاؤں پالنا
جاتا نظر سیں نور کیوں؟ توں مجھسوں ہوتا دور کیوں
اتا ہے غم کا پور کیوں کس کا جھولاؤں پالنا
کہاں سیں اجل تھي گھات میں؟ گئی لیکے تجھکو ہات میں
بالا کیا جي بات میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے میرے پیارے لاڈلے ؟ پھر آ کے لگ توں مجھہ گلے
انجھوں نین سیں بہ چلے ؟ کس کا جھولاؤں پالنا
کہاں کھیلتا ہے آج تو ؟ خالي یہ گھر تجھہ باج ہوں
جاتا ہے میرا راج کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
ھاشم علی کوں نہیں تواں ؟ بانو کا لکھنا سب بیاں
کہتي تھي ہر دم با فغاں کس کا جھولاؤں پالنا

حضرت قاسم کی شادي اور شہادت کا پُر اثر سماں اِن لفظوں میں کھینچا ہے جس سے آج سو دو سو برس پہلے کے رسم و رواج ظاھر ہوتے ہیں –

محبان غم شہیداں کا دلوں سیتیں بھولاوو مت
جگر میں شہ کي فرقت کي اگن جلتی بوجھاوو مت
حسن کی جب وصیت پر لگے قاسم کے تئیں بھانے
کہا رخصت کرو رن کوں ؟ یہ جنگل میں بھاوو مت
نہیں سامان شادي کا مصیبت سب مہیا ہے
یہ سر کاٹیں گے رن میانے اُسے سہرا بندھاوو مت
پلادیں گي مجھے شربت شہادت کا حوران ساری
نہیں پاني پیاسوں کوں سو شربت کر پلاوو مت
براتي ساتھہ نہیں میرے چلے ہیں سب شہید ہو کر
میرے سر پرقضا پھرتي دگر چھتّر پھراوو مت
طبق دیکھے ملائک کون لے آتے نور کے ؟ رن میں
کہا قاسم نے اے امّاں بری میري لے جاوو مت
لہو میں لال ہوویںگے ؟ مرے دو ھاتھہ کنگن کے
نہیں حاجت مجھے مہندي ؟ انجھو سیتیں گندھاوو مت

سیندہ کے دنب رهیں بجنے میري شادی کے تا محشر
سو غم کی اج تم نوبت میرے بھیا کے بجاوو متہ
لوهو اور خاک رن میانے لگے گي میرے تن اوپر
اوبتنا تیل متہ لاؤ ؛ مجھے روني چڑاوو متہ
زمیں کے سیج پر سونا مجھے هے گا لحد میانے
رهیگي سیج سب خالي نهیں فرصت بچھاوو متہ
جدائي اج هے قسمت نہیں یہ روز اجل هے گا
سو دولهن ساتهہ تم میرا یہ عقد غم پڑهاوو متہ
مقرر مہر مثل هے گي شهادت رن میں پانے کوں
سو جُلوہ میں ادا کرنا یہ نقدِ جاں دلاوو متہ
اجل سیں نلغ اب هوتا میرا شهریں دهن دیکھو
جگر اس غم سو هے ٹوکرے نباتاں کو چوناوو متہ
کہاں دولهن ستهیں روتا سو تخت جُلوہ سیں اوٹهہ کر
میری دوري کی آتش سوں دل اپنا تم جلاوو متہ
عروسی کل قیامت کوں هماری هے گي جنت میں
رکھو نتهہ ناک میں اپني سوهاگ اپنا لٹاوو متہ
شهادت سن میري هرگز سنگار ابرن نتورو تم
سو کاجل کو نین سیتیں بہا انجھو مٹاوو متہ
روا هے اج دولهن کوں سراپا لال جلوہ کا
میرے لہو میں رنگو آنچل دگر رنگ تم رنگاوو متہ

اس نسخہ میں ایک بات خاص لحاظ کے قابل یہ هے ؛ کہ اِس میں اکثر ثقیل هندی حروف کو خفیف لکھا گیا هے ؛ مثلاً بیٹھے کی جگہ بئتهے ؛ توڑو کي جگہ تورو ؛ لوٹاؤ کي جگہ لوتاؤ ؛ اوبٹنا کي جگہ اوبتنا ؛ وغیرہ ؛ اس سے معلوم هوتا هے کہ ابهي تک فارسي کي

ماضی زبانیں هندی حروف کے ادا کرنے پر پوری طرح قادر نہیں هوئی تھیں ؛ الف ممدودہ کو الف پر مد دیکر لکھنے کے بجائے دو الف سے لکھا ہے یعنی "آج" کو "ااج" وزن میں بعض حروف کے گرنے کی پروا اُس نے نہیں کی ہے نہن کی جگہ نہلن ؛ نہیں کی جگہ نئیں ؛ اسی طرح عربی لفظ عروس کو عارس باندھا ہے ۔

غزل گو میر و مرزا سے پہلے کے پرانے اردو شعراء کے غزلیات کے بہت سے دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ؛ جن سے ہماری زبان کی تدریجی ترقی ظاهر هوتی ہے ؛ مناسب ہے کہ اسی طرح مرثیہ گو میر و مرزا سے پہلے کے اس مجموعۂ مراثی کو بھی شائع کیاجائے ؛ تا کہ پتہ چلےکہ وہ زمین‌تھی جس کو میر و مرزا نے اپنی بلند خیالیوں سے آسمان بنا دیا ؛ اور معلوم ہو کہ ان مرحومین نے جس گلستان سخن کو سدا بہار بنا دیا ؛ اس کا آغاز بہار کیونکر ہوا ؟

اس نسخے کے اصل دیوان کا پہلا شعر یہ ہے ؛ جو حمد میں ہے :—

ابتدا ہر نامہ و ہر کام کا
لازم آیا ذکر تیرے نام کا

اور آخری شعر یہ ہے :—

یہی آرزو دل میں تجھے هاشم علی دائم
کہ مولا کے کرم سیتیں نجف اور کربلا دیکھے

مگر دیوان کی ترتیب کے بعد جو نئے مرثیے اضافہ کیے گئے ہیں ؛ اس کے لحاظ سے ردیف الف میں پہلا شعر یہ ہے :—

افسوس ہے ہزار کہ نوشہ گذر گیا
روتی دولهن کون چھوڑگھونگھٹہ میں؛ گزر گیا

اور آخری شعر یہ ہے جو اردو مسدس کا فارسی بند ہے :—

داشت هاشم علی چو روے ارادت بہ نیاز
کرد منظوم چنیں واقعہ در سوز و گداز

مجموعہ کے شروع میں غالباً اسي زمانے کے ایک اورمرثیہگو شاعر کے دو مرثیے هیں جن‌کي زبان بهي اسي قسم‌کی هے ؟ اور ان میں شاعر کا تخلص تقي آیا هے ؟ یہ حسب معمول چومصرعے هیں؟ تین مصرعے ایک قافیہ کے اور چوتها پورے مرثیہ میں ایک قافیہ اور ردیف کا ؟ سودا تک نے اسي رنگ میں مرثیے لکھے هیں :—

نامہ اعمال کا اُس کے هے گناهوں سیں سیاہ
تجهہ سیں اُمید شفاعت هے تقي کو اے شاہ
تجهہ سوا کوئي کي دو جگ میں نهیں رکهتا پناہ
از ازل تیرے چرن سیتیں لگا هے هائے هائے

مسلمانوں کا ہندستان میں آنا

(از ڈاکٹر تارا چند ایم' اے - ڈی - فل)

بہت پرانے زمانے سے ہندستان اور ایشیا کے مغربی ملکوں کے مابین تجارت ہوتی آئی ہے - عرب' فلسطین' مصر' کابل' اسیریا اور دوسری قوموں کے سوداگر ہمارے ملک کی چیزیں منگاتے تھے اور اپنے ملک کا مال یہاں بھیجتے تھے۔ سلیمان نے بھی' جو یہودیوں کا بڑا نامی بادشاہ ہوا ہے اپنے مشہور مندر کے بنوانے کے لیے ہندستان سے سونا' ہاتھی دانت اور مور کے پر منگوائے تھے* - مصر کے بطلیموس خاندان کے بادشاہوں نے بحر احمر کے کنارے ہندستان کی تجارت کے لیے بندرگاہوں کی بنیاد ڈالی† - ایران کے بادشاہوں نے ان کی دیکھا دیکھی خلیج فارس میں بندرگاہ قائم کیے‡ - یونانی سوداگر ساحل مالابار سے چاول' ادرک' کالی مرچ' دارچینی خریدتے تھے§ - اور یونانی و رومی مصنفین ہندستان کے جغرافیے سے واقفیت رکھتے تھے مثال کے لیے "ہپالوس اور پلینی" پہلی صدی کے ' پیری پلوس دوسری صدی اور کوسما چھٹی صدی عیسوی کے مصنفین کے نام ہیں - امیان مارسلانی لکھتا ہے کہ لنکا' لکادیپ اور مالدیپ کے لوگوں نے شہنشاہ جولین کے پاس سفیر بھیجے تھے - ایک کتاب ہے جس کا نام "پیوتن گیرین ٹیبلس" ہے

---

* ہنٹر - ہسٹری آف برٹش انڈیا جلد اول صفحہ ۲۵ -

† ہنٹر - ہسٹری آف برٹش انڈیا جلد اول باب اول -

‡ کنیڈی - جے - آر - اے - ایس - سنہ ۱۸۹۸ع -

§ کنیڈی - جے - آر - ایس سنہ ۱۸۹۸ع -

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں کرنگانور میں رومیوں کی' اور مصر کے بندرگاہ اسکندریہ میں ہندؤں کی آبادی تھی اس ہندستانی آبادی کو روم کے ظالم قیصر "کار اکلا" نے تیسری صدی کے شروع میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا' جنوبی ہندستان میں "آگسٹس" سے لے کر "زیلو" تک یعنی پانچ سو برس کے سکے آج تک ملتے ہیں * اور اس تجارت کا پتا دیتے ہیں جو ہمارے اور مغربی ملکوں کے مابین جاری تھی -

ایران بھی تجارت میں روم سے پیچھے نہ تھا † - ایرانیوں نے دریاے دجلہ اور فرات کے دھانے پر بصرے کے نزدیک "اوبولا" کا بندرگاہ بنایا - ساسانیوں نے ہیرا کو صوبے کا پایۂ تخت قرار دیا - عربی مورخین لکھتے ہیں کہ ہیرا کے باشندے دن رات اپنے مکانوں کی چھتوں پر سے ہندستان سے آنے والی کشتیوں کو دیکھا کرتے تھے خسروا نوشیرواں کے وقت میں تجارت بڑی ترقی پر تھی اس نے خود سندھ پر حملہ کیا تھا اور "دارا" نے اپنے بیڑے کو لنکا بھیجا تھا تا کہ ان لوگوں کو' جنھوں نے ایرانیوں کو مار ڈالا تھا' سزا دے - تاجک شاستر ‡ کا نام ہی بتلاتا ہے کہ ہندیوں اور ایرانیوں میں کتنا گہرا تعلق تھا -

§ عرب کے رہنے والوں نے ہندستان اور مغرب کی تجارت میں بڑا حصہ لیا ان کے ملک میں سمندر کے کنارے بہت سے بندرگاہ تھے جیسے عدن جنوب میں' اور سحر مشرق میں' بحر ہند کی کشتیوں میں عربی ملاح تھے اور اس سمندر کے دونوں کناروں پر ان کی بستیاں تھیں

* تھرستن- عجائب خانۂ مدراس کے سکے - فہرست نمبر ۲-
† رینو جیاگرفی - دی ابوالفدا صفحہ ۳۸۲ -
‡ کار ڈیر میلانجے - ایچ - ڈیرنبور - نوٹس سورلے مسلماں ڈی شین - Cordier Melange H. Derınburg. notes sur les Musa mans de chine.
§ رینو ریلا سیان دی ویاز فے پارلیز اراب اے لا پرسان- داں لیزینڈ اے آلاشین داں لے ۹ سی ایکل ، ٹرم ایک -

ہندستان کے مغربی کنارے پر چول ' کلیان ' سوپارا وغیرہ مقاموں پر آج بھی ان کے آثار پائے جاتے ہیں - رینوں کا خیال ہے کہ چودھویں صدی تک ساحل ملابار پر عربوں کا ویسا ہی اثر تھا جیسا بعد میں پرتگالیوں نے قایم کرلیا -

ساتویں صدی میں جب اسلام کا جھنڈا بلند ہوا اور عرب کی سب قومیں ایک جھنڈے کے سایہ میں جمع ہوئیں تو اس تحریک کو بہت زور پہونچا جو حضرت محمد کی پیدائش سے پہلے شروع ہوگئی تھی - عرب چاروں طرف تیزی کے ساتھ پھیلنے لگے - ان کی فوجیں جنگلوں؛ میدانوں اور پہاڑوں کو عبور کرتی ہوئی شام؛ ایران افغانستان اور بلوچستان کو طے کر کے ہندستان کی سرحد پر پہونچ گئیں - مسلم بیڑوں نے ایرانیوں کے بیڑوں کو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سونپ دیا اور بحر ہند پر اپنا قبضہ کر لیا - ان بیڑوں کے ساتھ ساتھ عرب کے سوداگر بحر ہند کی ساری تجارت کے ٹھیکے دار ہوگئے* -

عربوں کی کشتیاں؛ مغرب میں بحر احمر کے کنارے سے یا جنوبی کنارے سے چلتی تھیں† اور ہندستان میں ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یا تو سندھ کے دہانے میں اور کھمبائت کی خلیج (Bay of Cambay) میں پہونچ جائیں یا مالابار کے بندرگاہوں میں جا کر مال اُتار دیں - پہلی صورت میں وہ ایشیا کے کنارے کنارے کشتیوں کو لگائے رکھتے تھے لیکن دوسری صورت میں برسات کی ہواؤں (Monsoon) سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بادبان کھول کر ا بیچ سمندر سے ' کولم ' جا پہونچتے تھے ' پھر کولم سے کالی کٹ کوچین ہوتے ہوئے لنکا ' ملایا مشرقی ممالک اور چین کو چلے جاتے تھے -

---

* کیمبرج میڈیول ہسٹری -

† رینو جیوگرفی دي ابوالفدا -

مسلمانوں کا پہلا بیڑا حضرت عمر * کی خلافت میں
سنہ ۶۳۶ع میں ہندستان آیا اُس وقت عثمان ثقفی بحرین کا
صوبہ دار تھا اور اس نے ایک فوج سمندر کے راستے سے تھانے کے
بندر پر بھیجی - خلیفہ نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور عثمان
کو اس حرکت سے روکنے کے لیے سخت سزا کی دھمکی دی -
حضرت عثمان کے زمانے میں ہندستان کی طرف کئی بار دیکھ
بھال اور ٹوہ لینے کے لیے فوجی دستے آئے اور آخرکار سنہ ۷۱۲ع
میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس صوبے کو
عربوں کی مملکت میں شامل کرلیا -

جس وقت مسلمان صوبے داروں اور فوجی کپتانوں کی
للچائی ہوئی نگاہیں سندھ پر پڑ رہی تھیں اس وقت عرب
کے سوداگر ساحل ملابار پر امن کے ساتھ اپنی بستیاں بسا رہے تھے† -
مدراس کے ضلع کے میلوئل ‡ میں "اسٹرروک" لکھتا ہے کہ
ساتویں صدی سے عرب کے سوداگر ہندستان کے مغربی کنارے پر
بس رہے ہیں - وہ ہندستانی عورتوں سے شادیاں کرتے تھے اور ان
کے رہنے اور گھر بنانے میں کسی طرح مزاحمت نہیں کیجاتی
تھی - بلاذری نے اپنی تاریخ میں اس بات کی تصدیق کی ہے -
حجاج§ کے حالات میں اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ
ایک جہاز لنکا سے کچھ مسلمان لڑکیوں کو جن کے ماں باپ

---

* ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا - جلد اول صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶ -

† رولینڈ سن مقدمہ تحفۃالمجاہدین ڈی ' دی لینڈ آف دی پیرو ملس - صفحہ ۳۶۵ -

‡ اسٹرروک جنوبی کنارا (مدراس ڈسٹرکٹ مینولس) صفحہ ۱۸۰ -

§ ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا - جلد اول صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹ -

مر گئے تھے واپس لیے جارہا تھا * اس جہاز پر "کچھ" کے لٹیروں نے حملہ کیا اور لڑکیوں کو گرفتار کر لیا - حجاج نے راجہ داھر سے لڑکیوں کو چھڑانے کے لیے مطالبہ کیا لیکن داھر نے اس پر توجہ نہیں کی تب حجاج نے قاسم کو فوج اور بھیڑے کے ساتھہ داھر پر چڑھائی کے لیے بھیجا -

حجاج اپنے جبر و تشدد کے لیے مشہور ھے - اس نے ھشام کے گھرانے کے لوگوں کو اس قدر تنگ کیا کہ انھوں نے بھاگ کر ھندستان میں پناہ لی اور "کونکن" اور کنیا کماری (Cape Comorin) کے مشرقی ساحل پر ڈیرا جمایا - اُن کی اولاد سے "نوایت" اور "لبّے" قومیں بنیں جو اب بھی ان مقامات پر آباد ھیں -

کولم میں "میت کلو" نام کے قبرستان میں علی بن عثمان کی قبر پر سنہ ۱۶۶ھ (سنہ ۷۸۰ع) کا کتبہ ھے جس سے معلوم ھوتا ھے کہ آٹھویں صدی میں مالابار کے ساحل پر مسلمان آباد ھو گئے تھے - مسلمانوں کا اثر بہت جلد جلد بڑھا - ھندو راجاؤں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی - اُن کی تجارت کے لیے آسانیاں بہم پہونچائیں - انہیں زمین خریدنے ، مسجدیں بنانے کی اجازت دی - مالابار میں آباد ھوتے ھی ان سوداگروں نے اپنے مذھب کے پھیلانے کی کوشش شروع کردی - مسلمانوں میں پروھت اور پادری نہیں ھوتے لیکن ھر مسلمان کا فرض ھے کہ مذھب کی †شاعت کرے - قرآن میں لکھا ھے کہ لوگوں کو خدا کے راستے

---

* رائس " میسور اینڈ کرگس " جلد اول صفحہ ۳۵۳ - اور کلابا اینڈ جنجیرہ گزٹیر - صفحہ ۷۴ -

† انیز " ملابار اینڈ اینجلگو ڈسٹرکٹ گزٹیر - صفحہ ۴۳۶ --

پر چلنے کا پیغام دو اور انہیں عقلمندی کے ساتھہ اور رحم کے ساتھہ بلاؤ - قرآن (۱۶ - ۱۲۶) اس تبلیغ کے کام میں نہ صرف مرد بلکہ عورتوں تک نے بڑا حصہ لیا ھے - حضرت حسن کی پر پوتی نفیسہ نے مصر میں بہتوں کو مسلمان بنایا - اُن کے بارے میں روایت ھے کہ وہ جس گھر میں رھتی تھیں اُس کے پڑوس میں ایک ذمّی کا گھر تھا - اُس کی لڑکی ایسی بیماری میں مبتلا تھی کہ اپنے ھاتھہ پاؤں نہیں ھلا سکتی تھی - وہ رات دن پیٹھہ کے بھل چارپائی پر پڑی کراھا کرتی تھی - ایک دن اُس لڑکی کے ماں باپ کو بازار جانا پڑا - انھوں نے نفیسہ سے لڑکی کے پاس رھنے کے لیے خواھش ظاھر کی - نفیسہ کو بڑا ترس آیا اور انھوں نے اُس کے پاس رھنا منظور کر لیا - جب ماں باپ چلے گئے تو نفیسہ نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ " اُس لڑکی کے دکھہ کو دور کر " - اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ لڑکی اچھی ھو گئی - ماں باپ اور سارا کنبہ نفیسہ کا گرویدہ ھو گیا اور اُنھوں نے اظہار تشکر میں اِسلام قبول کر لیا -

مسلمان مرد اور عورتیں ھی نہیں بلکہ قیدی تک اشاعت مذھب کے لیے طیار رھتے تھے - ایک مسلمان قیدی نے سب سے پہلے یورپ میں اسلام پھیلایا اور " پیچے نیگ " قوم کو جو گیارھویں صدی میں ڈینوب اور ڈون کے بیچ میں آباد تھی ، مسلم بنایا -

غلام سرور نے خزینۃالاصفیا میں لکھا ھے کہ شیخ احمد مجدد کو جہانگیر نے قید خانے میں بھجوادیا تھا - اُنھوں نے دو برس میں سیکڑوں ھندو قیدیوں کو مسلمان کر لیا -

آٹھویں صدی میں مسلمانوں کو جو کامیابی حاصل ھوئی اس کے کئی اسباب تھے :— دکھن کے لوگ اُنھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے - ان کی دولت ، اور بڑھتی ھوئی طاقت کا ان کے دلوں پر

سکّہ جم گیا تھا ؛ لیکن سب سے بڑھکر مسلمانوں کے خیالات ان کے رواجوں؛ ان کے اطوار اور چال چلن کا اثر پڑا - مسلمانوں کا مذہب سادہ؛ آسان اور اچھا تھا - ان کی پرستش کے طریقے دلوں میں گھر کرنے والے تھے اور رات دن خدا کی یاد دلانے والے تھے -

ریناں ایک فرانسیسی عالم نے خود قبول کیا ہے "میں جب کبھی مسجد میں جاتا ہوں تو میرا دل ایک نا قابل بیان کیفیت سے اُمنڈ آتا ہے اور میرے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ میں مسلمان کیوں نہ ہوا"- جب ریناں ایسے کٹر ملحد اور سائنسداں کے دل پر اسلامی عبادت کا ایسا اثر ہوتا تھا تو اوروں کا کیا ذکر ہے - ایک اور بات جو بھولنی نہیں چاہیے یہ ہے کہ پہلی صدیوں کا اسلام ایک بڑا عملی مذہب تھا - اسلام کے ماننے والے اپنے عقیدوں کو محض زبان سے نہیں دھراتے تھے بلکہ اپنی زندگی اور چال چلن میں اُن پر پابند ہوکر رہتے تھے - اُن کی نماز کی صف بندی ؛ روزوں کی سختی ؛ خیرات اور عُشر کے قاعدے ؛ سماج میں برابری اور مساوات کا برتاؤ؛ مذہب کے ایسے زبردست حصے تھے کہ آدمی کے دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے -

اس کے خلاف آٹھویں صدی میں دکن میں ہندستانی دھرموں میں سخت اختلاف جاری تھا - بودھ ؛ جین اور ویدک دھرم کے ماننے والے ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے - برھمنوں کی کوشش سے بودھ اور جین دھرم ختم ہو چلے تھے اور شیو اور وشنو کا مت پھیل رہا تھا - سیاسی دنیا میں بھی ایک طوفان برپا تھا - چیر * اور کرال کی طاقتیں گھٹ رہی تھیں اور نئے گھرانے ابھر رہے تھے - مسلمان دکن میں اس وقت پہونچے

---

* اے ہسٹاریکل اسکیچز آف دی اینشنٹ دکن -

جب سماج اور راج میں فساد برپا تھا - اُن کے آنے کا قدرتی طور پر بڑا اثر ہوا - نویں صدی کے اوائل میں مالابار کے خاندان کا جو چیرمن پیرو مل * سے ملقب تھا خاتمہ ہوا اور اُس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے آخری راجہ نے جس کی راجدھانی کودنگلور تھی اپنے دھرم کو چھوڑ دیا اور اِسلام قبول کر لیا -

مشہور یہ ہے کہ راجہ نے خواب میں یہ دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں صبح کو اُس نے خواب کی تعبیر پوچھی تو کوئی ٹھیک مطلب نہ بتا سکا - اتفاق سے مسلمانوں کی ایک جماعت جو لنکا سے لوٹ رہی تھی راجہ سے ملنے کو دربار میں حاضر ہوئی - اس کے سردار نے خواب کی تعبیر ٹھیک ٹھیک بتادی اور راجہ کو اپنے مذہب کی تعلیم کی - اس کے بعد راجہ مسلمان ہوا اور عرب کے ملک کو گیا - وہاں سے اُس نے ملک ابن دینار ، شرف ابن مالک اور مالک ابن حبیب کو مالابار بھیجا - اُنھوں نے یہاں آکر گیارہ جگہوں پر مسجدیں بنائیں اور اِسلام کی اشاعت کی -

راجہ کے مذہب بدلنے کی وجہ سے ملک میں بڑی ہلچل مچی اور اس واقعہ نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا - مالابار میں آج بھی اس واقعہ کی یاد زندہ ہے جس وقت راجہ تخت پر بٹھایا جاتا ہے تو اُس کا سر مونڈتے ہیں اور اُسے مسلمانوں کا سا لباس پہناتے ہیں - ایک موپلا اُس کے سر پر مُکٹ رکھتا ہے † - گدی پر بٹھائے جانے کے بعد راجہ کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں

---

* لوگن " ملابار " جلد اول صفحہ ۲۴۵ -

† قادر حسین خاں "ساؤتھ انڈین مسلمانس" مدراس کرسچین کالج میگزین ۱۳-۱۹۱۲ صفحہ ۲۲۱ -

جو ایک ذات سے نکالے ہوئے آدمی کے ساتھہ - وہ اپنے گھر والوں کے ساتھہ بیٹھہ کر کھانا نہیں کھا سکتا ؛ نائر لوگ اُس کو چھو نہیں سکتے - یہ بھي سمجھا جاتا ھے کہ راجہ آخري چیرمن پیرومل کا والسرائے ھے اور اپنے راجہ کے لوٹنے کا انتظار کر رھا ھے -

ٹراونکور * کے مہاراجہ ؛ تخت نشینی کے وقت ؛ تلوار کمر میں باندھتے ہوئے یہ اعلان کرتے ھیں کہ "میں اس تلوار کو اس وقت تک رکھونگا جب تک میرا چچا جو مکہ گیا ھے لوٹ نہ آئے" - آخری چیرمن پیرو مل کي داستان کہاں تک تاریخی حیثیت سے سچي ہے کہنا مشکل ھے لیکن اس واقعے کے کچھہ آثار باقی ھیں - گو نائکوں کے نام ٹھیک ٹھیک نہیں ھیں کیونکہ چیرمن پیرومل خطابي نام ھے - لیکن اتنا ماننا ھی پڑیگا کہ کو دنگلور کے شاھی خاندان کا خاتمہ اس طرح ھوا کہ اُس کے آخری راجہ نے اپنا مذھب تبدیل کر دیا -

اس میں شبہہ نہیں کہ اُس زمانے میں مسلمانوں کا بڑا اقتدار تھا - انھیں موپلا کے نام سے پکارا جاتا تھا - موپلا کے دو معني ھیں - بڑا لڑکا یا دولھا ' جن لوگوں کی عزت کرني منظور ھوتی تھی انھیں موپلا کا خطاب دیتے تھے ؛ جیسے عیسائیوں کو نصرانی موپلا کہتے ھیں - موپلوں کے بڑے اختیارات تھے ؛ مسلمان موپلا نام بوتری برھمنوں کے برابر بیٹھہ سکتا تھا - حالانکہ نائر ایسا نہیں کر سکتا تھا - موپلوں کا پیشوا جسے تھنگل کہتے ھیں راجہ کے ساتھہ ساتھہ پالکي پر سواري کر سکتا تھا -

---

* لوگن '' مالا بار '' جلد اول صفحہ ۲۳۱ -

کوچین کے راجہ (جسے زمورن کہتے ھیں) کی عرب سوداگروں پر بڑی مہربانی کی نگاہ تھی - اس کی اجازت سے راج میں بہت سے سوداگر آباد ہوئے ان کی تجارت سے راج کو مالی فایدہ پہونچا اور اُن کے بازوؤں کی قوت سے راج کی طاقت بڑھی -

زمورن نے آس پاس کے راجاؤں کو شکست دے کر ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیا - جہاں جہاں راجہ کا تسلط ہوا مسلمان سوداگروں نے ملکی قائم کی ' اِس طرح کالی کٹ کے بندرگاہ کی بنیاد قائم ہوئی - یہاں کا قاضی جسے وہاں والے "کویا" کہتے ہیں زمورن کا بڑا مددگار تھا - اس کی طرف سے ہمیشہ دوسرے راجاؤں کے خلاف لڑا کرتا تھا - اسی مدد کے سبب سے وہ جنوبی مالابار میں سب سے طاقتور* راجہ بن گیا اور اس نے "مہامکھم" کے میلے کا بندوبست جو ترموئی کے* مقام پر ہوتا تھا اس کے سپرد کیا - اس سے* اس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی -

کویا کے برابر علی راجہ کا گھرانا تھا جس کے نائک کولاتری راجاؤں کے بیڑوں کے سردار ہوتے تھے† -

ہندو راجہ مسلمانوں کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انہوں نے خود اپنی رعایا کو مسلمان ہونے کے لیے جوش دلایا؟ انہیں اپنے بیڑوں کے لیے ملّاحوں کی ضرورت تھی؟ اس لئے انہوں نے اجازت دی کہ مکوان قوم کے ہر گھر میں ایک یا دو آدمی اسلام قبول کرے -

نویں صدی کے بعد اسلام کا اثر دن پر دن بڑھتا گیا - مسعودی ‡ نے

---

* لوگن - مالابار جلد ۱ صفحہ ۲۷۸ لغایتہ ۲۸۰ انیز مالابار اینڈ انجینگو ڈسٹرکٹ گزٹیر صفحہ ۴۴ -

† لوگن - مالابار -

‡ ایلیٹ جلد ۱ -

سنہ ۹۱۶ع میں ھندستان کا سفر کیا - وہ لکھتا ھے کہ چول میں دس ھزار سے زائد مسلمان آباد تھے - اُن کا اپنا سردار تھا جسے ھزامہ† کہتے تھے - ابو دولاف مشعر بن المہلہل چول کي مسجدوں کا ذکر کرتا ھے - ابن سعید‡ نے تیرھویں صدي میں سمندر کے کنارے ھر جگہ مسلمانوں کو پایا - سرمارکو پولو§ نے دیکھا کہ لنکا کے راجے مسلمان سپاھیوں کو باھر کے ملکوں سے لا کر اپني فوج میں بھرتي کرتے تھے - ابوالفدا|| (سنہ ۲۷۳ءع سے ۱۳۳۱ ع تک) لکھتا ھے کہ کولم میں ایک خوبصورت مسجد اور مسلمانوں کا چوک تھا - ابن بطوطہ¶ نے کھمبائت سے لیکر سارے مالابار کے کنارے کا سفر کیا اُسے ھر جگہ پر مسلمان ملے اور وہ اچھي پھلتي پھولتي حالت میں تھے - اُس کا بیان ھے کہ گوا مسلمانوں کے قبضہ میں تھا - کندباد میں مسلمانوں نے اُس سے ملاقات کي ، کونکاہ میں اُس نے ایک پراني مسجد دیکھي وھاں پر اُسے حیدری درویشوں کي ایک ٹولي ملي -

سیلدہ پور میں بغدادی نمونے کي مسجد تھي - ھنور میں مسلمانوں کی سلطنت تھي اور کولن تک ھر بندر گاہ میں مسافرخانے تھے ' جہاں مسلمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا - سب مقامات پر

---

* فیران - ریلاسیان دي ریاز " Ferrand Relation de Voyayes) یاقوت کے بیان میں

† ھزامہ - ھنرمند کي بگڑی ھوئی صورت -

‡ فیران " ریلاسیان دي ریاز " ابن سعید کے بیان میں -

§ یول - دی بک آف سر مارکوپولو - جلد ۲ صفحہ ۲۱۴ -

|| یول- دي بک آف سر مارکوپولو - جلد ۲ صفحہ ۲۷۷ -

¶ مترجمہ - دی فریمری اے سانگی نیتیءابن بطوطہ - (Defremery et Sangui nette) جلد ۳ صفحہ ۵۵ اور بعد کے صفحے ·

مسلمانوں کی عزت تھی - بارسیلور اور مکانور میں مسلم آبادی کے ساتھہ اُن کے قاضی اور مفتی تھے - ملنگلور میں چار ہزار مسلمان بستے تھے جن میں فارس اور یمن کے سوداگر تھے - وہاں کی مسجد میں بہت سے طالب علم پڑھتے تھے - تیلون پٹلون میں مسجدیں تھیں اور مسلم محلے تھے -

عبدالرزاق * پندرھویں صدی میں ہندستان آیا اِس کے تھوڑے ہی دنوں بعد پرتگال والوں نے ہندستان کا راستہ معلوم کیا ' وہ کالی کٹ کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہاں پر بہت سے مسلمان ہیں ؛ اُن کے اپنے گھر ہیں ؛ دو مسجدیں ہیں جہاں وہ ہر جمعہ کے دن نماز پڑھتے ہیں -

ان بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان کے مغربی کنارے پر مسلمان اپنے مذہب کے قائم ہونے کے کچھہ ہی دن بعد آ کر بسے - اور اُن کی تعداد، دولت اور طاقت بڑی تیزی سے بڑھی - ہندستان کے مشرقی کناروں پر بھی عربوں کی پرانے زمانے میں بہت قدر و عزت ہوئی - جب دارا نے پانچویں صدی قبل مسیح میں دجلہ اور فرات کے دھانوں کو رکوادیا اور مصر کی تجارت کو فنا کردیا تو یہ تجارت یمن کے عربوں کے ہاتھہ لگی - عربوں اور یہودیوں کی نوآبادیاں لنکا اور جنوبی ہند میں قائم ہوئیں - یہاں پر یونانیوں اور رومیوں کے سوداگر پہلے ہی سے کاروبار کرتے تھے - اُن کے جہازوں کو بھی عرب ملّاح چلاتے تھے - اس لیے جب رومةالکبریٰ کا خاتمہ ہوا تو عرب سوداگروں نے اُن کی جگہ لی - عرب سوداگر چول منڈل (کارومنڈل) کے کنارے سے انڈمن ' آسام ' برھما ہوتے ہوئے چین چلے جاتے تھے -

---

* میجر انڈیا ان دی ففٹینتھہ سنیچری' سفرنامۂ عبدالرزاق -

عربوں نے مذهب اسلام قبول کرنے کے بعد اِس تجارت کو اپنے هي هاتهه میں رکھا - ۔ لیمان ابو زید سیرافي اور مسعودي کے بیانوں سے معلوم هوتا هے کہ مسلمان اِن راستوں سے اچھي طرح واقف تھے - اِن مسلم عربوں کي بڑي ملکتي تلے رلي ضلع کے کائل پٹنم شہر میں تھي - بشپ کالڈویل نے اس مقام پر مسلمانوں کے سکے ساتویں صدي (۷۱ هجري) سے لیکر تیرهویں صدی تک کے پائے -

یہاں پر مسلمانوں نے اپنا مذهب پھیلانے میں بہت کوشش کي اور اُس کا نتیجه یہ هوا کہ بہت سي هندو قوموں نے اپنا مذهب تبدیل کردیا - مدراس صوبے کي مسلم قومیں اپني ابتدا اُسي زمانے سے لگاتي هیں - مُدرا اور ترچناپلي کے راوتھوں* میں کئي پشتوں سے یہ روایت چلي آتی هے کہ اِنھیں ناتھڑولي نے مسلم بنایا - ناتھڑ کي قبر آج بھي ترچناپولي میں موجود هے - اور اُس پر اُس کے مرنے کا سال سنه ۴۱۷ هجري کُھدا هے - ناتھڑ کے بارے میں روایت هے کہ وہ ترک شاهزادہ تھا لیکن اُس نے سلطنت چھوڑ کر فقیري اختیار کرلي تھي - وہ عرب ، فارس اور شمالي هندستان میں گھومتا هوا دکھن میں ترچور (ترچنا پلی) میں آیا - یہاں آکر وہ بس گیا اور یہیں اُس نے اپني باقي زندگي گزار دي - وہ عبادت اور خیرات کرنے میں مشغول رهتا تھا اور اسلام کي تبلیغ کیا کرتا تھا -

سید ابراهیم شہید نے جس کی پیدائش ۱۱۶۲ ع کے لگ بھگ هوئي ، پانڈیوں کے راج پر تیرهویں صدي کے شروع میں چڑهائی کی - کہتے هیں کہ بارہ برس تک اُس نے ان پر حکومت کي لیکن آخر میں اِس کي شکست هوئي اور وہ مارا گیا - اس کي قبر اروازي میں هے -

---

* قادر حسین خاں - پہلے حوالہ دیا گیا هے -

بابا فخرالدین ایک فقیر تھا - جو پین کونڈا میں رہتا تھا ' اُس نے وہاں کے راجہ کو مسلمان بنایا اور وہاں پر مسجد تعمیر کي - توڈےکل ذات اُسي کو اپنا مرشد مانتي ھے - اُس کے مرنے کا زمانہ (سنہ ۱۱۹۸ ع) ۵۹۴ ھجري ھے -

مدورا * کے ضلع میں مسلمان ۱۰۵۰ع میں داخل ہوئے ؟ اُن کے سردار کا نام ملک العلوک تھا ' اِسي کے ساتھہ ایک بڑا درویش حضرت علي یار شاہ بھي آیا - یہ مدورا کي حضور کچہری میں دفن ھے - گوری پالن گاؤں میں ایک مسجد ھے جس کے لیے کُن پانڈیا نے گیارھویں یا بارھویں صدي میں چھہ گاؤں خرچ کے لیے خیرات میں دیے تھے - پانڈیوں کی خیرات کو سولھویں صدي میں ویرپا نائک نے جانچ کے بعد قائم رکھا -

مشرقي ساحل کے راجہ مسلمان سوداگروں کے ساتھہ اچھا برتاؤ رکھتے تھے - وہ نہ سخت محصول لگاتے اور نہ طوفان زدہ کشتیوں کو جو اُن کے بندرگاھوں میں پناہ لینے کے لیے مجبور ھوني تھیں مغربي راجاؤں کي طرح اپنے قبضہ میں کر لیتے تھے - ایک برائے نام محصول وصول کر لیتے تھے جو کسي کو گراں نہیں گزرتا تھا † -

اس دور اندیشي کي وجہ سے تجارت کو بڑي ترقی ھوئي ' اور کئی منڈیاں قائم ھوگئیں - چول منڈل کے ساحل پر اتنے جہاز ٹھہرنے لگے کہ اُس کا نام عربي میں معبر (راستہ) پڑ گیا -

وصّاف ‡ لکھتا ھے کہ معبر سمندر کے اُس کنارے کو کہتے ھیں جو کولم سے نلور تک پھیلا ھوا ھے - اِس کي لمبائي تین سو

---

* نلسن '' مدورا '' صفحات ۶۹ و ۸۲ -

† آئیگر - ساؤتھہ انڈیا - اینڈ ھر محمڈن انویڈرس -

‡ ایلیٹ - جلد ۳ صفحہ ۳۲ -

فرسنگ ہے - یہاں کا راجہ اپنے کو "دیو" سے ملقب کرتا ہے - چین ' ماچین ' ہند اور سندھ کے بیش قیمت مال سے لدے ہوئے بڑے بڑے جہاز جب یہاں سے گزرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اونچے پہاڑ ہوا کے بادبان لگائے ہوئے پانی پر تیر رہے ہیں - خلیج فارس کے جزیروں سے عراق اور خراسان' روم و فرنگ کے ملکوں سے خوبصورت و خوشنما چیزیں یہاں آتی ہیں اور یہاں سے چاروں طرف جاتی ہیں ' کیونکہ یہ ہندستان کی تجارت کا مرکز ہے -

بارھویں صدی میں مسلمانوں کی بڑی آبادی اُس صوبے میں تھی - وصاف * لکھتا ہے کہ کایل پٹنم میں کش کے حکمران ملک الاسلام جمال‌الدین نے یہاں گھوڑوں کی آڑھت قائم کی تھی - ہر سال دس ہزار گھوڑے فارس سے معبر آتے تھے اور اُن کی قیمت کا اندازہ بائیس لاکھ دینار تھا -

رشیدالدین † لکھتا ہے کہ سنہ ١٢٩٣ ع میں جمال‌الدین کائل پر قابض ہوگیا تھا ' اور اُس کا بھائی تقی‌الدین عبدالرحمن بن محمد طوی اُس کا نائب مقرر ہوا -

مارکو پولو ‡ نے لکھا ہے کہ تقی‌الدین سندر پانڈیا کا وزیر تھا ' اور اِس کا بیٹا سراج‌الدین اور پوتا نظام‌الدین اُس کے بعد جانشین ہوا - پانڈیا راجہ نے جمال‌الدین کے لڑکے فخرالدین احمد کو ایلچی بنا کر چین کے بادشاہ قبلہ خان کے یہاں ١٢٨٧ ع میں بھیجا تھا -

مسلمانوں کی اور بھی بستیاں تامل ملک میں آباد تھیں -

---

* ایلیٹ جلد ٣ صفحہ ٣٢ -

† ایلیٹ جلد ١ صفحہ ٦٩ و ٧٠ -

‡ یول' حوالہ دیا جا چکا ہے

امیر خسرو * نے خزائن‌الفتوح میں لکھا ہے (علیگڈہ کا ایڈیشن صفحہ ۱۶۱ و ۱۶۲) کہ کندور (کنانور) کے شہر میں مسلمانوں کی بستی تھي ؛ جس کو ملک کافور نے مسلم ہونے کي وجہ سے معاف کر دیا ؛ گو کہ وہ لوگ قتل کیے جانے کے قابل تھے - ابن بطوطہ † نے ملک کافور کے حملے کے کچھہ برسوں بعد اس صوبے کا سفر کیا - وہ لکھتا ہے کہ اُس وقت مدورا پر غیاث‌الدین ادم غاني حکومت کرتا تھا - اور راجہ بیر بلّال کي فوج میں بیس ہزار مسلمانوں کا دستہ تھا - بیر بلّال کے صوبےدار ہري اپااوتیار کے ماتحت "ہوناور" میں ایک مسلمان حاکم تھا - ان بیانات سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے تھوڑے ہي دنوں بعد مسلمانوں نے ہندستان پر اپني تہذیب ؛ مذہب اور خیالات کے پھیلانے کا موقع حاصل کر لیا - ساتویں صدي سے تیرھویں صدي تک ان کا تعلق تجارت کي صورت میں تھا - اور سوداگروں کي حیثیت سے شروع میں اُن کي آؤبھگت ہوئی ؛ جب ہندو راجہ اُن سے واقف ہو گئے تو اُن کی وقعت اور بھي بڑھ گئي - وہ بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہوئے - اُن میں سے وزیر ، بیڑوں کے کمانڈر ؛ ایلچي ؛ افسران محاصل اور فوج کے کپتان وغیرہ مقرر ہونے لگے - اُن کو اپنے مذہب کی پابندی کے لیے مسجدیں بنانے کی اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور فقیروں کو خانقاہوں میں رکھنے کي اجازت تھی - صرف یہی نہیں بلکہ وہ کُھلّم کُھلّا

---

* ایلیٹ جلد ۳ صفحہ ۹۰ -

† ابن بطوطہ دي تریمری سانگینیتي جلد ۳ - صفحہ ۱۹۹ اور ساؤتھہ انڈیا اینڈ ہر محمڈن انویڈرس -

اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے تھے اور کہیں کہیں تو راجہ خود اس تبلیغ میں مدد کرتے تھے - لیکن صرف جنوبی دکھن تک اس پُر امن اثر کے حدود نہ تھے بلکہ شمالی ہندستان میں بھی مسلمانوں کا ہندؤں سے بہت دنوں تک اِسی طرح کا تعلق رہا - یہ سچ ہے کہ آٹھویں صدی کے اوائل میں عربوں نے سندھہ پر قبضہ کر لیا ، لیکن مُلتان اور سندھہ کو چھوڑ کر اور کوئی حصہ تین سو برس تک اُن کے قبضے میں نہیں آیا -

اس مغربی صوبے پر تو مسلمان حاکم تھے لیکن کاٹھیاوار ، گجرات اور کونکن میں وہ صرف سوداگروں کی حیثیت سے رہتے تھے - دائبل ، سومنات ، بھروچ ، کھمبائت ، سندان ، اور چول وغیرہ بندرگاھوں میں مسلم نوآبادیاں تھیں اور مسجدیں ، خانقاھیں اور محلے قائم تھے -

مغربی ہندستان کے ہندو راجاؤں نے بھی اُن کا خیر مقدم کیا - سلیمان ، مسعودی ، ابن حوقل اور ابو زید یہ سب سیاح ، بلہارا ، یعنی گجرات کے بلمبھی راجاؤں کی بڑی فراخدلی سے تعریف کرتے ھیں - اور مسلمانوں کے ساتھہ اُن کی دوستی اور محبت تسلیم کرتے ھیں - سلیمان * لکھتا ہے " ہندستان کا کوئی اور راجہ عربوں سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتا جتنی کہ بلبھہ راے ، اور اُس کی رعایا راجہ کے مثال کی تقلید کرتی ھے - مسعودی جہاں جہاں گیا اس نے اپنے ہم مذہبوں کو مذہبی عبادات میں آزاد پایا - گجرات کے راجہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے " اس کے راج میں اسلام کی عزت اور

---

* رینو ، ریلا سیاں دي ویاز -

حفاظت هوتي هے - ملک کے هر حصے میں بڑی بڑي مسجدیں هیں جہاں روز پانچوں وقت نماز پڑھی جاتي هے * - ؟؟

الاصطخري † نے سنہ ۹۵۱ ع میں هندستان کا سفر کیا - وہ کہتا هے که گجرات کے سب ملکوں میں مسلمان آباد هیں اور راجا نے مسلمانوں هي کو اُن کا افسر بنایا هے - ابن حوقل نے فمحّل ؛ سندان ؛ سیمور اور کھمبایت میں جامع مسجدیں دیکھیں - ادریسي نے گیارھویں صدي میں مسلمان سوداگروں کو بڑي تعداد میں انہل واڑے میں تجارت کرتے پایا - وہ لکھتا هے که راجا اور اُس کے وزراء اِنھیں عزت کے ساتھ اپنے دربار میں بلاتے هیں - اور اُن کي هر طرح مدد کرتے هیں -

شمالي هندستان کے مغربي ملکوں میں مسلمانوں کي حالت ویسي هي هوگئي تھي جیسي مغربي اور جنوبي هندستان میں - محمود غزنوي کے حملوں کے پہلے هي اِنھیں اپنے مذھب اور رسوم کے پھیلانے کا موقع مل چکا تھا - هندو راجا خود اُن کے اثرات پھیلانے کے باعث تھے - محمد عوفي ‡ لکھتا هے که جب کھمبیات کے هندوؤں نے مسمانوں سے جھگڑا کیا تو مہاراجا سدھه راج نے کل معاملے کي جانچ کي اور اور فسادیوں کو سزادي - مسلمانوں کا جو نقصان هوا اُس کا بدلا دیا اور اپنے خرچ سے اُن کي مسجد بنوادي - یہی نہیں بلکه کئي هندو راجاؤں کي فوج میں مسلمان سپاهي بھرتي تھے - سومنات کے راجا کي فوج میں کئي مسلم افسر تھے - احمدآباد کے قصباتي اپنے کو بگھیل راجاؤں کے خراساني سپاهیوں کے خاندان سے بتاتے هیں§ -

* ایلیٹ جلد ۱ صفحه ۲۹ -
† ایلیٹ جلد ۲ صفحه ۱۶۴ -
‡ ایلیٹ جلد ۲ صفحه ۲۴۱ -
§ مصنفه میر غلام علي آزاد ماثرالکرام صفحه ۲ -

مسلمان فقیر اور صوفي، سوداگروں اور سپاهیوں کے ساتھه ساتھه چلتے تھے - نویں صدي* میں ابو حفص رابع بن صاحب الاسدي البصري ایک تارک الدنیا محدث سندھه میں آیا - اُس کي وفات ۱۶۰ ھ (سنه ۷۷۶ع) میں هوئي - دسویں صدي میں مشهور صوفي منصور حلاج† سندر کے راستے سے هندستان پهونچا اور خشکي کے راستے شمالي هندستان هوتا هوا ترکستان گیا، گیارهویں صدی میں بابا راهن‡ درویشوں کے ساتھه بغداد سے بهڑوچ آیا - کہا جاتا هے کہ اُس نے راجا کے لڑکے کو مسلمان بنایا - سنه ۱۰۶۷ع میں بوهروں§ کا شیخ یمن سے گجرات آیا - سنه ۱۰۹۴ع اور ۱۱۴۳ع کے بیچ میں نورالدین|| یعني نورستگر نے گجرات کے کنبي کهنوا اور کوریوں کو اپنے مذهب کا پیرو بنایا -

محمود کے حملوں کے بعد بہت سے مسلمان عالم اور درویش هندستان میں آئے ، جن کا ذکر خالي از طوالت نهیں هے - عربي اور فارسي کي سوانح عمریوں کي کتابوں میں سیکڑوں نهیں هزاروں نام ملتے هیں - کچهه کے نام یہاں دینا نامناسب نه هوگا -

علي بن عثمان، الهجویري¶ جس نے کشف المحجوب تحریر کي، غزنی کا رهنے والا تها - لاهور میں آ کر بسا اور ۴۶۵ ھ (سنه ۱۰۷۲ع) یا ۴۶۹ ھ (سنه ۱۰۷۶ع) میں اُس کی وفات هوئی - شیخ اسمعیل**

---

* میر غلام علي آزاد ماثرالکرام صفحه ۹ -

† کیمبیل بیورٹ اینڈ بروچ (گزٹیر آف گجرات) صفحه ۵۲۸ -

‡ ایل میسي نیاں کتاب الطا و سین مقدمه صفحه ۵ -

§ فاربس — '' راس مالا '' -

|| آرنلڈ - پریچنگ آف اسلام باب هندستان -

¶ کشف المحجوب مرتبهٔ نکلسن مقدمه -

** آرنلڈ متذکرہ بالا -

بخاري گیارھویں صدي کے شروع میں یہاں آیا ۔ فریدالدین عطار * جو تذکرۃالاولیا اور منطق‌الطیر کا مصنف ھے بارھویں صدي میں یہاں آیا ۔ شیخ معین الدین چشتي† سنہ ۱۱۹۷ع میں اجمیر پہونچے ؛ یہ کہا جاتا ھے کہ راے پتھورا اُس وقت زندہ تھا ۔ اجمیر کے مندر کا مہنت راے دیو تھا ؛ اور سلطنت میں اجیپال بڑا جوگي تھا ۔ اِن دونوں نے شیخ معین الدین چشتي کے ھاتھوں پر مذھب اسلام قبول کیا ۔ چشتیہ سلسلے کے بڑے بڑے صوفیوں میں قطب الدین بختیار کاکی ؛ فرید الدین گنج شکر ؛ نظام الدین اولیا وغیرہ وغیرہ تھے ۔ سہروردي سلسلہ والوں میں جلال‌الدین‡ تبریزي ؛ قادریوں میں جلال الدین بخاري ؛§ بابا فرید پاک|| پتني تھے ۔

عبدالکریم جیلي¶ جس نے اھل تصوف کے زبردست عالم ابن‌العربي کي کتاب کی شرح اور انسان کامل لکھی ھے سنہ ۱۳۸۸ع میں یہاں آیا ۔ اسي صدی میں سید محمد گیسو دراز** نے مہاراسٹر میں اسلام پھیلایا ۔ پھر صدرالدین†† نے خوجہ فرقے کي بنیاد ڈالي ؛ اور سید یوسف الدین‡‡ نے میمن فرقے کي ۔ اِن صوفیوں کے علاوہ بہت سے فقیر جو کسي ملک سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور جن کا مذھب کسي قاعدے

---

* تذکرۃالاولیا مرتبۂ نکلسن ۔

† عبدالحق اخبارالاخیار صفحہ ۲۲ ۔

‡ ایضاً ایضاً صفحہ ۴۵ ۔

§ ایضاً ایضاً صفحہ ۶۰ ۔

|| یکالف دي سکھ ریلیجن جلد ۳ صفحہ ۳۰۲ ۔

¶ نکلسن ۔ اسٹڈیز ان اسلامک مسٹي‌سیزم صفحہ ۸۱ ۔

** آرنلڈ متذکرہ بالا ۔

†† بامبے گزٹیر جلد ۹ حصہ ۲ صفحہ ۴۰ ۔

‡‡ ایضاً ایضاً صفحہ ۲۷ ۔

کا پابند نہ تھا ' - ملک میں پھرتے تھے - سخی سرور * ست گُرپھر اور شاہ مدار+ کے نام اِن میں بہت مشہور ہیں -

بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام تلوار کے زور اور مسلمان بادشاہوں کی طاقت کے سہارے سے اس ملک میں پھیلا - ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا ' کیونکہ مسلمان بادشاہوں میں صرف تین یا چار ایسے ہوئے جنہوں نے مذہب کے پھیلانے کی کوشش اپنی قوت حکمرانی کے ذریعہ کی - لیکن تیرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک پانچ سو برس کے ہندستان کی تاریخ میں سیکڑوں چھوٹے بڑے سلطانوں' بادشاہوں اور شہنشاہوں میں صرف تین یا چار کی وجہ سے ہم یہہ نہیں کہہ سکتے کہ حکمرانی کی قوت سے مذہب پھیلایا گیا - فیروز ' سکندر ' زین العابدین ، اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان کے ناموں کے علاوہ کوئی ایسا نام مشکل سے ملیگا جس کے لیے کہا جائے کہ اُس نے اسلام کے پھیلانے میں حکومت کی طاقت سے کام لیا -

یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ دولت ' عہدوں' مرتبوں اور خطابوں کے لالچ سے بہت سے ہندوؤں نے اپنا مذہب تبدیل کیا - حاکموں کی خوشامد کمزور آدمیوں سے بہت کچھہ کرا لیتی ہے ' لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح مذہب کا پرچار تلوار کے ڈر سے ہوا -

سچ تو یہ ہے اسلام کا اثر تیرھویں صدی تک دکن میں بلا کسی غیر واجبی دباؤ کے پڑا - شمال میں بادشاہت قائم ہونے سے پہلے ہی مسلمان آچکے تھے - بادشاہت کے قائم ہو جانے کے بعد اسلامی تہذیب کی اشاعت نہ صرف امیروں ' مالکوں اور سلطانوں کے باعث

---

* ارنلڈ دی سینٹس اینڈ مار ٹرس آف انڈیا -

+ ایضاً ایضاً ایضاً

بلکہ زیادہ تر فقیروں، درویشوں اور صوفیوں کی وجہ سے ہوئی - یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صوفی اور فقیر اسلام کے مبلّغ ہوتے ہوئے بھی حکومت کی اندھا دھند پیروی نہیں کیا کرتے تھے - حکومت کے مذہبی محکمے کے قاضیوں اور مفتیوں سے اِن درویشوں کی ہمیشہ اَن بَن رہتی تھی - یہی ٹھیک بھی ہے - قاضی کٹّر قانون کے پابند ، درویش خدا کی بندگی میں مست ، ضابطوں میں بندھے ہوئے لوگوں میں اور پریم کے متوالوں میں کیسے نبھہ سکتی تھی - مسلمان سلطنتوں کی تاریخ کے صفحات اِن جھگڑوں سے بھرے پڑے ہیں - درویش سلطنت کی اندھی اطاعت نہیں کرتے تھے - لیکن مصلحت اندیش بادشاہ اِن سے بہت سے کام لیا کرتے تھے - بادشاہ اُن سے صلاح لیتے ، سفیر کا کام کراتے اور شہزادوں ، صوبہ داروں اور امیروں کے جھگڑے نبٹواتے تھے - کمزور رعایا انہیں اپنا مددگار ، دکھہ درد کا ساتھی اور شاہی بے انصافیوں سے بچانے والا سمجھتی تھی -

یہ واقعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بہت سے صوفی فقیر اونچے اور فیاض طبیعت کے لوگ ہوتے تھے - اِن میں سے کتنے ہی ایسے تھے جنھوں نے گھر بار ، اور مال دولت ، کو لات مار کر دنیا سے منھہ موڑ لیا تھا اور خدا کی محبت میں دنیا کو ترک کر کے ذکر ، شغل اور مراقبے میں طبیعت کو غرق کر دیا تھا - اِن فقیروں کی آتما طاقتور تھی ، اِنہیں کسی کا خوف نہ تھا ، اُن کا دل بندگی اور محبت کی کیفیتوں سے لبریز تھا ، وہ اسلامی یکجہتی اور مساوات کے اصولوں کے حامی تھے - اسی لیے اچھوتوں ، گرے ہوئے لوگوں اور غریبوں کو سماج راج ، پنڈتوں اور عالموں کے ستائے ہوئے مصیبت زدوں کو

ان کي باتوں میں الہام، ان کے کاموں میں کرامات اور ان کي سیرت میں خدائی کی جھلک نظر آتي تھي -

غریب اور مصیبت زدہ لوگ ھی نہیں امیر، راجا، اور پروھت بھي کبھي اِن کے روحانی انوار سے متاثر ھو جاتے تھے - اور ان کي طرف کھنچے آتے تھے، اور اپنے پرانے رسم و رواج کو چھوڑ کر اُن کے عقیدوں اور اُن کے سلسلوں کو قبول کر لیتے تھے -

ثنوي حزن اختر اور خصوصیات مصنف

(از مولانا احسن مارهروي أردو پروفیسر انٹرمیجیٹ کالج علیگڑہ)

۲ - اِنہماک نشاط اور اس کے متعلقات

نیا اور دنیا کے عیش و نشاط کے لیے غریب واجد علي شاہ هي زام نہیں؟ بلکہ جب سے مسلمانوں میں عجمي معاشرت پیوست ے اُس وقت سے اِس وقت تک کوئي خلیفہ؟ کوئي ظل‌الله؟ کوئي ؟ کوئي والی ملک اور کوئي فارغ‌البال انسان اپني شبستان عشرت بوریا نشین بن کر دعاے گنج‌العرش پڑھتا نظر نہیں آیا - بات کہ اکثر پراني داستانیں کرم خوردہ کتابوں میں دب کر فرسودہ ي هیں اور بعض نیم مردہ حکایتیں جو ابهی زبانوں پر باقي وهي دنیا میں نقل مجلس بنا کر طشت از بام هوتی رهتی -

« بد اچها بدنام برا؟» یہ مثل جان عالم اختر پر پوري صادق آتي ہے ہارے خیال میں اس کا سبب تفضیح زیادہ تر خود اُن کی تصانیف ، هیں -

گل و گلچیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار هوئی اپني صدا کے باعث

بدنام عیش پرستوں میں جس قدر دهلي کے محمد شاہ رنگیلے اور لکھنؤ کے جان‌عالم پیا تمام بادشاهوں میں پیش پیش هیں اِس قدر کوئی دوسرا بادشاہ نظر نہیں آتا ـ لیکن حجابات نظر فریب اگر هٹادیے جائیں تو حمامِ عیش پرستي کي عام عریاني نمایاں هوجائے گي ـ اس مضمون میں سلاطین ماضی کي پردہ‌دري منظور نہیں ، مثالاً ایک واقعے کي مطابقت و مماثلت دکها کر ناظرین کو قراین قایم کرنے کا موقع دیا جاتا هے ـ

محمود غزنوي کي ایاز نوازی محتاج تشریح نہیں، اور قصص و حکایات سے قطع نظر کر کے صرف ایک مشہور واقعہ لکها جاتا هے :—

"ایک دن بزمِ عیش میں بادۂ و جام کا دور تها، محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ پي کر بدمست هوگیا ، اسي حالت میں ایاز پر نظر پڑی، اُس کي شکن در شکن زلفیں چهرے پر بکهري هوئي تهیں ، محمود نے بے اختیار اُس کے گلے میں هاتهہ ڈالدیے، لیکن فوراً سنبهل گیا اور جوشِ تقویٰ میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکهدے، ایاز نے فوراً حکم کي تعمیل کی ، صبح کو جب محمود سو کر اُٹها تو ایاز کي صورت دیکهہ کر سخت مکدر هوا ، بار بار اُٹهہ اُٹهہ کر بیٹهہ جاتا تها ، ندما اور مقربین دم بخود تهے آخر علی قریب نے جو حاجب خاص تها عنصري کو بلا کر صورتِ‌واقعہ بیان کي ، عنصري نے محمود کے سامنے جا کر یہ رباعي پڑهي :—

گر عیب سر زلف بت از کاستن است

نے جاے بہ غم نشستن و خاستن است

وقت طرب و نشاط و مے خواستن است
کاراستن سرو ز پیراستن است

یعني معشوق کي زلفیں اگر ترش گئیں تو رنج و غم کی کیا بات ھے ؟ یہ تو اور خوشی کا موقع ھے اس لیے کہ جب سرو چھانٹ دیا جاتا ھے تو اور زیادہ موزوں ھو جاتا ھے ""

(شعرالعجم جلد اول - ص ۹۲)

اسی عشوہ پرستي کے سلسلے میں واجد علی شاہ کا انداز دیکھیے :—

"واقعہ یہ ھے کہ بادشاہ عورتوں کے عشق میں دیوانے ھو رھے تھے - اور بعض حسینوں سے اس درجہ محبت تھی کہ قید میں جب اُن کے وصل سے محروم تھے تو ھر وقت اُنھیں یاد کیا کرتے اور بار بار اُن سے یادگار محبت کے طور پر اُن کی خاص خاص چیزیں مانگ بھیجا کرتے؟ بعض فرمایش پوری کر دیتیں تو خوش ھوجاتے اور بعض ناز آفرینی اور شوخ ادائی کے انداز سے نہ بھیجتیں تو شکایت کرتے - دلدار محل سے اُن کی مسی مانگی اُنھوں نے بھیج دي ؟ اختر محل سے اُن کی زلفوں کے بال منگوائے اُنھوں نے بھیج دیے جن کو ھمیشہ سرھانے نظر کے سامنے رکھتے اور بار بار سونگھتے - ""

(مقدمہ حزن اختر نوشتہ مولوي عبدالحلیم شرر ص - ۲۲)

اس بیان کی تصدیق خود بادشاہ یوں کرتے ھیں ؟ :—

طبیعت بہت میری گھبرائی جب
کیا پاے قیصر کا چھلّا طلب
کٹے ناخنِ دستِ معشوق سے
طلب یہ کیا دل کے صندوق سے

ملکائی پھر اِک شے یہ اک یار سے
مسّی شب آلودہ دلدار سے
یہ اختر مدل سے کہا اے قمر
ذرا بھیج دے اپنے تو موئے سر
کہا جعفری سے کہ اے خوش جمال
مجھے چاہیئے تیرے منہ کا اُگال
کہ آگے بھی بھیجا تھا تونے اُگال
ملکا کر مرا خوش ہوئی تھی کمال
اس اختر کا تو کہا چکی ہے اُگال
نہ کر بھیجنے میں تو اب قیل و قال
انگوٹھی بھی بھیجی تھی تونے مجھے
دیا سفل تجھہ خوش گلو نے مجھے
دُلائی بھی اِک؟ اِک دوپٹہ بھی یار
مجھے بھیجا تھا شک نہیں زینہار
اُبٹنا بدن کا عنایت ہوا
مجھے پھوک پھر پان کا بھجوا ذرا
کہا جعفری نے کہ سن اے جواں
کہاں میں؟ کہاں تو، کہاں یہ بیاں
ملکا اُس سے جس کو دیے ہیں ہزار
بہت جس کا سینے میں ہو تیرے پیار
نہ بھیجوں گی میں تجھہ کو اپنا اُگال
دیا کچھہ نہ اُس نے سوائے ملال
دیا ملکۂ ملک نے یہ پیام
کہ میرا ہے دنیا میں معشوق نام

ملکا اُن کے ناخن جو کرتی هوں پیار
وہ بھیجیں جو هوں آپ کی راز دار
جو مانگے هیں ناخن نهیں هیں وہ اب
یہ حجام کا کام سیکھا هے کب
دیا مجھہ کو دلدار نے یہ جواب
نہ بھیجی مسی تو نہ کرنا عتاب
طبیعت مری هے نہایت علیل
نکلتی نهیں بھیجنے کی سبیل
تو پھر بولی یوں قیصرِ نامدار
نہ کر مجھہ کو معشوقوں میں تو شمار
مرے پاس چھلا کہاں اے جواں
کہاں هے کہاں هے کہاں هے کہاں
کسی کی نہ مجھہ پر عنایت هوئی
کسی کی نہ زنداں میں چاهت هوئی
نہ بھیجی کسی نے مجھے کوئی چیز
کسی نے نہ دی دوستی کی تمیز
مگر هاں اک اختر محل هے لئیق
وہ زنداں میں میری هوئی هے رفیق
وهیں موئے سر مجھکو بھجوا دیے
بلا جس طرح مجھکو پهونچا دیے
رکھے موئے سر میں نے دل کے قریں
یہ سمجھا کہ دل میں هے وہ مہ جبیں

(از مثنوی حزن اختر مطبوعہ سلطان المطابع - ص ۱۲۸ تا ۱۳۰)

ہرچند محمود اور اختر کے زمانوں میں کم و بیش آٹھ سو نو سو برس کا تفاوت ہے لیکن دل کے جذبات کا عالم متغیر نہیں؟ یہ امر آخر ہے کہ اس فطری شوق و ذوق کو عشق و مستی سے تعبیر کیا جائے یاھوس پرستی سے -

تم جسے چاہو چڑھالو سر پر - ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھہرے

واجد علی شاہ کی عیش سامانیوں اور اُن کی تصدیق و تکذیب کا بغیر ثبوت، کامل ہمیں کوئی حق نہیں - بجز اس کے کہ شاہ موصوف کے کلام نظم و نثر کا کچھہ اِنتخاب درج کردیا جائے جس سے ناظرین خود اندازہ کر سکیں کہ ان گرد و پیش واقعات اور ایسے ماحول میں قرائن کیا رھنمائی کرتے ھیں -

اس سے پہلے کہ ان کے خود نوشت اقتباسات اشعار کو پیش کیا جائے شاہ اختر کی دینداری اور اخلاقی استواری کا موازنہ بھی محمود غزنوی کے جوش تقویٰ سے کر لینا چاہیے جیسا کہ شعرالعجم کے اقتباس سے معلوم ھوتا ھے :—

مولوی علی حیدر طباطبائی اور مولوی عبدالحلیم شرر جنھوں نے اپنی آنکھوں سے کم و بیش مٹیا برج کی مٹتی ھوئی بہاریں دیکھی ھیں لکھتے ھیں :—

۱ - ۲۳ شوال ۱۲۷۳ ھ (۱۸۵۶ع) صبح کا وقت تھا بادشاہ وظیفے میں مشغول تھے کہ دھلی طرف . مڑ کر دیکھا کہ دریائے بھاگرتی میں تین جنگی جہازوں نے ایوان شاھی کے محاذی لنگر ڈال دیا . . . . ." ماخوذ از رسالۂ ادیب مارچ سنہ ۱۹۱۲ع صفحہ ۱۵۷)

۲ - " لوگوں میں شہرت ھے کہ عیش پرستی نے اُن کو زناکاری میں مبتلا کر دیا تھا مگر عہد شاھی کے واجد علی شاہ کو میں نہیں جانتا ؟ مٹیا برج کے واجد علی شاہ

شاہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تو اتقا و پرهیزگاري ، خدا ترسي اور خدا پرستي کي مجسم تصویر تھے ..... حضرت جان عالم کو اگر واقعي الزام دیا جا سکتا ھے تو موسیقي کا الزام ھے - اِس فن کو اُنھوں نے ابتداے عمر سے حاصل کیا تھا جس کي طرف طبعي رجحان تھا اور اُس کا شوق اُن کے دل و دماغ میں اِس درجه راسخ هو گیا تھا که اچھا گانا چاھے کیسے هي اتقا و پرهیزگاري پر آمادہ هوں تو به توڑوا دیا کرتا - (مقدمۂ حزن اختر نوشته شرر صفحه ۱۰ و ۱۱)

ناٹک ساگر کے مصنفین نے "شاهان اسلام اور هندستاني ڈراما" کے تذکرے میں واجد علی شاہ کے راجه اندر بننے اور اندر سبھا وغیرہ کي جو بحث کي ھے اُس کا سلسله بہت طویل ھے - رسالہ اُردو اورنگ آباد اور دلگداز لکھنؤ میں کئی مضامین اس کے متعلق شائع هوئے هیں - همیں اس بحث میں پڑنے کي ضرورت نہیں که واجد علي شاہ نے اِندر سبھا امانت کا ڈراما قیصر باغ میں شروع کیا یا اپنا رهس مبارک ، اور وہ راجه اندر بنے یا کنھیا جي - جس کو اِس مباحثے کي تفصیل دیکھني منظور هو وہ ناٹک ساگر صفحه (۳۵۴) اور رسالہ اُردو اورنگ‌آباد (اپریل سنه ۱۹۲۷ع) کا مطالعه کرے -

---

اِس مضمون میں صرف یه دکھانا مقصود ھے که واجد علي شاہ کا انہماک نشاط کس قدر تھا اور اس کے متعلقات کیا تھے ، جن کا وقوع اختلاف کے باوجود ثابت ھے یعني شاہ اختر خواہ راجه اندر بنتے هوں یا کنھیا جی ، بہر حال تھے منہمک نشاط

اب رهي اسباب و متعلقات كي تحقيقات ؟ وه حسب ذيل اقتباسات سے حاصل کی جاے :—

۱ - اپنے پیارے جوڑے کو حال درد دل پُر ملال لکھتا هوں ؟ رنگ هجر و وصال لکھتا هوں - اے بلقیس ! اے رشک برجیس ! بڑي دير سے هم آئے هیں ؟ جھاڑ کنول تمہارے لیے بارہدري سکندر باغ میں سجوائے هیں ؟ صاحب ؟ تم کہاں تھیں ؟ یہاں تھیں نہ وهاں تھیں - خدا کے واسطے سچ بتاؤ ذرا هاتھہ تو ادھر لاؤ - میرا دل دیکھنا کیسا دھڑکتا هے - مثل طائر مذبوح پھڑکتا هے - لو پھر میں اب سوار هو جاؤں تمہارے واسطے بھي گاڑي چوکڑی تیار کروا منگواؤں - کوچوانوں کي آنکھوں پر پٹیاں بندھوا دوں - جوانان چمن پھر رهے هیں کوئی قصہ پڑھکر انہیں بھي کھسکا دوں ؟ آب شبنم سے برگ درختاں دھو جائیں ؟ ملکۂ عالمیاں سلامت ! اب همارے تمہارے وصل کے موقعے هو جائیں - حمام سکندر باغ تیار هے حکم دیجیے تو خزانے کا پانی حوض کي تہ میں بھی خزانۂ بالا کھلوا دوں - آبشاروں کو اپنے حال زار پر رلوا دوں ,, . . . (رسالہ مخزن لاهور مرحوم شاہ اودھہ کے خطوط ستمبر سنہ ۱۹۰۵ع -)

۲ - جانِ جاں ! تم جو بدر عالم کو جان عالم کي دلهن لکھتے هو - جواب بدر عالم :—

اے خورشید تاباں جس روز سے تم برج حمل کو گئے هیں بدر سے هلال ' غمگیں کمال هوئي جو دلهن کہتے هو ؟ حق تعالیٰ وہ دن لائے کہ دولھا مع برات آئے -

عروس شب گھونگھٹ فراق کو ہٹا کر مصحفِ رخسار دکھائے ، شربت وصل پلائے جب دلہن کہلا ۔ "

۳ - جانِ عالم ! جب ہمارا دل تمہاری محبت میں گھبراتا تھا بغیر دیکھے چین نہ آتا تھا ، بے تاب ہو کر تمہارے دیکھنے کو آتی تھی ، اور جس وقت جلسہ معشوقوں کا تمہارے پاس پاتی تھی ، جل بھن کر خاک ہو جاتی تھی - عاشق ہیں مگر جلے تن ہیں ، اُن عاشقوں میں نہیں ہیں کہ ہمارے سامنے تم اوروں کو .... گلوریاں دو ، ہمیں جلاؤ ، کیا کریں ہمیں تو برداشت غیر کے سایہ دیکھنے کی بھی نہیں ، دیکھہ کر چلی آتی تھی ہماری بہن صاحبہ ہم کو دھمکا کر باز رکھتی نہیں نہیں تو ہم اسی زمانے میں تم سے لڑتے اور اپنی جان دیتے -

۴ - میرے اختر جلیا پر واضح ہو کہ حسب سررشتۂ قدیم زنجیرھاے منتی ایک طلائی اور ایک نقرئی اِس پابند سلسلۂ تعشق نے بھجوائی ہیں اپنے پیارے جانی کی سلامتیاں منائی ہیں ، جان عالم تم کو میرے سر کی قسم بر فور پہنچنے کے اِن زنجیروں کو گلے میں ڈال لیجیے گا اس منتونہ دور اُفتادہ کو شاد کیجیے گا ، کس واسطے کہ دور ہوں ، اِس سے مجبور ہوں اگر پاس ہوتی جس طرح تم پہلتے پہلاتی ارمان دل کا نکالتی مزا اُٹھاتی -......

(خطوط نواب بدر عالم " موسوم بہ تاریخ بدر " مرتبۂ واجد علی شاہ اختر صفحہ - ۲۹ و ۳۲ و ۳۳ و ۴۳)

ایسے مکتوبي مضامین اگر چه لفظاً مجاز مرسل کا لباس مستعار پہلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن معلي اپنے موضوع حقیقت کے دامن گیر رہتے ہیں -

مثنوي حزن اختر میں جہاں جہاں اپنے پسندیدہ مشاغل اور بیگموں کے تذکرے کیے ہیں اُن اشعار کو پڑھکر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس کا مصنف نه صرف طبعاً اور فطرةً عیش پسند اور کمزور طبیعت کا آدمي ہے بلکہ غیر وضعي طور سے نسائیت کي طرف زیادہ رجحان رکھتا ہے - ایک جگہ اپنے ضعف ونقاهت کے بیان میں لکھا ہے :—

یہ احوال اعضا ہے جیسے کباب
نہ زلفوں میں دل ہے نہ وہ پیچ و تاب
کلائی کا عالم یہ ہے کم ہوئي
کہ پنجہ جو گل سے کیا خم ہوئي
یہ گالوں کا عالم ہے اے خوش خصال
ہوے بدر کامل سے گھٹ کر ہلال
لویں کانوں کي دونوں مرجھا گئیں
گُلِ تر کي کلیاں تھیں کُمھلا گئیں
وہ سینہ جو تھا تختۂ نور سا
وہ مُکھڑا جو تھا خوشنما حور سا
ہوئے اس قدر دونوں غم سے نحیف
کمیں میں ہوں جس طرح سے دو حریف

مثنوي حزن اختر صفحہ (۸ و ۹ و ۱۰)

ان اشعار میں زلفوں کا پیچ و خم ، کلائی کی گل سے پنجہ کشي - گالوں کا بدر کامل و ہلال ہونا ، ان کي لویں اور گل تر کي کلیاں پھر سب پر طرہ یہ کہ اپنے چہرے کو مکھڑا کہنا ،

کسي طرح کسي مرد آدمي کے منھہ سے بھلا نہیں معلوم ہوتا - الغلاصہ، یہی وہ متعلقات نشاط ہیں جن کي وجہ سے وہ باوجود فني علم، خوش اطوار، سلیم‌الطبع اور دین دار ہونے کے اپنے اوقات اچھے مشاغل میں بسر نہ کر سکے اور آخر میں ہمیں پھر کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب اُن کي بے محل صاف گوئیوں کا نتیجہ ہے کہ اُن کے بعد مورخین و مصنفین کو اس قسم کے استدلال و اجتہاد کي گنجایش نظر آئي، جس کي تائید میں نانک ساگر کے (صفحہ ۳۶۱) پر یہ عبارت (صحیح یا غلط) لکھي گئي :-

"یہ تو مسلمہ ہے کہ واجد علي شاہ رہس میں پارٹ کیا کرتے تھے اور یہ بھي مخفی نہیں کہ اختر پیا کي تمام زندگی ایک ڈراما ہے جس میں وہ کبھي نئي نویلي دلھن، کبھي سہاگ‌لُٹی بیوہ، کبھي دردوں کی ماري زچہ کي شکل میں دکھائي دیتے ہیں -

بہر حال اب اس تذکرہ انہماک نشاط کو مولوي عبدالحلیم شرر مرحوم کي اس عبارت پر ختم کیا جاتا ہے :—

جب ہم بہت سے بزرگان دین کو صحبت غنا کا لطف اٹھاتے دیکھتے اور تعرض نہیں کرتے ہیں تو واجد علي شاہ مرحوم کے معاملے کو بھي خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور امید ہے کہ برگشتہ بخت تاجدار اودھہ کے اس جرم کو وہ اُن کی اور نیکیوں کي صلے میں معاف کردے گا -"

(۳) زوال سلطنت

یہ عنوان بہت پیچیدہ اور دردناک ہے، پیچیدہ اِس لیے کہ اِس میں

بے شمار سیاسی عقدے ہیں ؟ اور درد ناک اس لحاظ سے کہ ایک بھولا بھالا خوش مزاج بادشاہ بیٹھے بٹھائے اُن مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا جس کے لیے وہ بنایا نہیں گیا تھا - لہٰذا معاملات سیاست میں اِس سے زیادہ تفتیش و تلاش یا تصفیہ وتلقیم کا موقع نہیں کہ چند ایسے واقعات قلم بند کردیے جائیں جن سے زوال سلطنت کی حقیقت تاریخی واضح ہو جائے :—

ا - خان بہادر مولوی محمد مسیح الدین کاکوروی جو واجد علی شاہ کے سفیر بن کر ولایت گئے تھے اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں :—

"قریب دو برس کے میں خانہ نشین رہا کہ اتنے میں اودھ کی سلطنت سرکار انگریزیہ نے ضبط کرلی؟ جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر میں تھا بتاکید میری طلبی ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلا کے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن ضبطی کے مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہاں تک تاکید تھی کہ اُسی طرف سے میں روانہ ہو جاؤں اور پھر گھر میں نہ جاؤں ایسے اضطراب میں مجھکو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منتشر ہوئی... اُس کی صبح کو کلکتے کی طرف روانہ ہوا اور بادشاہ کو اُن کے خیر طلبوں نے صلاح دی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہوں اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکہ معظمہ کے حضور میں اور پارلیمنٹ میں بذات خود اصالتاً پیش کریں حقیقت میں یہ رائے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے تو دو برس جو اُنھوں نے قلعے میں رہلے سہلے سے مصیبت جھیلی اُس سے محفوظ رہتے

اور غالب گمان قریب بہ یقین کے ہے کہ جو مآل اب بادشاہ کے واسطے ہوا اُس سے بمراتب بہتر ہوتا ۔ الغرض پہلے تو بادشاہ نے اسي عزیمت پر کلکتے کی روانگي کا قصد کیا چنانچہ اسي بندوبست کے واسطے پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد خود بھی روانہ ہوئے مگر چوں کہ جبلت سے ضعیف القلب ہیں اور دریا کے سفر سے اُن کو نہایت خوف و خطرہ تھا کلکتے میں پہنچ کر رائے بدل گئی ۔ اپني عزیمت موقوف کي ؟ ملکۂ کشور یعنی والدہ ماجدہ کو اور مرزا حامد علي بہادر ولي عہد کو اور مرزا جواد علی سکندر حشمت اپنے بھائی کو ولایت کي روانگي کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر کیا ...... اور قبل روانگي کے راقم نے بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلۂ عالم فدوي کو اور اپنے عزیزوں کو اس سفر دور دراز میں بھیجتے ہیں بہت صعب امر ہے اور انجام اُس کا موقوف نہایت صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ پر ہے اگر پیچھے سے گھبرا کے نقدي قبول کر لینا منظور ہے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ہیں ؟ مجھے حکم ہو تو راقم یہیں بہت اچھا بندوبست سلطان عالم کے واسطے کرا دیوے ۔ اِس پر ارشاد ہوا کہ میں بھیک مانگوں گا دریوزہ گری کروں گا مگر زنہار ایک حبہ نقدی میں نہیں قبول کرونگا زنہار تم اس طرح کي گفتگو کبھی نہ کیجیو ۔ غرض راقم مع سارے قافلے کے ۱۸ جون ۱۸۵۶ ع کو بنگال نام جہاز

پر سوار ہوا اور جہاز نے کلکتہ سے لنگر اُٹھایا - اب چوں کہ وہي سب نالائق لوگ جو سلطنت کي ضبطي کے باعث ہوئے تھے سب پادشاہ کے ہمراہ تھے اور وہي درانداز‌یاں اور سازشیں اور جوڑ بندیاں بدستور تھیں ؛ ملکۂ کشور کے ساتھہ بعضے مفسد جن کی کرنیل سلیمن نے شکایتیں لکھی تھیں اور وہ چھپ کے بلیو بکْ (Blue Book) میں ارباب پارلیمنٹ کے پاس پیش تھیں کہ وجوہ ضبطی سلطنت میں ایک وجہ مفسدہ پروازی اُن لوگوں کي لکھي گئي تھی ؛ اُن ایک سو چالیس آدمی کے زمرے میں جو ہمارے ساتھہ روانہ ہوے شریک ہو گئے ؛ بعضے لوگ جو لکھنؤ میں قدیم سے جعل ساز مشہور تھے اُن کو اُن مفسدوں نے پیچھے بلا لیا کہ دوسرے جہاز پر سوار ہو کے اسکندریہ میں شامل ہو گئے اور بعضے خواجہ سرا چھلا اور بعضے دو دو پیسے کے آدمي تیلنوں صاحبوں کے ہمراہ گئے کہ وہي سب اُن تیلنوں سرکاروں میں پیش پیش اور با اقتدار تھے - چنانچہ بعد لندن میں پہنچنے کے کرنیل سیکسن جو اُس عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیرمین تھے ایک دن وہ راقم سے کہنے لگے کہ مولوي صاحب ہم آپ کے بڑے شکر گزار ہیں کہ آپ ہمارے دعووں کے سب گواہ ہمراہ لے کے آئے ہیں - پہلا فساد جو مرزا ولی عہد بہادر کے ہمراہیوں سے ہوا وہ یہ تھا کہ بعضے رقوم جواہرات گراں بہا کے جو بادشاہ نے حضرت ملکۂ معظمہ کي نذر کے واسطے ہمراہ

کیے تھے وہ مرزا ولی عہد کے مفوّض ہوے تھے اور
ایک خواجہ سرا حبشي اُن کي طرف سے خزینہ دار
تھا جب بندر سویز میں جہاز کا لنگان ہوا چونکہ
وہ بڑا بھاری جہاز گھاٹ تک نہیں جا سکتا تھا اس
واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب
اُتار کے گھاٹ پر لے جاتے تھے؛ رستے میں اُن خواجہ
سرا صاحب نے جو خزینہ دار تھے ظاهر کیا کہ وہ
رقوم جواهرات گراں بہا جس کي قیمت واقعي مجھے
نہیں معلوم تھی مگر میري تخمین میں دو تین
لاکھہ روپئے سے زیادہ کے نہ تھے کم کا احتمال ھے
اُنھوں نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت
اُن کو ایک خاصدان میں رکھکے اپنے ایک خدمتگار کي
تحویل میں سپرد کیا تھا جو ڈیڑھہ دو روپئے مہینے
کا اُن کے پاس نوکر تھا اُس کے هاتھہ سے وہ خاصدان بحر
زخار میں گر پڑا۔ ۔ ۔ غرض لندن پہنچ کے بادشاہ کے
مقدمے کا بہت عمدہ بندوبست ہوا۔ ۔ ۔ اور ایک خوبصورتی
سے ملکۂ معظمہ سے ملاقات ہوئی کہ جب سے انگلستان
کي سلطنت قائم هوئي ھے کبھي وهاں ایسا امر ظہور
میں نہیں آیا تھا یعني زنانہ دربار هوا کہ کوئي
مرد وهاں نہ تھا۔ ۔ ۔ راقم نے خریطہ بادشاہ کا گزرانا
اُس کو ملکۂ معظمہ نے اپنے هاتھہ میں لے لیا اور
جب تک بیٹھي رهیں وہ هاتھہ میں رہا۔ ۔ ۔ ۔ بعد
اس کے ملکۂ معظمہ نے دونوں شاہزادوں کو اور راقم
کو حکم دیا کہ اُس کے تیسرے دن هم تینوں آدمی

کھانے کي میز پر حاضر ھوں.... لیکن تقدیر نے مجاز نہ کیا یعني دوسرے دن کلکتے سے تار برقی پر خبر آئي کہ بادشاہ کو قلعے میں مقید کیا ھے وہ سارا بندوبست جو وھاں ھوا تھا سب ملتوی ھو گیا... الغرض جب بادشاہ کے مقید ھونے کي خبر وھاں پہونچي اور معلوم ھوا کہ ھندستان میں نہایت زور شور سے غدر شروع ھو گیا ھے جو تدبیریں مقدمے کي درستی کي ھم نے کي تھیں وہ سب برھم ھو گئیں اور پارلیمنٹ میں جو درخواستیں گزری تھیں اپنے مشاورین کی صلاح سے اُن کو ملتوي کرا دیا یعنی پیروي اُس کی موقوف کی ' حقیقت میں مقدمہ بادشاہ کا بہت روبراہ تھا بہت قرائن سے ھم کو نہایت امید ظفر کي تھي مگر ھندستان کے غدر نے اُس کو بگاڑ دیا ' پارلیمنٹ کے دونوں ھاؤس کے بہت بڑے بڑے عمدہ ممبر ھمارے معین اور مددگار تھے اگر کچھہ نہ ھوتا تو اِس میں شک نہ تھي کہ دو تین (لاکھہ ؟) روپیہ بادشاہ کا درماھہ ھو جاتا اور شہر لکھنؤ اور حوالي اُس کے بادشاہ کے قبضے میں رھتے جب ھم لوگ لندن میں پہونچے تو کمپنی کي طرف سے یہ بھي تحریر گئی تھي کہ اگر بادشاہ چاھیں تو چھہ لاکھہ روپئے کا ملک واگزاشت کر دو کہ اُن کے قبضے میں رھے غرض یہ تھي کہ لکھنؤ اور حوالی اُس کے بادشاہ کے قبضے میں رھیں مگر پہلے تو ھندستان کے غدر نے معاملہ خراب کیا پھر بادشاہ کي بے صبري نے بالکل سب ابتر کر دیا کہ وہ عہد نامہ

جو پہلے آیا تھا اُس کو قبول نہ کیا اور بغیر کسي
مهد نامے کے بارہ لاکھہ روپیے قبول کر لیے جو غالباً
اُنہیں کي ذات تک باقي رهیں گے -

(ماخوذ از سفیر اودھہ مطبوعہ الناظر پریس از صفحہ ۹۳ تا ۹۸)

۲ - منشي جالپا پرشاد سکریٹري اودھہ اخبار لکھنؤ اپنے
ایک مضمون میں لکھتے ھیں :—

" بحیثیت ایک شاہ اور فرماں روا کے واجد علي شاہ
ایک مایوس ، ناکام اور قاصر شخص تھے اور ایک
حد تک آرام طلب اور مردہ دل ھونے کے سبب
سے وہ اپنے ملک کي حکومت میں بہت کم یا
کوئي حصہ نہ لیتے تھے - اُن کے ڈوم ڈھاڑي ، اُن کے
حرم ، اُن کی رقاصہ عورتیں اُن کے اوقات اور توجہ کو
مستغرق و مصروف رکھتي تھیں - پس کوئی تعجب
نہیں کہ ھر مقام پر ظلم و تعدي اور بد عملي
پھیلي ھوئی تھي...... کرنیل سلیمن صاحب
رزیڈنٹ لکھنؤ کے پاس اخبار نویسوں کي ایک
جماعت تھي جو ان واقعات کی رتّي رتّي خبریں دیا
کرتے تھے ، جو اُن کے دربار میں اُن کے حرم میں اور تمام
صوبۂ اودھہ میں گزرتے تھے اور اس طرح ایک
عیش پسند بادشاہ کي محافل اور مشاغل کے
حالات رزیڈینسي کي رپورٹوں میں قلم بند کیے
جاتے تھے - مندرجۂ ذیل خبروں سے اُن واقعات
کا کچھہ خیال پیدا ھو سکتا ھے جن سے یہ
رپورٹیں تیار کي جاتي تھیں :—

حضرت آج اپنے تامجان پر سوار ہو کر فلاں محل کو تشریف لے گئے اور وہاں فلاں فلاں محلات موجود تھے؟ جن کو دو جوڑ مینڈھوں کی لڑائی دکھائی گئی جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ لڑے؟ بٹیروں کی بھی پالی ہوئی - دو سو روپئے کا ایک دوشالہ اُس جمعدار کو مرحمت ہوا جس نے اس وحشیانہ جنگ کا انتظام کیا تھا؟ اس کے بعد حضرت نے ایک نئی گائن کو سنا اور پھر چار بجے شام تک کنکوے بازی سے اپنا دل بہلاتے رہے؟ بعد ازاں خواب استراحت فرمایا - فلاں موضع؟ فلاں پرگنہ فلاں ضلع سے خبر آئی کہ رام سنگھہ زمیندار مال گذاری دینے سے انکار کرتا ہے جو عامل نے اس سے طلب کی تھی؟ اس پر اُس کا مکان جلا دیا گیا؟ وہ زخمی ہوا اور اُس کے دو بیٹے اور بھائی بھاگ گئے - جیون خاں داروغہ کبوتر خانے کو دو ہزار کا ایک خلعت عنایت ہوا جس نے ایک ایسا کبوتر پیش کیا تھا جس کا ایک بازو سیاہ اور دوسرا سفید تھا - بادشاہ نے خاص محل کو اپنی جدید غزل سنائی جس میں گل و بلبل کے عشق کا مضمون تھا -

اس لہو لعب کے لحاظ سے واجد علی شاہ اپنے مذاق میں کسی طرح یکہ و تنہا نہ تھے اُن سے پہلے اُن کے سابقین کے پاس

بھي اُن کے گویئے اُن کے ناچنے والي عورتیں ، اُن کے جانور خانے اور چڑیاخانے تھے ، اُن کي نسبت غالباً اُن کے زمانے میں جنگلي جانوروں کي لڑائي عام پسند تھی ، کنکوے بازي اور کبوتر اُڑانا بہت کم پسند کیا جاتا تھا ، ہر چند کہ وہ لوگ بھي اپنے مشاغل سوز و سرود کو اپني سلطنت کے فرائض کا تابع رکھتے تھے مگر واجد علي شاہ نے اپنے تئیں ایک ایسے تعیّش اور تنعّم میں ڈال دیا جس کي کوئي حد و انتہا نہ تھي ، آخر کار برٹش گورنمنٹ کي مداخلت اور دست اندازی کا وقت آگیا جس کي نسبت اُن کو بارہا دھمکي دي گئي تھي وہ تخت سے اُتارے گئے اُن کي سلطنت کا الحاق اور انتزاع عمل میں آیا اور وہ بطور شاہی قیدي کے کلکتے کے ایک جنوبی نواح میں رہنے کے لیے بھیجے گئے اگر چہ وہ اپنے نئے وطن میں بہت اُس حشم و خدم اور طبل و علم کے رکھنے پر مجبور ہوئے تھے جس میں وہ لکھنؤ میں متصور تھے تاہم اُن کو اُن تکلفات کے ترک کر دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئي جس کو اُنھوں نے بطور ایک بادشاہ کے اختیار کر لیا تھا ، وہ بہت جلد عیش و عشرت میں منہمک ہو گئے اور گذشتہ زمانے کو فراموش کر دیا - مٹیا برج گارڈن ریچ میں اُن کا حرم ویسا ھي کھچا کھچ بھرا ھوا تھا جیسا لکھنؤ میں تھا ، اُن کے مغنّي اور مطرب ، ڈوم اور ڈھاڑھي ، اُن دي رقاصہ عورتیں اُن کے ساتھ آئي تھیں ،، -

رسالہ العصر لکھنؤ جلد ۳ نمبر (۱)

۳ - مولوي علی حیدر طبا طبائي ایک چشم دید واقعہ یوں لکھتے ھیں :—

نواب سید امیر علي خاں بارہ کے رھنے والے ھائي کورٹ

کے وکیل تھے مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے ، بتدریج ایسی ترقی کی اور اس قدر تقرب حاصل کیا کہ وزیرالسلطان خطاب ہوا اور تمام اهل دربار ان سے رشک کرنے لگے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں ، غدر کے زمانے میں انہوں نے میجر کوئیڈا قلعہ دار ولیم فورٹ کو ایک جھوٹی خبر پہونچائی تھی کہ راجہ مان سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے ملے اور ایک فرمان مزین بمہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھہ غدر کر کے انگریزی تسلط اٹھادیں میجر کوئیڈا نے فوراً یہ واقعہ نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہوا -

(رسالہ ادیب الہ‌آباد مارچ ۱۹۱۲ع)

۴ - فتح بہادر نگم وکیل لکھنؤ اپنے ایک مضمون (فرماں روا یان اودھہ) میں لکھتے ہیں :—

جب کرنیل سلمین صاحب ریزیڈنٹ مقرر ہو کر لکھنؤ آئے اُن سے اور وزیر اعظم سے نسبت معطلی و اخراج شہر مرزا وصی علی خاں کے بلانے نفاق پیدا ہوئی اور یہ ناچاقی روز بروز بڑھتی گئی - کرنل سلیمن نے ملک اودھہ کا دورہ کیا اور بد انتظامی سلطنت کی متواتر رپورٹیں ولایت کو روانہ کیں دسمبر ۱۸۵۴ع میں جنرل اُٹرم صاحب رزیڈنٹ صوبۂ اودھہ ہوے - مختصر یہ کہ کرنل سلیمن اور جنرل اُٹرم

کي رپورٹ پر نقص ارتباط و مراسم سابقه یک قلم مٹ گیا اور پیشگاه صدر سے بادشاه پر بد انتظامي کا الزام قائم هوا - بتاریخ یکم فروري ۱۸۵۶ع جنرل اُترم صاحب نے بادشاه کو خبردي که سرکار کمپنی انگریز بہادر ۷ فروری سنه ۱۸۵۶ع سے ملک اودهه پر اپنا قبضه کرےگي آپ کو بندوبست کے واسطے ایک هفتے کی مہلت هے * بادشاه نے بفور سماعت اس بات کے کل کار و بار سلطنت کو بند کر دیا توپوں کو چرخ سے گروا دیا اور تمام ملازمین اور تعلقه داروں کے نام اس مضمون کے احکام جاری فرمائے که خود بدولت واسطے استغاثے کے سمت لندن جاتے هیں تم سب تعمیل احکام اهالیان کمپني بہادر میں مصروف رهو ۴ فروري سنه ۱۸۵۶ع کو رزیڈنٹ مع دیگر افسران فوج بادشاه کے پاس آئے اور محبت نامه نواب گورنر جنرل بہادر پیش کیا - بادشاه نے اُسے پڑهه کر بے اختیار ایک آه دل پر درد کهینچ کر فرمایا که خداوندا تو شاهد حال هے که یه مجهپر جفا اور جبرصریح هیں اور حیلۂ انتظام سے میرا گهر مجهسے چهینا جاتا هے -

۷ فروري سنه ۱۸۵۶ع بذریعه ایک اشتہار کے * جو خاص لکهنؤ شہر میں مشتہر کیا گیا سرکار کمپني بہادر نے کل دفاتر شاهي پر قبضه کر لیا -

(رساله زمانه کانپور جون سنه ۱۹۱۰ع)

---

* مفصل اشتہار تاریخ نثر اُردو مولفۂ راقم مضمون کے صفحه (۳۹۷) میں درج هے -

ان اقتباسات میں سلطنت اودھ کی تباہیوں کے سچے حالات اُن اہل قلم کی تحریروں سے منتخب کیے گئے ہیں جن کی روایات تاریخی درائت کے معیار پر ہر طرح قابل اعتبار ہیں ؟ اس کے بعد مزید توضیح چنداں ضروری نہ تھی ؛ لیکن چونکہ زوال سلطنت کمال عیش و عشرت کی بدولت رونما ہوا ہے اس لیے مثنوی حزن اختر کے مختلف مقامات سے کچھ ایسے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن کو پڑھکر اندازہ ہوگا کہ انتہاے پریشانی و بے سر و سامانی کے عالم میں بھی جان عالم کے وہی ٹھاٹ تھے جس کے طفیل میں اُن کو یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا -

قیدخانے میں جو تکلیفیں واجد علی شاہ مرحوم نے اُٹھائیں اُس کی مختصر تشریح یہ ہے :—

نفس سرد مہری سے ژالہ ہوا
بدن غم غم کا نوالہ ہوا

جگر جل گیا گرمی رنج سے
تنفر ہوا اک غلم گنج سے

بدن تار مسطر سے مل مل گیا
کلیجا مصیبت سے ہل ہل گیا

نمی تک نہیں نام کو آنکھہ میں
نہ نیند آتی ہے شام کو آنکھہ میں

نہ کھانے کا اسباب ہے کچھہ نصیب
نہ پانی کا ہے ذکر لب کے قریب

ہوا بھی جو آتی ہے اُڑتے ہیں ہوش
کف غم سے بیزار ہے پاے پوش

وہ گرمي کا رخ سامنے کي وہ دھوپ
اُڑاتي هے نا طاقتي رنگ و روپ
پھر اُس پر غضب چار سنداس هيں
کہ مجھہ دل جلے کے وہ سب پاس هيں
تپش یہ جو هوتي هے برسات کي
یہ گھٹاس جو هوتي هے هر رات کي
اُبھرتي هے هر عطر داں کي جو بو
کہ جس طرح مرچوں کي هو تند خو
سلگتا هے اِس سے دماغ ضعيف
هوا جاتا هے اور بھی دل نحيف
مجھے ڈیڑھہ سال اس بلا میں هوا
هوا قرب دو سال اے مہ لقا
نہيں حال اندوهگيں پوچھتا
ابھی تک تو کوئي نہيں پوچھتا
دو وقتہ تو آتا هے گھر سے طعام
یہ کيا جان کرے آدمي گر کلام
کھلي دیکھي دیکھہ ليتے هيں سب
تو پھر پيش بندہ وہ آتا هے جب
جو کچھہ حادثے مجھہ پہ پڑ پڑ گئے
قلم کس زباں سے سنائے اُسے
جڑيں پڑ گئيں ریش بھي هے دراز
جفاؤں سے آتا نہيں چرخ باز

مگر یہ پشکیلي عیش پرست بادشاہ اسي درمیان میں جب زرا سا بھي اطمینان پاتا ھے تو اس طرح فرماتا ھے :—

شفا کا جو حمّام میں نے کیا
مہینا وہ شوال کا تھا لکھا
مگر سن پلٹ کر بہتر ھوے
کہ ہم تندرست اور بہتر ھوے
ھوئیں نذر کی گھر میں تیاریاں
لگي کھلنے خلعت کي گُل کاریاں
مرے آدمي سب اکٹھا ھوے
محل بھی جو تھے سب وہ یکجا ھوے
ھوا ھر طرف ناچ گانا شروع
درخت خوشي کے جمے سب فروع
تھاؤ مچي تھي محل میں تمام
وہ بزم طرب تھی ھوئي جب کہ شام

زنداں کي سختیاں اور نگرانیاں یوں بیان کی جاتي ھیں :—

وہ تکلیف ھے جس سے دل تنگ ھے
شب و روز زنداں کا یہ رنگ ھے
زبس ھے یہ کوٹھي نہایت کلاں
مگر میرے کس کام کی اے جواں
ھر اک اس کا در بند ھے آہ آہ
وہ گرمی وہ گرمی کہ دل ھے تباہ
کُھلے ھیں جو در تو ادھر دھوپ ھے
یہ ھے رنگ کوٹھي کا یہ روپ ھے

اس اوسط کے درجے میں دل شق ہیں ہم
نہ اوپر نہ نیچے معلّق ہیں ہم
کئی خط کئے لاٹ کو بھی رقم
ہوے سرفراز ایک سے بھی نہ ہم
کسی خط کا لکھا نہ ہم کو جواب
خدا جانے کس امر پر ہے عتاب
منگاؤ نوشتہ جو منشی کے ہاتھہ
تو آتا ہے کرنیل صاحب کے ساتھہ

ان تمام بندشوں میں سب سے زیادہ جس بات کا رنج ہے وہ صرف ماہرویوں کا فراق ہے -

کوئی رنج زنداں میں ایسا نہیں
جو اس بے سر و پا کو پہنچا نہیں
مگر درد فرقت ہے سب سے سوا
ہر اک غم دیا ہے اسی نے بُھلا
صبا بھی نہیں دیتی پیغام یار
کیا غم نے مجھکو ضعیف و نزار
وہ شامِ الم ہے سحر تک نہیں
مرے ماہرو کی خبر تک نہیں

قید ہونے سے پہلے اپنے عہد شاہی کے متعلقین کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے :—

کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کجکلاہ
اودھہ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ

ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
فقط ستره سو تھے اہل قلم
طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم
فقط پندرہ سو تو تھے چوبدار
رعایا وغیرہ کا کیا ہے شمار
کروں ساتھہ سکر متحل گر شمار
تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار

آمد کے عالم میں همراهیوں کي تفصیل یہ ہے :—
اسامی همراهیاں کر رقم
جو لائے ہیں کلکتے میں ساتھہ هم
زن و مرد اهل قلم اهل فوج
کہ ہو ایک چشمے کی جس طرح موج
کسی طرح تھے پانچ سو سے نہ کم
ملازم رفیق اور متحل نبی حشم

محبوسي و مجبوري کے باوجود جس الوالعزمی اور سیر چشمي سے شاهانہ مصارف جاری رکھے اُن کي تشریح اقرار عجز کے ساتھہ اس طرح کي گئي ہے :—
یہ اختر جو ہے خاک پائے جہاں
یہ شاہ اودھ تھا کبھي اے جواں
مگر اب ہے محبوس اهل فرنگ
طبیعت سے جاتي رهي ہے اُمنگ

نہیں پوچھی جاتی خطا بے خطا
بہت تنگ اس جا یہ ہے دل مرا
جو تاریخ تک آج کی اٹھ چکا
وہ سب مثل اخبار میں نے لکھا
یہ بخشش نہیں ہے عنایت نہیں
بھلا اٹھتا ہے بار بخشش کہیں
غریبوں کی ہے یہ فقط روٹی دال
چلے بھون کر کھائیں جائے ملال
خدا کی قسم دے کے ہوں شرمسار
یہ وہ ہیں کروں جن پہ میں جاں نثار
نہیں ہوتی اس میں کبھی نان چاشت
مگر لکھ لیا ہے پئے یاد داشت
دیے منشی صفدر کو یوں پانچ الف
کہ تو اپنے کاموں میں کر ان کو صرف
چل و پنچہزار اور پھر چار سو
کرو بیس زائد جو گنتی ہو تو
یہ لندن روانہ کیے خرچ کو
کہا بیٹی ماں بھائی سے اس کو لو
پھر اک دفعہ هفتاد و نہ الف بار
کرو تین سو زائد اس پر شمار
یہ بار دگر بھیجا لندن میں زر
کہ کھاؤ اسے جب تلک بیٹھکر
دیے دفعہ چوتھی سن اے باتمیز
محل خاص ہے وہ جو مجھکو عزیز

چل و پنج الف اور پھر چار سو
دیے اُن کو اور یہ کہا ہیں یہ جو
دیے پھر مجاہد کو گیارہ ہزار
پھُپھا ہے جو میرا وہ رستم شعار
دیے بست و پنج الف اور چار سو
شمار انگلیوں پر کرو اس کو تو
انہیں کو دیے جو سزاوار ہیں
جو محبوبۂ خاص دلدار ہیں
جو ہیں جعفری بیگم خوش پری
دیے شش ہزار و سہ صد اُن کو بھی
دیے پنج الف اُس کو سن اے نگار
کہ ہے نام جس بھائی کا ذوالفقار
دیے کربلائی کو پھر اک ہزار
کہے وقت رخصت یہ اُس پر نثار
بڑے بھائی اُن کے جو ہیں آغا جان
دیے پانسو اُن کو اے مہربان
جو تھے چھوٹے بھائی یہاں میرے ساتھ
کہو مرزا جعفر تو نام آئے ہاتھ
اُسے بھی دیے پانسو اے عزیز
مرے ساتھ تھا وہ سراپا تمیز
پھر اختر محل پر عنایت یہ کی
دیے تیس ہزار اُن کو اے متّقی
دیے ملکۂ ملک کو تیس ہزار
کہ آئے نہ سہنے یہ اُس کے غبار

کہے نذر لیصر بھي گیارہ ہزار
وہ راهي هوئي لے کے اے غمگسار
کہے صرف زنداں میں پھر چار الف
هوے کارخانے میں بالکل وہ صرف
کہے نذر سادات چھ سو پچاس
خدایا مجھے نذر آئے بہ راس
ہر اک ماہ تنخواہ‌داروں کو یار
دیا کرتا هوں اک قلم دس ہزار
طلا لاکھہ سکوں کا باقي ھے اب
اسے بھی اُٹھاؤں کا اے خوش نسب
نہیں صورت آمد اے یار اب
اسي کا بہت ھے الم اور تعب
پلیں گي یہ کس طرح جانیں جو هیں
کھچیں گي یہ کیونکر کمانیں جو هیں

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھکر سنگ دل سا سنگ دل بھي متاثر هوے بغیر نہیں رہ سکتا اللہ ! اللہ ! کیا انقلاب ھے آج ان سانحات کے پڑھنے والے حیرت و افسوس کي تصویر بن جاتے هیں پھر اُس شخص کا کیا حال هوا هوگا جس پر خود یہ وارداتیں گزري هیں - ساري مثنوي کو پڑھنے کے بعد واجد علي شاہ کی تمام کمزوریوں کا مرقع صاف صاف نظر آ جاتا ھے - شاهانہ الوالعزمیاں اور خصوصیات خانداني بدرجۂ اتم اُن میں موجود تھیں لیکن طبیعت اس قدر کمزور پائي تھي کہ زرا سي سختي میں گھبرا جاتے تھے اور وہ باتیں زبان و قلم سے نکال بیٹھتے تھے جو کم از کم ایک ۳ کرور ملک والے - بادشاہ کے لیے خود داري کے منافي هیں - وہ بادشاہ

جس کے دربار میں بڑے بڑے صوبہ دار اور ہم عصر والیان ملک بادب و احترام آتے ہیں وہ اپنے عہد کے زمانے میں گورنر جنرل کے القاب میں یہ عبارت لکھتا ہے :—

"ذکر عنایات و الطاف اریکہ آرائے سلطنت و حشمت رونق بخش سریر شوکت و عظمت نواب مستطاب معلی القاب اشرف الامرا گورنر جنرل بہادر خلداللہ ملکہ و سلطنتہ ۔"

اور پھر اپنے نام جو خطوط منجانب گورنر جنرل موصول ہوتے ہیں اور اُن میں پرانے القاب و آداب جو بجنسہٖ بہ تغیر درج ہوتے ہیں اُن کو باختصار یوں ظاہر کیا جاتا ہے :—

ابھي تک تو ہے لاٹ صاحب کو دھیان

یہ معلوم ہوتا ہے ہیں مہربان

سناؤں میں تفصیل اس کي تجھے

بکوشِ دل اس کو اگر تو سنے

بوقتِ حکومت جو تھا رسم یار

وہ آداب و القاب ہے بر قرار

جو تھا خلد اللہ میں مُلکہ

وہ بدلا ہوا دام اور مجدہٗ

زر افشاں وہي خط وہي عرض وطول

خریطہ بھي زر بفت کا با اُصول

ارادہ تو یہ تھا کہ ان سب تشریحات کے بعد مثنوي حزن اختر کا ایک ایسا مسلسل انتخاب پیش کیا جائے جس سے بالترتیب تمام واقعات ناظرین کے سامنے آجائیں مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ اب تک جتنے اقتباسات کیے گئے ہیں وہ بھي کافي مقدار میں للسبلد

هو چکے ہیں، مزید طوالت کو تحصیل حاصل سمجھا گیا اور اب یہ ترجیع بند مثنوی کے اُن ۳ حسرتناک شعروں پر ختم کی جاتی ہے جن سے کمال سخنوری، جمال عشوہ گری اور زوال اختری کے مرقع یکجا نظر آتے ہیں :—

رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے
سبھوں نے کنوے میں ڈھکیلا مجھے
عیال اور اطفال لوٹے گئے
جہاں میں مرے لال لوٹے گئے
کوئی مضطرب ہے کوئی نالہ کش
کوئی پیٹتا ہے تو آتا ہے غش

فاعتبروا یا اولی الابصار

ایک ادبی استفسار

(از مولوی سراج الحق مچھلی شہری)

کچھ دنوں سے اخبار اور رسائل میں ایک لفظ "سنہری" رائج ہو گیا ہے، خواہ وہ مذکر اسم کی صفت ہو خواہ مؤنث اسم کی - اور "سنہری کتاب" اور "سنہری موقع" وغیرہ بے تکلف استعمال ہو رہا ہے بلکہ اس پر اصرار بھی ہے - میں آج تک مذکر کی صفت کے لیے سنہرا اور مؤنث کی صفت کے لیے سنہری لکھتا تھا جب پہلے پہل (غالباً سنہ ۱۹۲۵ع) میں نے ایک افسانے کا نام "سنہری بچھو" پڑھا تھا (یہ افسانہ کسی انگریزی افسانہ نگار کے ایک دلچسپ ناول "گولڈن اسکورپین" کا ترجمہ ہے اور پنجاب کے کسی صاحب منشی تیرتھہ رام فیروزپوری نے کیا ہے) تو میں نے اس وقت اس کو پنجابیت پر محمول کیا تھا لیکن آج ارباب قلم کی یہ روش عام اور اس پر اصرار تام دیکھہ کر مجھے اپنے روزمرہ اور ذوق لسان پر اعتماد باقی نہ رہ گیا اور اس کی صحت میں کچھہ شک سا آ چلا میں نے اس کی تحقیق کرنی چاہی چنانچہ لغات کی طرف رجوع کیا تو وہاں عجب عجب تماشے نظر آئے اور میں کوئی صحیح نتیجہ اور نئی معلومات نہ حاصل کر سکا اگر میں کچھہ سمجھہ سکا ہوں تو اتنا کہ جو کچھہ ہم (اور ایک مجھی پر کیا موقوف ہے عام طور پر لوگ جو) بولتے ہیں وہی صحیح ہے -

اب ذیل میں اس لفظ سنہری کی بابت مجھے تین گذارشیں کرنی ہیں (۱) ارباب لغت کے ارشادات - (۲) رواج عام - (۳) قیاس لغوی

(۱) ۔ لغات میں اس کی بابت یہ درج ہے :—

(الف) ۔ فرہنگ آصفیہ (مطبوعہ اسلامیہ پریس لاہور ؟ جلد ۳

صفحہ ۱۱۳ سنہرا (ہ) صفت (۱) روپہلا کا نقیض ؟

سونے کے رنگ کا ۔ مذہّب ۔ زراندود ۔ طلائی ۔ طلاکار

زرّیں ۔ پُر زر ۔ سونے کا :—

(رشک)—یہ طلائی رنگ جسم یار گہرا ہو گیا

جو انگرکھا چھو گیا تن سے سنہرا ہو گیا

(آتش)—مے کی تکلیف نہ کیونکر کریں ان آنکھوں کے جام

موے سر ؟ ابر سیہ ۔ برق ؟ سنہرا تعویذ

(۲) زرد ۔ پیلا سنہری (ہ) صفت ۔ (۱) روپہلی کا نقیض ۔ سونے

کے رنگ کی ۔ زریں ۔ مذہب ۔ پُر زر ۔ طلائی —

(رنگین)—دانت خاصے دھڑی طلسم جمی

سنہری لب تسبہ بول چال پری

(ناسخ)—اے پری تونے جو پہنی ہے سنہری انگیا

آج آتی ہے نظر سونے کی چڑیا مجکو

(ناسخ)—سورج تو بنا سنہری اوڑھنی

سورج کی کرن کرن بنی ہے

(۲) زرد ۔ طلائی رنگ ۔ چلپئی رنگ ۔ بسنتی رنگ:—

(ناسخ)—وصف جب میں نے کیے تیرے سنہری رنگ کے

خود بخود ہر صفحۂ دیوان مذہّب ہو گیا ؟؟

(ب) فرہنگ شفق (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ طبقہ اول

صفحہ ۴۰۴) سنہرا وہ چیز جو زبان پر مذکر جاری ہو اور

رنگ اُس کا طلائی ہو :—

ناسخ—مل گیا سونے کے گھلنے سے سنہرا جوڑا

رنگ کہتے نہیں اکسیر اسے کہتے ہیں

میر کی تکلیف نہ کیونکر...... تا سنہرا تعویذ (یہ شعر اوپر آچکا ھے)
سنہرا رنگ طلائی رنگ:—

(ناسخ) — جب سے اُس بت کا سنہرا رنگ ھے پیش نظر
حلقہ اپنی چشمِ تر کا خاتم زر ھو گیا

(ذوق) — مصحف رخ پہ ترے رنگ سنہرا تیرا
واہ کیا خوب ھے سونا سر قرآں چڑھا

سنہری وہ چیز جو زبان پر مؤنث جاری ھو اور رنگ اُس کا طلائی ھو:—
(ناسخ)—اے پری تو بھلی ھے سنہری انگیا الخ (یہ شعر آچکا ھے)
سنہری رنگت — رنگ طلائی:—

(ناسخ) — مجھ تیری سنہری رنگت کے
کبھی دیکھیں نہ رنگ سونے کا

(ج) لغات آزاد (مطبوعہ کریمی پریس لاهور صفحہ ۱۰۴)
سنہرا — زر اندود — مذھب —

(د) سرمایہ زبان اردو (مولفہ ضامن علی جلال لکھنوی مطبوعہ انوارالمطابع صفحہ ۲۰۹) سنہری تحتانی معروف کے ساتھ — جو چیز کہ زر اندود اور مطلا ھو اور نام ایک رنگ کا بھی ھے اُسے طلائی بھی کہتے ھیں چنانچہ شیخ ناسخ فرماتے ھیں:—

وصف جب میں نے کیے تیرے سنہرے رنگ کے
خود بخود ھر صفحۂ دیواں مذھب ھو گیا

(تنبیہ) یہاں لفظ سنہرے کو یائے مجہول کے ساتھ یعنی امالہ سنہرا پڑھنا خطا ھے اس واسطے کہ سنہری نام ایک رنگ کا ھے پس اس رنگ کی طرف خواہ شے مؤنث منسوب ھو خواہ شے مذکر — بہر طور اس کو یائے معروف کے ساتھ

پڑھیں گے - قیاس پر رنگ اگری - بسنتی - چمپئی
کے -

(۲) نوراللغات (مولفہ سید نورالحسن نیّر ' مطبوعہ نیّر پریس
لکھنؤ ؟ جلد ۳ صفحہ ۳۷۹) سنہرا (۵) صفت مذکر -
سونے کے رنگ کا ؟ زریں - سنہری (۵) صفت مونث
وہ چیز جو سونے کے رنگ کی ہو - نام ایک
رنگ کا جس کو طلائی بھی کہتے ہیں :-

(ناسخ) — وصف جب میں نے کیے تیرے سنہرے رنگ کے
خود بخود ہر صفحۂ دیواں سنہری ہو گیا

جلال نے سرمایہ زبان اردو میں لکھا ہے کہ " یہاں لفظ سنہری
کو یائے مجہول کے ساتھ یعنی امالۂ سنہرا پڑھنا خطا
ہے اس واسطے کہ سنہری نام ایک رنگ کا ہے - الخ
تا چمپئی کے " (جیسا اوپر گزر چکا) سنہری رنگت ؟
سونے کی سی رنگت -

غرض یہ پانچ لغات مجھے ملے میں نے ان میں جو کچھ اس لفظ کے بابت دیکھا سب نقل کر دیا اگرچہ خوامخواہ کا طول ہو گیا ہے مگر تمام عبارتیں یکجا اور پیش نظر ہو گئی ہیں اب میں ان عبارت کی بابت کچھ عرض کرتا ہوں -

یہ تو ظاہر ہے کہ سنہری صفت مونث واقع ہو تو اس میں کسی قسم کا اعتراض کسی کو نہیں - رہی مذکر کی صفت اور لفظ " سنہرا " کا وجود تو سوا جلال لکھنوی کے کہ ' وہ ایسا کوئی لفظ ہی نہیں مانتے باقی سب کو تسلیم ہے کہ سنہرا ایک لفظ ہے ضرور ' چنانچہ شفق نے " سنہرا جوڑا " " سنہرا تعویذ " " سنہرا رنگ " " رنگ سنہرا " کی چار مثالیں ناسخ آتش اور ذوق کے کلام سے دی ہیں -

غور کرنے سے معلوم ہوتا ھے کہ اس غلطي کا منشا صاحب فرہنگ آصفیہ
اور جلال لکھنوي کي عبارتیں ھیں - معلوم نہیں اُن دونوں میں متقدم
کون صاحب ھیں اور کس نے کس سے استفادہ کیا - بہر حال سید احمد صاحب
نے سلہری کے معنے زرد اور بسنتي رنگ لکھہ کر ناسخ کا ایک
شعر نقل کر دیا جلال نے ادّعائے استادی میں اُس سے ایک کلیہ بنایا کہ
سلہرے نہیں ھے ' سلہری ھے اور جو چیز بھي زر اندود ھو (خواہ مذکر
خواہ مونث) سلہری ھي کہی جائیگی پھر وھي شعر ناسخ کا سند میں
پیش کر دیا پھر ایک قیاس کیا کہ اگری اور چمپئي کي طرح سلہری
بھي صفت نسبت ھے - صاحب نوراللغات نے تو اور بھي کمال کیا
چونکہ وہ سلہرا لفظ کو صحیح مانتے اور مذکر کي صفت جانتے ھیں
لہذا ناسخ کے اُسی رباعي یا استنادی شعر میں رنگ کے ساتھہ
تو سلہرا ھي پڑھا ہاں دوسرے مصرع میں سلہری لکھہ دیا لیکن ہم کو
دیوان ناسخ مطبوعہ نولکشوری پریس لکھنؤ ' دیوان دوم میں
صفحہ ۳۵ پر یہ غزل ملتي ھے :—

(مطلع) — واعظا حُبّ ذَهَب تیرا جو مذھب ھوگیا
عیب کیا شُرب شراب اپنا بھی مشرب ھو گیا

اس غزل کا تیسرا شعر یہ ھے :—

وصف جب موزوں کیے اُس کے سلہرے رنگ کے
خود بخود ھر صفحۂ دیوان مذھّب ھو گیا

واضح ھو کہ دیوان ناسخ میں '' سلہرے رنگ '' بیاے مجهول لکھا ھے پھر
اب نہیں معلوم کہ آیا سید احمد صاحب دھلوی اور جناب جلال لکھنوی
کو جناب ناسخ سے شرف ملاقات حاصل ھوا تھا اور انھوں نے خود انھیں کي زبانی
سنا تھا کہ اس جگہ سلہري نہیں بلکہ تحتاني معروف کے ساتھہ سلہری
ھے - لیکن اگر انھوں نے بھي دیوان سے دیکھہ کر یہ شعر لکھا ھے

تو ۹۹ فیصدی قیاس ہوتا ہے کہ دونوں حضرات نے اس لفظ کو پڑھا ہی غلط۔ اس کا ثبوت یہ بڑی ہے کہ یہی ناسخ دوسرے اشعار میں بقول شفق لکھنوی خود بھی سنہرا جوڑا اور سنہرا رنگ فرماتے ہیں اور ان کے ہم عصر آتش سنہرا تعویذ لکھتے ہیں۔ جب سنہری رنگ قافیہ میں نہیں ہے تو کیسے حکم لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تحتانی معروف ہی کے ساتھ ہے۔

خیر، صاحب فرہنگ آصفیہ تو اس "سنہری رنگ" کو غلط پڑھ کر غلطی میں پھنسے ورنہ وہ سنہرا کو صحیح مانتے اور روپہلا کو بھی صحیح مانتے ہیں اور ایک کو دوسری کا نقیض جانتے ہیں لیکن جلال لکھنوی نہ سنہرا کوئی لفظ مانتے ہیں نہ روپہلا "سرمایہ زبان اردو" میں صفحہ ۱۹۴ پر ایک لغت قائم کرتے ہیں "روپہلی جو کہ نقرئی ہو" یعنی اس میں بھی عموم ہے مذکر اور مونث دونوں کے لیے، حالانکہ یہ لفظ بھی عام ہے نوراللغات (جلد ۳ صفحہ ۲۱۰) روپلی کے ذیل میں ہے روپہلا (ہ۔واو غیر ملفوظ) صفت مذکر۔ چاندی کے رنگ کا جیسے روپہلا موباف روپہلی (ہ) صفت مونث فرہنگ شفق میں ناسخ کا یہ شعر روپہلا کی سند میں آیا ہے۔

جب روپہلا چوٹی میں موباف ڈالا یار نے

سنبلستاں میں گُل شبّو نظر آیا مجھے

اب ہم نہیں سمجھتے کہ یہ روپہلا اور سنہرا کے الفاظ کیوں لغت سے نکالے جارہے ہیں اور کتنے آدمی اس کو مانیں گے؟

(۲) استعمال اور رواج عام:—

جہاں تک مجھے معلوم ہے خود لکھنؤ میں آج بھی اور دلی میں بھی یہ لفظ برابر مذکر کے لیے سنہرا اور مونث کے لیے سنہری بولا جاتا ہے جس کا ثبوت ایک تو وہی اشعار ہیں

جو اوپر گزر چکے دوسرا ثبوت ؟ ذوق سلیم کا فتویٰ ہے - آج بھی اردو بولنے والے عام اس سے کہ وہ اہل زبان ہونے کے مدعی ہوں یا نہوں زرا دو چار مرتبہ "سلہری موقع" "سلہرا موقع" "سلہری بچھو" "سلہرا بچھو" کہہ کر اپنے ذوق سے دریافت کریں اپنے کانوں سے پوچھیں اور جو کچھہ جواب ملے از روے انصاف اسی کو مانیں -

(۳) قیاس لغوی :—

جلال لکھنوی نے (اگر میرا خیال ما سبق صحیح ہے تو) ناسخ کا شعر غلط پڑھ کر ایک قیاس یہ بھی کیا ہے کہ اگری بسنتی اور چمپئی کی طرح یہ بھی صفت نسبتی ہے - جلال استاد کہے جاتے ہیں مگر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے تو اگر کہنے کی اجازت دیجائے تو عرض کروں کہ جلال کا قیاس یہاں غلط اور قیاس مع الفارق ہے - اُنہوں نے اگری کو لکھا ہے کہ بر وزن جگری ہے بر وزن اجلی نہیں ہے گویا یاے نسبت کے اس مشہور قاعدے کے موافق کہ اگر اسم کے آخیر میں الف ہو تو وی یا ئی لگاتے ہیں ورنہ صرف ی بڑھاتے ہیں پھر کیا انصاف ہے کہ لفظ سونا سے صفت نسبتی لسلہری بنائیں - سلہری اگر صفت نسبتی ہوسکتی ہے تو صرف لفظ سلہر سے بشرطیکہ یہ کوئی لفظ بھی ہو مگر ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لفظ اب تک "سونے" کے معنوں میں دیکھا یا سنا نہیں گیا - سونا سے جب صفت نسبتی بنائیں گے تو چمپا پر قیاس کر کے سونئی بر وزن چمپئی بنائیں گے یا دنیا پر قیاس کرکے سونوی بر وزن دنیوی یا سوناوی بر وزن دنیاوی کہیںگے مگر روز مرہ گواہ ہے کہ یوں بولتے نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ قیاس لغوی و لسانی کے مطابق سونا سے سلہری نہیں بنا ہے بلکہ زبان اردو

میں یہ لفظ بالکل خلاف قیاس صفت نسبت ہی بن کر استعمال ہوتا ہے اور ایسے الفاظ کو ان صفات نسبت کے قواعد کے مطابق رکھنا اور اصول و ضابطہ میں لانا زبردستی ہے ۔

اب ایک ہی بحث اور رہ جاتی ہے کہ سید احمد دہلوی اور جلال لکھنوی دونوں صاحبان لکھتے ہیں کہ سنہری' طلائی رنگ کو بھی کہتے ہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی خِطّہ میں کسی رنگ کو سنہری کہتے ہوں اور وہ سند نہیں ۔ لیکن چونکہ دونوں صاحبان نے استناد کیا تھا ناسخ کے ایک شعر سے جس کو دیوان میں یائے مجہول ہی سے لکھا ہے اس لیے اغلب یہ ہے کہ اب اس امر کے ماننے کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ کوئی رنگ ہے بھی ۔

ممکن ہے بعض حضرات کو یہ خیال گزرے کہ یہ استفسار کا ہے کو ہوا یہ تو خود قول فیصل کے طور پر پیش کیا گیا ہے مگر اصل یہ ہے کہ میں نے ارباب لغت کی رائیں یکجا کر دی ہیں اور اپنے شکوک اور خیالات کا اظہار بھی کر دیا ہے اس سے میری غرض یہ ہے کہ ان امور کو پیش نظر رکھکر ماہرین زبان اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں۔

ضلع الہ‌آباد کے معماروں کی اصطلاحیں

(پروفیسر محمد نعیم الرحمان ، ایم اے)

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ، آیندہ صفحوں میں میں نے ان اصطلاحات کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو ضلع الہ‌آباد کے معماروں میں تعمیری کام اور اُس کے مسالے ، اوزار و آلات وغیرہ کے متعلق رائج اور مستعمل ہیں ۔ چند سال کا عرصہ ہوا کہ مجھے الہ‌آباد میں ایک عمارت کی تعمیر کے دوران میں مسلسل طور پر معماروں اور اُن کے مددگار کاریگروں اور مزدوروں سے سابقہ رہا ، میں نے اس موقعے سے یہ فایدہ اُٹھایا کہ کاریگروں کی جو اصطلاحیں روزانہ میرے کان میں پڑتی تھیں ان کو قلمبند کرتا جاتا تھا ، اور چونکہ یہ زمانہ چار پانچ مہینوں پر حاوی اور خاصا طویل تھا ، اور میں برابر اسی فکر میں تھا کہ اصطلاحیں جمع ہوتی رہیں ، اس لیے ان کا ایک معقول ذخیرہ فراہم ہو گیا یہ چیز بجائے خود اس قدر مفید اور دلچسپ ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اب تک اس طرف توجہ کیوں نہیں کی گئی ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ پہلا ہی موقع ہے کہ اہل پیشہ میں سے معماروں کی اصطلاحیں ایک مجموعی صورت میں پیش کی جارہی ہیں ؛ اور مجھے اُمید ہے کہ اہل علم و فن ان کو دلچسپ پائینگے ۔

چونکہ مجھے محض اپنی سمجھ یا اپنے اندازے پر اعتماد نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا ، اِس لیے ان اصطلاحی الفاظ کے تلفظ اور اُن کے معنی کے متعلق جو کچھ سمجھا اُس کی تصدیق اور تشریح ان کاریگروں سے بھی کرا لی ۔ اس امر میں میں نے بالخصوص اُن معماروں

سے رجوع کیا جو سن رسیدہ اور پرانے تجربہ کار تھے - اس کے بعد مزید اطمینان کے لیے میں نے یہ کیا کہ نہ صرف اسي وقت اور کاریگروں سے بھي ان تمام امور کي تصدیق کرائي ؛ بلکہ اس کے بعد بھي اس دو تہائي برس کے عرصے میں جب کبھي الہ‌آباد اور اُس کے مضافات کے معماروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ؛ اُن سے بھي یہ دریافت کر لیا کہ اِن کا تلفظ اور اِن کي تشریح یوں ھي ھے - اس طرح بالآخر مجھے یہ اطمینان ھوا ؛ اور ھے کہ یہ اصطلاحیں الہ‌آباد اور اُس کے نواح میں ضرور مستعمل ھیں ؛ اور اسي خیال سے عنوان میں میں نے اس کي تصریح کر دي ھے - مختصر یہ کہ میں نے یہ تمام اصطلاحیں من و عن اُسي تلفظ کے ساتھہ درج کي ھیں ؛ جو ان لوگوں کي زبانوں پر رائج ھے - میں نے اس میں مطلق تصرف نہیں کیا ھے ؛ اور نہ کر سکتا ھوں - صحت ادا کي طرف سے اطمینان کرنے کے لیے میں نے قوسین میں قریب قریب ھر لفظ کا تلفظ بھي لکھہ دیا ھے ؛ اور یہ بھي بتا دیا ھے کہ صرفي اصطلاحات کے لحاظ سے اس کا شمار کلمہ کي کس نوع میں ھے -

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ مجموعہ ؛ جس میں کم و بیش تہائی سو اصطلاحیں شامل ھیں ؛ ھر لحاظ سے مکمل ھے - بہت ممکن ھے کہ کچھہ اصطلاحیں چھوٹ گئي ھوں ؛ اور میري نظر سے اوجھل ھو کر اس مجموعے میں شامل ھونے سے رہ گئی ھوں - تاھم یہ ضرور کہا جا سکتا ھے کہ ان اصطلاحوں کا بہت بڑا حصہ اس میں ضرور آ گیا ھے - میں نے اکثر الفاظ کي لساني اصلیت اور بناء بیان کرنے کي بھي کوشش کی ھے - البتہ جو الفاظ بالکل صاف اور واضح یا مشہور ھیں ؛ اُن کے متعلق میں نے ایسي صراحت کو غیر ضروري سمجھہ کر ترک کر دیا ھے

لیکن ایسے معروف الفاظ کے علاوہ اور بھي چند الفاظ (مثلاً بوہل ؛ بھالا ؛ پوتیا ؛ سبل ؛ وغیرہ) ایسے رہ گئے ھیں ؛ جن کي لساني تشریح کي ضرورت معلوم ھوتي ھے - مجھے اعتراف ھے کہ میں اس سے قاصر ھوں؛ اور فيالحال اس کام کو دوسروں کے لیے چھوڑتا ھوں - لیکن میں حتيالوسع خود بھي اس سے غافل نہ رھوں گا اور ان کو حل کرنے کي کوشش کروں گا اور اس میں شک نہیں کہ یہ تحقیق نہایت درجہ دلچسپ ھوگی کہ یہ اصطلاحیں ھمارے ملک کي کس کس زبان سے تعلق رکھتي ھیں' - میں نے ؛ ھمارے ملک اس لئے کہا کہ یہ ظاھر ھے ؛ اور یہي فطرت کا تقاضا ھے ؛ کہ زیادہ تر اصطلاحیں ھماري دیسي زبانوں ھی سے ماخوذ ھونگی ؛ ؛ یہ بھی ممکن ھے کہ ان میں ایسے الفاظ بھي ھوں جن کے متعلق بالاخر یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ ان کا علاقہ کسی زبان سے نہیں ھے بلکہ ضلع الہآباد کے معماروں اور مزدوروں نے عمارت اور اس کي اینٹوں کي طرح ان کو بھي خود ھي بنایا اور گڑھا ھے ! اس مجموعے میں چند الفاظ انگریزي سے اور چند عربي اور فارسي سے ماخوذ ھیں ؛ باقي سب صریحاً ھندی یا سنسکرت اصل سے ھیں -

میں نے ان اصطلاحوں کو حروف تہجی کي ترتیب سے قلمبند کیا ھے ؛ اور متعدد مقامات میں شکلوں سے بھي کام لیا ھے ؛ جن سے اُمید ھے کہ اصطلاحوں کے سمجھنے میں کافي مدد ملیگی -

ان صفحوں میں ذیل کي مخفف علامتوں سے کام لیا گیا ھے :

امذ ....اسم مذکر

امث........اسم مؤنث

تغ ....تعلق پر غور کرو

جد........جس (یا ؛ جن) کو دیکھو

صف.........صفت

الف

اُپراوا—امذ (الف کے پیش سے - هندي: اوپر ؛ اوپري ؛ اُپرالا) - کسي قسم کي چٹائي یا کسي چیز کا وہ رخ جو اوپر کی طرف سے دیکھنے سے نظر آئے - بالائي؛ اوپر کا رخ - اسے اُپرایا بھي کہتے ھیں - اس کے مقابل یعنی نیچے کے رخ کو تراوا یا ترایا کہتے ھیں - دیکھو متھالا -

اُپرایا—امذ - مترادف ھے اپراوا کا ؛ جد -

آٹھ پہل—صف - (آٹھ=آٹھ) آٹھ پہلوں والا (والي) ؛ هشت پہل؛ وہ جس میں آٹھ پکھ ھوں - اس کو آٹھ ماس بھي کہتے ھیں -

آٹھ ماس—صف - (آٹھ = آٹھ ؛ ماس = سنسکرت واس वास =گھر ؛ خانہ ؛ پہل کے معني میں) - اس کا تلفظ آٹھ مانس (س سے پہلے نون غنہ کے ساتھہ) بھي کیا جاتا ھے - مترادف ھے آٹھ پہل کا ؛ جد -

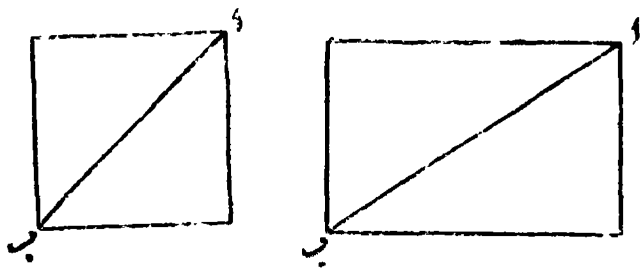
اُجبَک—امث - (الف کے پیش؛ ج کے سکون؛ اور ب کے زبر سے - عامی بولی : اُجبک؛ اُزبک = بیوقوف؛ احمق - ترکي : ازبک ؛ اوزبک — ترکي قبیلے کا نام) پیٹن کي وہ قسم جسے اُلّو بھي کہتے ھیں - دیکھو پیٹن -

اُچھالا—امذ - (پہلے الف کے پیش سے ؛ هندي : اُچھالنا ؛ اُچھال ؛ اُچھالا) - چالي کا ھر ایک سرا ؛ اُس حالت میں کہ جب چالي کو پاڑ کے اوپر پیٹی (جد) رکھہ کر دونوں (سروں کي) طرف سے باندھہ دیتے ھیں - دیکھو پاڑ؛ چالی -

اَدّھا—ا.ذ - (پہلے الف کے زبر اور د ھ کي تشدید سے - هندي : ادھہ؛ آدھا ؛ آدھہ) - آدھي اینٹ - لمبائي کے لحاظ سے اگر

اینٹ کو توڑ کر دو ٹکڑے کر لیے جائیں، تو ہر ایک ٹکڑا ادھا کہلائیگا - دیکھو پھری، کھنڈا -

آڑانا—امذ -(پہلے الف کے زبر سے - تغ · آڑنا ، آڑانا ، آڑ ، آڑا ، آڑوار) وہ خط جو کسی مُستطیل یا مربع شکل کے دو مقابل کے زاویوں کو ملانے سے پیدا ہو ، کونا کونی ریکھا - ذیل کی شکلوں میں ا ب آڑانا ھے —



آسار—امذ - (پہلے الف کے زبر سے - عربی : اثر کی جمع آثار، فارسی معنی میں) - دیوار کا آثار ، دیوار کی چوڑائی، موٹائی -

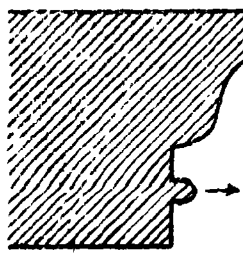
اُلّو—امذ - (تلفظ : مشہور منحوس پرندے کے نام سے : واو معروف سے) - پھٹن کی ایک قسم ، جسے اُجبک بھی کہتے ھیں - دیکھو پھٹن -

اِنٹَھا—ا.ذ - (الف کے زیر ، نون غنہ ، اور ٹ کے زبر سے = اینٹ ھار اینٹ والا یا والی) - اینٹیں لانے والا مزدور ، وہ مزدور جو راج کو چنائی کرنے کے لیے اینٹیں لا لا کر دیتا ھے - اس لفظ کا دوسرا تلفظ اینٹھا بھی ھے -

اندھا گولا—امذ - وہ گولا (جد) ، جو بہت کم دکھائی دے اور اپنی ھستی کو پوری طرح جتلا نہ سکے - دیکھو گولا -

آندھیاری—امث (الف کے زبر سے - ھندی : اندھا اندھیرا ' اندھکار)

(۱) ذات کے اوپر جو حصہ باہر کو نکال کر بنایا جاتا ہے، اُس کی ایک صورت ۔ دیکھو بہادری ۔ اندھیاری کی

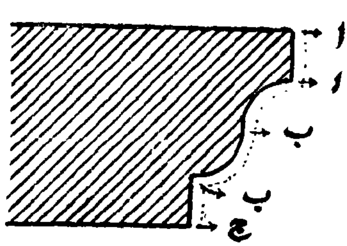


ایک صورت یہ ہو سکتی ہے :— اس شکل میں الفَ سے لے کر بَ تک (نقطے دار خط کے ساتھ ساتھ) اندھیاری ہے ۔

(۲) اینٹ کی چنائی میں (یا پتھر میں گڑھ کر بھی) چوڑی کے نیچے جو ڈھال یا نرماہٹ دیتے ہیں، خواہ وہ ڈھال کم ہو یا زیادہ، اندھیاری کہلاتا ہے ۔

اول—صف ۔ (وَ کی تخفیف سے بھی بولا جاتا ہے ۔ عربی : اول=پہلا) اینٹ کی صفت : اول درجے کی، سب سے اچھی قسم کی اینٹ ۔

ایڑ—امث ۔ (یاے مجہول سے تغ : ایڑی ۔ عموماً ڑ سے پہلے نون غنہ بھی بولا جاتا ہے) ۔ پٹے یا چوڑی کے اوپر اینٹ (یا پتھر) کو گڑھ کر جو لہر دار سی چنائی کی جاتی ہے، وہ ایڑ (یا اینڑ) کہلاتی ہے ۔ ذیل کی شکل میں نقطہ دار خط کے ساتھ ساتھ الف سے ج تک ایڑ ہے ۔



اس کے مختلف حصوں کے نام یہ ہیں : (۱) پہلے الف سے دوسرے الف تک پٹا ہے ۔ (۲) دوسرے الف سے پہلی ب تک گھل ہے ۔ (۳) پہلی بَ سے دوسری بَ تک پھولن ہے، اور اسی کو چوتر بھی کہتے ہیں، اور

(۴) دوسري بَ سے جَ تک کا نام چلها ؛ یا "ایڑ کي کور" ھے -

ایڑ کي کور—امث - دیکھو چلها (۴) -

ایلتھا—امذ - یاے معروف ؛ اور تَ کے زبر سے) - دوسرا تلفظ ھے انتھا کا ؛ جد -

ب

بانکڑي—امث - (بانک ؛ بانکا ؛ بانکپن=ٹیڑھا ؛ مڑا ھوا ؛ ترچھا ؛ خمیدہ) - لوھے کي ایک سیخ جس کا ایک سرا ڈیڑھ دو انچ کے طول میں کسي قدر گولائي کے ساتھہ مڑا اور پٹا ھوا ھوتا ھے - گویا اُس کي شکل ھاکی کھیلنے کے ایک چھوٹے سے بلّے کي سي ھوتی ھے - یہ آلہ "رولدار" پیٹن (جد) بنانے کے کام آتاھے - یہي پٹا ھوا سرا پیٹن کے مسالے پر رکھہ کر دبادیا جاتا ھے ؛ جس سے پیٹن کی لکیریں بن جاتي ھیں - اس کي شکل یہ ھے :

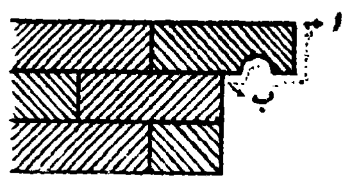


بانکڑي دار—صف - ایک قسم کي پیٹن' دیکھو پیٹن (۳) -

بٹي مارنا—مصدر - (تغ : بٹا=کمی؛ نقص؛ عیب؛ پتھر؛ پتھر کا ٹکڑا) گھونٹنا ؛ گھٹائي کرنا ؛ پالش کرنا ؛ چمکانا ؛ صاف ؛ برابر کرنا- جب پلستر کے مسالے (خاص کر چونے) کا ذرّہ گھل مل کر ایک ھو جاتا ھے ؛ اور اُس کی خامي کا زور جاتا رھتا ھے ؛ تو اُسے کنّي سے گھوٹ (رگڑ) کر برابر اور صاف کیا جاتا ھے - اس طرح نہ صرف یہ کہ مسالے کے سب ذرّے مل کر مسالے کو مضبوط اور سطح کو صاف اور برابر

کردیتے هیں ؛ بلکه سطح پر ایک چمک بھي آ جاتي ھے -
اسي کو "پٹی مارنا" کہتے هیں -

برھا—امذ - (ب اور ر کے زبر سے سنسکرت برھه : बर्ह: مور کي دم کا پر وہ پٹا (جد)" جس میں نیچے کی طرف کھانچ هو- (دیکھو کھانچ) - جب کسی کار نس میں ؛ یا دیوار کے بالکل اوپر سرے پر پہنچ کر ؛ پٹا بناتے هیں ؛ تو اُس پٹے میں نیچے کی طرف ایک انچ (یا پٹے کی مقدار کی نسبت سے کم یا زیادہ) گہرا کر نیم دائرے کی شکل میں گہرا کر دیتے هیں - اس گہرائي اور پٹے کو ملا کر "برھا" کہتے هیں - اس کي غرض یه هوتي ھے که جب پانی دیوار کے سر پر گرے تو بہتا هوا پٹے کے نیچے پہنچ کر اِس کھانچ سے لپٹتے هی نیچے ٹپک جائے اور تمام دیوار پر بہتا اور اُسے خراب کرتا هوا نه جائے - برھا کی شکل یه ھے : اس میں الف سے ب تک برھا ھے :



برہیری—امث - (پہلی ي مجہول اور دوسری معروف) - دھلّی ؛ شہتیر ؛ جس پر کھپریل کي چھاؤني چھانے کے وقت ٹھاٹھہ (ٹھاٹھر) کے بانس رکھے جاتے هیں -

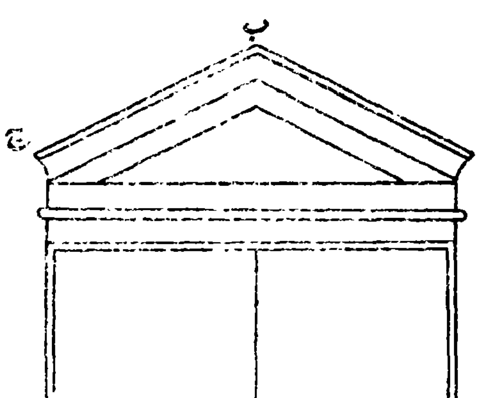
بَرَیل—امث - (ب اور ر کے زبر سے) - یه دوسرا نام ھے کٹّي کا ؛ جد -

بسولي—امث - (واو معروف سے - تغ : بسولا ؛ بڑھئي کا اوزار) معمار کا تیشه : ھتوڑي کی قسم کا لوھے کا ایک آله جس کے

آخر میں دھار ہوتی ہے ، اور ایک طرف لکڑی کا دستہ لگا ہوتا ہے - راج لوگ اس سے اینٹ تراشنے ، گڑھنے اور توڑنے کا کام لیتے ہیں - اس کے جس حصے میں دھار ہوتی ہے ، وہ لوہے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے ، جو ہتوڑی کے سر سے الگ ہوتا ہے - جب دھار کند ہو جاتی ہے تو اُسے نکال کر تیز کر کے پھر لگا لیا جاتا ہے -

بَکَس--اسذ - (بَ اور کَ کے زبر سے - انگریزی بوکس box صندوق) چنائی یا کسی قسم کا تعمیری کام شروع کرنے سے پہلے اینٹوں کا ذخیرہ کرنے کے لیے اُن کو ایک جگہ ایک (پتلی یا چوڑی سی) دیوار کی صورت میں جمع کر کے ترتیب وار رکھا جاتا ہے - اس مرتب اور مجموعی صورت کو "بکس" کہتے ہیں - جب اینٹیں تعداد میں زیادہ ہوتی ہیں ، تو عام طرر پر پان سو یا ایک ہزار کا "بکس" بناتے ہیں - گویا اس کی مجموعی ہیئت ایک بڑے سے صندوق کی ہوتی ہے -

بَگَنس--اسذ - (بَ اور لَ کے زبر سے) - بہادری (جد) کی ایک



وضع ہے، جو عموماً ایک مثلث کی شکل میں کھڑکی یا دروازے کے اُوپر باہر کی طرف بناتے ہیں - اس شکل میں ا ، ب ، ج بگلس ہے -

بلّی—اِمث - (ب کے زبر اور ل کی تشدید سے) - لکڑی کا شہتیر ؛ موٹی سی لکڑی ؛ جس کو چھت پر ڈالنے یا پاڑ کی ٹھریا وغیرہ بنانے کے کام میں لاتے ھیں - بَلّیاں عموماً ساکھو کے درختوں کے پورے پورے تنوں کی ھوتی ھیں ؛ اور اُن کی لمبائی بھی قریب قریب پورے درخت کی اونچائی کے برابر ھوتی ھے -

بند دار (ڈاٹ)— ا ؛ صف - ڈاٹ کی ایک قسم ھے ؛ جس کو "چدری ڈاٹ" بھی کہتے ھیں - دیکھو ڈاٹ -

بوندی مار—صف - (واوٗ معروف اور نون غنه سے - بوند ؛ پانی کا قطرہ) - اینٹ کی صفت ھے : وہ اینٹ جسے پانی کی بوند مار گئی ھو ؛ ایسی اینٹ جس پر بھٹے میں تیار ھونے کے وقت ؛ یا تیار ھو جانے کے فوراً بعد ؛ کسی سبب سے پانی کی بوندیں پڑ گئی ھوں - ایسی اینٹ میں جگہ جگہ سوراخ سے ھو جاتے ھیں ؛ اور جگہ جگہ سے اُبھی ھوئی سی معلوم ھوتی ھے - چونکہ اس میں شور بہت جلدی اثر کرتا ھے ؛ اس لیے ایسی اینٹ کو عمدہ اور مضبوط تعمیری کام میں استعمال نہیں کیا جاتا ؛ اور اسے عیب دار شمار کیا جاتا ھے -

بہادری—اِمث - (گویا فارسی لفظ بہادر سے اسم کیفیت ھے) - وہ چنائی جو محراب کی ڈاٹ کے اوپر دیوار سے آگے کو نکلی ھوئی بنائی جاتی ھے - اس کی کئی قسمیں ھیں ؛ مثلاً : صرف ایک ایڑ ؛ یا اندھیاری ؛ یا چوڑی اور ایڑ ملے ھوئے ؛ یا دانتوا ؛ یا اور طرح طرح کی سجاوٹ کی چنائیں

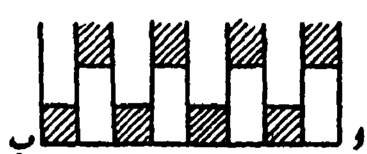
کو ملا کر بہادری بناتے ھیں - غرض کہ جو کچھہ اور جس
قسم کی جوائی (چلائی) بھی ذات کے اوپر باھر کو نکلی
ھوئی بنائی جائے وہ " بہادری ھے " - دیکھو بکلس -

بھالــامذ - (بَ کے زبر سے) - وہ سوراخ یا موکھا ؛ جو پیتی (جد)
کے رکھنے کی وجہ سے دیوار میں رہ جاتا ھے - دیکھو پیتی ؛ پاڑ -

بے تاوــصف - فرش یا دیوار کی وہ استرکاری جس کا تاؤ
(جد) خراب ھو جائے - اگر تاو کی حالت سے کچھہ اور
زیادہ عرصہ گذر جائے تو استرکاری (پلستر) کو " بے تاو "
ھو جانا کہتے ھیں - یہ ضروری ھے کہ جیسے ھی پلستر
(مثلاً فرش کا) تاو کی حالت پر پہونچے ؛ ویسے ھی اس
کی گھٹائی کردی جائے - اگر صحیح وقت کے بعد گھٹائی
کی جائے گی ؛ تو وہ ٹھیک نہ ھوگی اور پلستر مضبوط
نہ ھوگا - اس خرابی کو یوں بیان کیا جاتا ھے کہ فرش
" بے تاؤ ھو گیا " - دیکھو تاؤ -

بیضاری—الف ؛ صف - (=بیضاوی : عربی : بیضوی ؛ انڈے کی
شکل کا) ذات کی ایک قسم ھے - دیکھو ذات -

بیل—امث - (یاے مجہول سے سنسکرت : ویلا वेला حد ؛ انتہا)
سیدھہ ؛ النگ ' قطار کا سیدھا ھونا ' سیدھی لکیر ؛ سیدھا کنارہ ؛
سیدھی کور یا کگر : غرض کہ ھرقسم کی سیدھہ کو " بیل "
کہتے ھیں - " بیل میں ھونا " شروع سے آخر تک ایک ھی
حد پر ختم ھونا یا ایک ھی حد سے شروع ھونا - ذیل کی شکل میں
الف سے ب تک کی اینٹوں
کو کہا جائیگا کہ ایک ھی
" بیل " میں ھیں -



بھلچا—امذ - (یاے مجہول سے ' فارسي : بیل کا مصغر ' بھلچہ) - بھلچہ : پھروا ' خصوصاً ولایتی پھروا جس سے کام کرنے میں ھاتھ نیچے سے اوپر کی طرف کو چلتا ھے - " پھروا " اور " بھلچا " میں عام طور پر یہی فرق سمجھا جاتا ھے ' اور کاریگر لوگ اسے اصطلاحی فرق کے ساتھ بولتے ھیں کہ " پھروا " دیسي قسم کا اوزار ھے جس سے " الٹے ھاتھوں " کام ھوتا ھے ' مگر " بھلچا " وہ ھے جو ولایتي اوزار ھے اور نیچے سے اوپر کو چلایا جاتا ھے - بھلچے کا استعمال (زمین وغیرہ کو) کھودنے کے لیے نہیں ھوتا ' بلکہ مٹّي ' چونا گٹّي وغیرہ مسالے کو اُٹھانے ' ملانے ' یا سوندنے کے کام آتا ھے -

بیلدار—امذ - وہ مزدور جو پھروا (بیل ' بیلچہ) چلانے کا کام کرتا ھے - " بیلدار " اور " مزدور " میں یہ فرق ھے کہ " بیلدار " بیلچے سے کام کرتا ھے ' مگر " مزدور " ھر وہ شخص ھے جو راجگري کے سوا اور سب طرح کے کام کرتا ھے - دیکھو مزدور -

بینڈرا—امذ - (یاے مجہول اور نون غنہ سے) - پاڑ میں وہ بانس (یا لکڑیاں) جو تھوبا (جد) میں باندھے جاتے ھیں اور زمین سے متوازی رھتے ھیں - یہ بانس زیادہ بڑے نہیں ھوتے - اگر یہ زیادہ لمبے ھوں تو اُن کو " دھانگڑ " کہتے ھیں - دیکھو دھانگڑ -

بھ

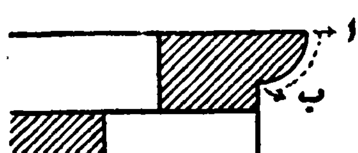
بھاگنا—مصدر - سیدھي سطر یا قطار سے ' سیدھي بیل سے باھر ' ھٹا ھوا ھونا - " بیل بھاگ رھي ھے " : قطار '

سطر ، لکیر ، بہل ٹیڑھی ہوئی جارہی ہے ، سیدھ بگڑی جاتی ہے -

بھرا پیٹ—صف - وہ جُڑائی (چُنائی) جس کا پیٹ بھرا ہو ، جو پُر ہو ، بھری ہوئی ہو - جڑائی کرتے وقت (عام اس سے کہ وہ اینٹ کی ہو یا پتھر کی) کنہ (جد) لگا کر جوڑ دینے کے بعد بھی جب ایک ردّا پورا ہوجاتا ہے تو پورے ردّے پر مسالا (مٹی یا چونا یا سیمنٹ) گھول کر پھیلا دیتے ہیں ، جس سے وہ درزوں میں سے ہو کر اندر بھر جاتا ہے - اس طرح جب جڑائی کے اندر (پیٹ میں) سب مسالا پہنچ جاتا ہے اور اور وہ ہر طرف سے اینٹوں کو پکڑ لیتا ہے ، تو اسے "بھرا پیٹ" کہتے ہیں -

بُھرکی—صف - (بھ کے پیش سے) - اینٹ کی صفت : ٹوٹی ہوئی اینٹ ، خاص کر وہ جو سیدھی نہ ٹوٹی ہو بلکہ کسی زاویے پر ٹوٹی ہو ، یا جس کا کوئی کونا جھڑا ہوا یا کوئی کور ٹوٹی ہوئی ہو اسے "کھڑھی" بھی کہتے ہیں - دیکھو روڑا ، کنکل -

بَھنّا—امذ - (بھ کے زبر اور نّ کی تشدید سے) - وہ جڑائی جو پٹے یا کسی اور قسم کی جُڑائی (مثلاً چوڑی ، گولے ، ایز وغیرہ میں) کے اوپر ایک نصف دائرے کی شکل میں بنائی جاتی ہے - ذیل کی شکل میں الف سے ب تک بَھنّا ہے :



بَھوکا—امذ - (بھ کے زبر سے) - ٹوکرا ؛ خاص کر اُس حالت میں کہ جب اُس میں کوئی مسالا (اینٹ ؛ پتھر ؛ کنکل ؛ روڑا ؛ گِٹّی وغیرہ) بھرا ہوا ہو - دیکھو پلڑا ؛ پلڑی -

پ

پاڑ (یا پاڑھہ)—امث - بانسوں اور بلیوں کا وہ ٹانڈ یا مچان ؛ جس پر بیٹھہ کر معمار دیوار چلتے ہیں - سب سے چھوٹی اور سادہ پاڑ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو بانس (یا بلّیاں) زمین پر سیدھی عمودوار کھڑی کرتے ہیں ؛ اور مضبوطي کے لیے ایک سرا کچھہ دور تک زمین میں گاڑ دیتے ہیں یہ بانس "تھڑیا" کہلاتے ہیں - پھر دو اور بانس لے کر اُن میں سے ہر ایک کا ایک سرا دیوار پر رکھتے ہیں اور دوسرے کو ایک ایک عمودی بانس سے باندھہ دیتے ہیں یہ "پینٹھیاں" ہیں - اسی طرح ایک اور بانس زمین اور دیوار کے متوازي طور پر عمودی بانسوں سے باندھہ دیتے ہیں - یہ بانس "بلیٹرا" ہے - پھر دونوں پینٹیوں پر ایک چالی (جد) رکھہ کر اُسی پر راج بیٹھتے اور کام کرتے ہیں - یہ مکمل پاڑ ہے -

پتھر پایا—امذ - (پایا=فارسی پایہ) - ستون کی وضع کی تعمیر ؛ جو ایک دیوار کے بیچ میں (صرف ایک مرتبہ یا ایک سلسلے سے) یا عمارت کے ایک کونے میں اس طرح بناتے ہیں کہ وہ بذات خود پورا ستون نہیں ہوتا بلکہ باقي کي دیوار سے زرا آگے کو بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ستون کی طرح دکھائی دیتا ہے - اس کا بھی باقی دیوار سے باہر کو نکلا

ہوا ہوتا ہے وہ خصوصیت ہے جس کے سبب سے یہ "پتھر پایا" کہلاتا ہے -

پَتّا— امث - (پَ کے زبر اور تّ کی تشدید سے) - وہ سیدھی ، معمولی ، مگر اُبھری اور باہر کو نکلی ہوئی چنائی جو چوڑی ، ٹولا ، ایز وغیرہ قسموں کی چنائی میں کی جاتی ہے - ذیل کی شکل میں اَلِف بَ پتّا ہے -



پَٹری— امث (پَ کے زبر اور ٹ کے سکون سے) - چونے ، یا چونے اور سیمنٹ کی وہ تہ جو ایک پٹی کی شکل میں کارنس کے نیچے یا منڈیر کے سروں پر عموماً ڈیڑھ یا دو انچ کی چوڑائی میں اور دیوار سے آدھ انچ اُبھری (یعنی باہر کو نکلی) ہوئی بنائی جاتی ہے - اس کی چوڑائی کارنس وغیرہ کی وسعت کی نسبت سے کم یا زیادہ بھی ہوسکتی ہے -

پَٹّی— امث (پَ کے زبر اور ٹّ کی تشدید سے) - دیوار بنانے میں اینٹوں کی وہ جڑائی (چنائی) جس میں اینٹیں اپنے طول میں اس طرح رکھ کر چنی جائیں کہ اُن کے عرضی ضلعے ایک دوسرے سے ملے رہیں، جیسے اس شکل میں :



"پٹی" لگانا پٹی کی چنائی کرنا -

پَچھیت ۔ امث (یاے معروف سے) دوسری صورت ہے پچھیت کی ' جد

پچھیت — امث (پَ کے زبر اور یاے معرف سے) مکان کی پیچھے والی 'پشت کی دیوار' پچھواڑے کی دیوار ' دالان کے پشت پر کی دیوار ۔

پَکّا ڈھولا — امذ ۔ کھڑکی یا دروازے کی ڈاٹ اور چوکھٹ کے اوپر والے سیروے کے بیچ کی چنائی ۔ اس کو تملچا بھی کہتے ہیں ۔

پکھہ — امذ ۔ (پَ کے زبر سے سنسکرت پکش पक्ष ۔ ضلع ' پہل ' پہلو) - (۱) چار سے زیادہ — پانچ ' چھہ ' سات ' آٹھہ ' دس ' بارہ وغیرہ — ضلعوں (پہلوں) والی شکل (کی چنائی) کا کوئی ضلع یا پہل - (۲) وہ چھوٹا سا پہل جو کسی دیوار کے باہر کی طرف والے کونے ' یا فرش کی کگر یا اُس کے کنارے ' کو مار یا گڑہ کر یا اگر اُس پر مسالا لگا ہے تو اُسے دبا در برابر کردینے سے پیدا ہوجائے ۔ دیکھو پکھا ۔

پَکھا — امذ ۔ (پَ کے زبر اور کھّ کی تشدید سے پکھہ ' پکش) ایک تکون یا چو کور (مثلث ' مربع ' مستطیل) شکل کا ایک ضلع یا پہل ۔ پکھہ اور پکھا میں فرق یہ ہے کہ پکھا تین یا چار پہل کی شکل کے ایک پہل کو کہتے ہیں ' اور پکھہ میں شکل کے پہل چار سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں ۔

پلَاسٹر — امذ ۔ (پَ کے زبر اور زیر ' دونوں طرح - انگریزی پلاسٹر Plaster عموماً پ کے زیر سے) دیکھو پلسٹر ۔

پلَرا — امذ - (پ کے زبر سے نغ ؛ فارسي پلّه) ٹوکرا ' جس میں تعمیر کے کام کے لیے مسالا وغیرہ رکھا جاتا ھے - چھوٹے ٹوکرے (یا ٹوکري) کو "پلري" کہتے ھیں - دیکھو بَھوکا -

پلَري — امث - (پ کے زبر سے) ٹوکري ، چھوٹا ٹوکرا - دیکھو پلرا ' بَھوکا -

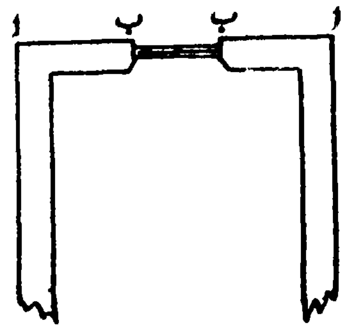
پلستر --- امذ - (پ کے زبر سے عموماً ' اور زیر سے بھي - انگریزي پلستر Plaster) فرش یا دیوار وغیرہ پر مٹي یا چونے کي تہ یا لپائي ' چونے یا مٹي کي استرکاري ' کہگل ' گچکاري - دیکھو پلاستر -

پُلوئی — امث - (پ کے پیش ' اور واو معروف سے) - پیٹي (جد) کی وہ قسم جس میں موٹے بانسوں کی جگہ پتلے بانس استعمال کیے جائیں ' یا یہ کہ بانس کا پتلا سرا اس کام میں لایا جائے - پیٹی اور پُلوئی میں صرف یہ فرق ھے کہ پیٹی موٹے بانس کی ھوتی ھے اور پلوئی پتلے بانس کي -

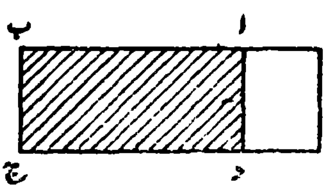
پَن چیر --- امذ - (پ کے زبر ' اور یاے معروف سے - پن=پانی + چیر --- چیرنا سے) - کوئي اُبھری ھوئی چیز (مثلاً ملگراوا ' کُلیا وغیرہ) یا جگہ جہاں پانی گر کر اِدھر اُدھر دونوں طرف کو بہ جائے ؛ وہ چیز یا جگہ جو پانی کو چیر کر اِدھر اُدھر بہادے - دیکھو کھپرا ؛ ملگراوا ؛ کلیا -

پَوتھا — امذ - (پ کے زبر سے) - دیوار کا وہ حصہ جو دروازے کی عمودي چوکھٹ (پٹي) سے لے کر دیوار کے کونے تک ھوتا ھے - اس طرح اگر کسی دیوار میں صرف ایک

دروازہ ہو تو اُس کے دونوں طرف کا حصہ ”پوتّھا“ کہلائیگا ۔ ذیل کي شکل میں ’ا ب‘ اور ’ب ا‘ دونوں پوتّھاں ہیں :-



پونّا — یا پَوَنّا — اسم ۔ (پونا ، تین چوتھائي حصہ)۔ پوري اینٹ کا تین چوتھائي حصہ جو اُس کي لمبائی میں سے کاٹ یا توڑ کر نکالا گیا ہو ۔ ذیل کی شکل میں ا ب ج د پونّا ہے ۔



پیالے دار (ڈاٹ) ۔ اسم ۔ ڈاٹ کي ایک قسم ہے ۔ دیکھو ڈاٹ (۲ ب)۔

پھٹّن — اسم ۔ (پ کے زبر اور ٹ کے زیر سے ۔ انگریزي پوائنٹنگ Pointing) ۔ اینٹ یا پتھر کي جڑائی میں (خواہ وہ فرش میں ہو یا دیوار وغیرہ میں) اینٹوں کي درزوں میں چونا یا سیمنٹ بھرنا ۔ پھٹّن کي چار قسمیں ہیں : (۱) لیول (تغ لیپنا، لیپ) جس میں درزوں

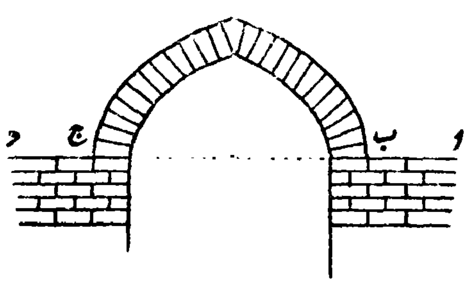
میں چونا یا سیمنٹ بھر کر اُسے کنّي کي ٹیک (جد) سے اوپر سے لیپ کر چکنا کر دیا جاتا ہے - اسے انگریزي میں " فلش پوائنٹنگ" (Flush Pointing) کہتے ہیں (۲) اُلو (واو معروف سے) ' جس میں درزوں میں مسالا بھر کر اندر ہي اندر اُسے لیپ کر اس طرح صاف اور برابر کردیا جاتا ہے کہ اینٹ کی درز دکھائی دیتي رہے اس کا انگریزي نام "رف پوائنٹنگ" (Rugh Pointing) ہے - اس کو "اُجبک" بھي کہتے ہیں - (۳) بانکری دار ' جس میں درز میں مسالا بھر دیتے ہیں ' پھر اُسے بانکري (جد) سے اینٹوں کي درزیں بنا کر نمودار کردیا جاتا ہے - یہ انگریزي محاورے میں " رولڈ پوائنٹنگ " (Ruled) ہے - (۴) کٹوا (کاف کے زبر اور ٹ کے پیش سے) ' جس میں درزوں کے اندر مسالا بھرنے کے بعد اُن کے اوپر بھي اس طرح مسالا جمایا جاتا ہے کہ وہ ⅛ انچ اُبھرا رہے - پھر اُسے اس طرح صاف کرتے اور چکناتے ہیں کہ وہ خوشنمائی سے ہر درز کي جگہ پر اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے - پیٹن کي یہ قسم سب سے زیادہ خوشنما ہوتي ہے - پیٹن کو " ٹیپ " بھي کہتے ہیں -

پیٹھہ (کارنس کي)—اسم - (یاے معروف سے) - کارنس کی اوپر کی سطح ' جس کا رخ اوپر کو یعني چھت (یا آسمان) کي طرف ہوتا ہے -

پیٹي—اسم - (پہلي یٰ مجہول) - وہ بانس ' جو پاڑ میں زمین کے متوازي ہوتا ہے اور جس کا ایک سرا دیوار پر اور ایک تھریا (جد) سے بندھا ہوتا ہے - دیکھو پاڑ -

"پہنتی" کا جو سرا دیوار پر رکھا جاتا ہے، ظاهر ہے کہ چنائی کرتے وقت اُس کے آس پاس اور اُوپر هي چنائی هوسکتي ہے - اس طرح چنائی هو جانے کے بعد جس جگہ پہنتي کا وُہ سرا رکھا گیا تھا، وهاں ایک موکھا رہ جاتا ہے : اسے "پنتي کا در" کہتے هیں - اگر پہنتي کا یہ سرا دیوار کے آثار کے آدھے میں رکھا هو اور دوسري طرف سے دیوار چني جا سکے تو یہ "در" آدھے هی آثار تک رهتا ہے - لیکن اگر پہنتي کا سرا اتنا لمبا هو کہ وہ آثار کے آر پار دوسری طرف نکل جائے، اور اُس طرح دیوار میں بالکل آر پار ایک سوراخ رہ جائے، تو ایسے سوراخ کو "بیالا" کہتے هیں - دیکھو پلوتي -

پہکار ـــ امذ - (پ کے زبر سے) - وہ جڑائی جو کسي دروازے یا کھڑکي کے دونوں طرف، دائیں اور بائیں، ذات کے نیچے کي حد تک پہنچ گئي هو - اس شکل میں ا، ب، ج، د، پہکار ہے :-

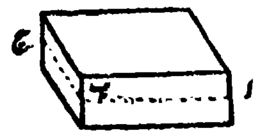


پھ

پھت ـــ امذ - صف - (پھ کے پیش سے) - ایک راج جو کسي جگہ اکیلا هی کام کر رها هو -

پھرّی ـــ امث - (پھ کے زبر، اور ر کي تشدید سے) اینٹ کا وہ آدھا ٹکڑا، جو اینٹ کی موٹائي میں سے دو برابر کے ٹکڑے کاٹ کر نکالا جائے - هر ایک ٹکڑا "پھرّي" کہلاتا ہے -

اس شکل میں ا ب ج نقطہ دار خط کے اوپر اور نیچے
ایک ایک پھری ہے :-



دیکھو ادھا ، کھدا -

پَھروا—امذ - (پھ کے زبر اور ڑ کے پیش سے) - پھاوڑا ، بیلچہ ،
گل صفا : زمین کھودنے یا مٹی ، چونا ، ملبا وغیرہ ہٹانے اور
صاف کرنے کا لوہے کا بڑا ہوا اوزار ، جس کے ایک طرف
لکڑی یا بانس کا لمبا سا دستہ لگا ہوتا ہے ، جسے پکڑ
کر پھروا چلایا جاتا ہے - دیکھو بیلچا -

پَھسیل—امث - (پھ کے زبر ، اور یاے مجہول سے - یہ دوسرا
(اور بگڑا ہوا) تلفظ ہے فصیل کا ، جد -

پِھلکا—امذ - اس کا دوسرا اور بہتر تلفظ ہے فِلکا " جد -

پُھولن—امث - (واو معروف ، اور ل کے زبر سے - پھولنا ، پھولا ،
پھوں—ابھرا ہوا ہونا) - دیکھو ایز - پھولن کو " چوتر "
بھی کہتے ہیں -

تھ - تھ

تاؤ—امذ - (تاؤ فارسی : تاؤ تاب=طاقت ، مضبوطی ، چمک) -
جب فرش یا دیوار وغیرہ کی چونے کی استرکاری اس
حالت پر پہنچ جائے نہ چونے کے سب ذرّے گل کر اور
گھل مل کر ایک جان ہو گئے ہوں اور چونا اس قابل
ہو گیا ہو کہ اس کی کُھٹائی کردی جائے ، تو اس حالت
کو " تاؤ " اور " تاؤ پر آنا " کہتے ہیں - دیکھو بے تاؤ -

تجائی—امث ۔ (تَ کے زیر سے) ۔ (۱) اونچان ؛ اُتھان ؛ اُونچائی ۔
(۲) دیوار میں چنائی کا وہ حصہ جو کھڑکی یا دروازے میں ؛ اوپر کی طرف ؛ چوکھٹ کے آگے اور پیچھے (یعنی اندر اور باہر دونوں طرف) کھلا رہ جاتا ہے ۔ یہ نام صرف اوپر کے حصے کی ایسی چنائی کے لیے ہے ؛ نیچے کی چنائی کو "تجائی" نہیں کہتے ۔ دیکھو کویری ۔

تَراوا— امذ ۔ (تَ کے زبر سے ۔ تغ : تلا ؛ تلی ؛ ترائی) ۔ کسی قسم کی چنائی کا یا کسی چیز کا وہ رخ جو نیچے کی طرف سے دکھائی دے ؛ تلے کا ؛ نیچے کا رخ ۔ اسے "ترایا" بھی کہتے ہیں ۔ اس کے مقابلے میں اوپر کے رخ کو اپراوا یا اپرایا کہتے ہیں ۔

تَرایا—امذ (تَ کے زبر سے) ۔ وہی ہے جو تراوا ہے ؛ جد ۔

تُرِیا—امث ۔ (تَ کے پیش سے) ۔ لکڑی لوہے ؛ اینٹ ؛ پتھر ؛ سیمنٹ کنکریٹ کے (مختلف وضعوں اور شکلوں کے) بنے ہوئے بازو ؛ جو دروازے یا کھڑکی کے دائیں بائیں دونوں طرف دیوار میں چنائی کر کے یا میخوں سے جڑ کر بنائے جاتے ہیں ؛ اور جن پر سائبان کا جھانپ (جد) ٹکتا ہے ۔

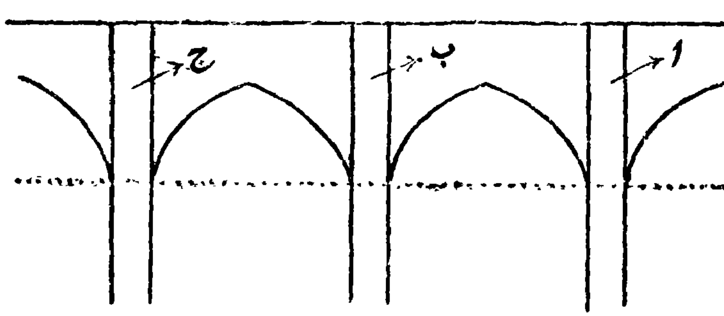
تَگار—امذ ۔ (تَ کے زبر سے ۔ فارسی : تغار) ۔ وہ گڑھا جو (زمین میں) مٹی کا گارا یا چونا بھگو کر سوندنے اور چنائی کے لیے تیار کرنے کی غرض سے بنایا جاتا ہے ۔ یا تو یہ گڑھا زمین میں بنایا جاتا ہے یا زمین پر اینٹوں کا فرش بچھا کر اور چاروں طرف ایک چھوٹی سی دیوار کھڑی کرکے تیار کیا جاتا ہے ۔ مٹی کے گارے کا تگار عموماً زمین میں گڑھا کھود کر بناتے ہیں ؛ اور چونے کے لیے اینٹوں کے فرش سے ۔ بڑے

تکار کو "تکار" اور چھوٹے کو مصغر کر کے "تکاری" کہتے
ہیں -

تکاری—اسث - چھوٹا تکار - دیکھو تکار -

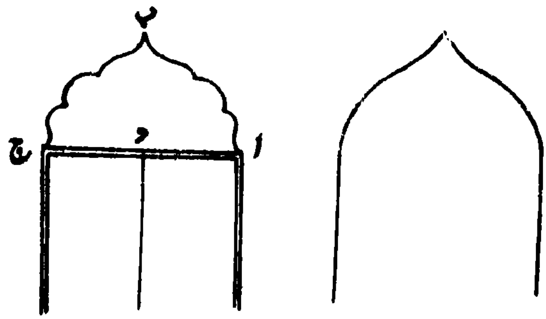
تمبا—امذ - (ت کے زبر سے تغ : دکھنی ، تمبالو، هندی : تونْبا ،
تونْبی) - ٹین یا لوہے کا تام لوٹ ، ڈونگا ، جس میں پانی
بھر کر ایک آدھہ اینٹ ، تھوڑا سا گارا یا چونا یا تھوڑی سی
چنائی وغیرہ کو بھگوتے ہیں - عام طور پر ٹین یا لوہے کے
کھلے مُنہ کے ڈبّے سے بھی تمبے کا کام لے لیتے ہیں -

تملچا—امذ - (ت اور میم کے زبر سے - فارسی : طماچہ ، طمانچہ ،
تپانچہ=تفنگچہ ، تھپڑ) - ایک (یا تناسب کے لحاظ سے
زیادہ) اینٹ کی وہ چنائی ، جو قریب قریب کی دو محرابوں
کے درمیان میں عمودی شکل میں دیوار سے ذرا باہر کو
نکلی ہوئی ہوتی ہے اس کی شکل یہ ہے :-



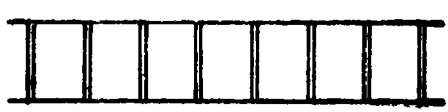
اس میں الف ، ب اور ج تملچے ہیں - (۲) محراب کی ذات اور
دروازے کی چوکھٹ کے درمیان میں نیم دائرے ، یا جیسی
شکل پیدا ہو) کی شکل کی چنائی - ذیل کی دونوں شکلوں

میں ا، ب، ج، د کے درمیان میں گھری ہوئی جگہ کی چنائی تمنچا ہے :-



اس کو "نکل (نقل)" اور "پکا ڈھولا" بھی کہتے ہیں -

توڑا — امذ - (واو مجہول سے) - چنائی میں اینٹوں کو اس طرح لگانا کہ ان کا عرضی پہلو ساتھ ساتھ رکھا جائے "توڑا لگانا" یا "توڑے کی جڑائی کرنا" کہتے ہیں - دیکھو پٹی - توڑے کی شکل یہ ہے :-



تھاپی - امث - (تغ - تھپکنا، تھپکی) - لکڑی کا بنا ہوا اوزار، جو ایک موٹی سی کلّی کی شکل کا ہوتا ہے - اس سے فرش یا دیوار (وغیرہ) پر استرکاری کرنے کے لیے مسالا (خاص کر چونا) لگاکر آہستہ آہستہ پیٹتے (تھپکتے) ہیں تا کہ مسالا ایک جی جان ہوکے دیوار (یا فرش) کی چنائی کو پکڑنے اور مضبوط ہوجائے - اگر تھاپی سے اس طرح نہ تھپکا جائے تو استر (پلستر) پھٹ جاتا ہے اور مضبوط نہیں ہوتا -

نظم و نثر پر ایک نظر

(از اصغر حسین اصغر مرتب رسالہ)

حقیقت کی جستجو فطرت انسانی کو ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی، لیکن حقیقت خود جس طرح ایک بحر ناپیدا کنار ہے؛ اُسی طرح کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں تک پہونچنے کے لیے طلب و جستجو کی راہیں بھی کتنی بے حد و بے شمار ہوں گی، اِس لیے کہ ہر دماغ اپنے مخصوص ماحول اور اس طرح اپنی مخصوص ساخت و صلاحیت کے اعتبار سے مختلف و منفرد واقع ہوا ہے۔ شاید اسی لیے ایک حکیم نے حق و صداقت کی راہوں کو انفاس خلائق کے برابر بتایا تھا۔

اس اعتبار سے انسان نے اپنے خاموش "اعمال" سے کون کون سی منزلیں طے کیں، کس کس طرح اور کن کن گوشوں سے صداقت اور حقیقت کو بر افگندہ نقاب کر کے عالم آشکارا کیا، یہ تمام امور اور اُن کی تفصیلات تاریخ تمدّن کے اہم ترین ابواب ہیں، لیکن اسی ضمن میں اس کے "اقوال" بھی اس کے اعمال سے کم اہمیت نہیں رکھتے، اس کے "اعمال" نے اگر سوسائٹی میں تنظیم پیدا کی ہے، ابتذال اور قباحتوں کو دور کر کے ملکوں اور شہروں کو سنوارا ہے اور ہر طرف امن و فارغ البالی کی لہریں دوڑا دی ہیں تو ٹھیک اُسی طرح اس کے "اقوال" نے بھی "علم و ادب" کے نام سے ذہن انسانی کے تاروں کو فطرت سے ہم آہنگ بنایا ہے، اور دل و دماغ کی فضا کو حقائق و معارف کے نغموں سے معمور کردیا ہے، بایںہمہ علوم و معارف کا سمندر

آج بھی اُسی طرح بے پایاں ہے جس طرح خود انسانیت کا ذوق جستجو :—

نہ حُسنش غایتے دارد نہ سعدي را سخن پایاں

بمیرد تشنہ مستسقي و دریا ھمچناں باقي

معلوم یہ ھوتا ھے کہ طلب و جستجو میں ایک حرکت دوام کی سي کیفیت ھے ' انسان اپني استعداد کے اعتبار سے کہیں ھو مگر اس کا ذوق جستجو ھر وقت اور ھر ساعت مصروف کار رھتا ھے - اُس نے اول اول جب اس جلوہ گاہ فطرت میں آنکھیں کھولي ھوں گي ' بہتے ھوئے دریاؤں ' رنگ برنگ کے پھولوں اور چمکتے ھوئے ستاروں کو دیکھا ھوگا تو اس کے حیرت کا کیا عالم ھوا ھوگا اور اس کے جذبات اور احساسات پر کیا گذري ھوگي ' "شعر و شاعری" کي کل کائنات اسی جذبے اور احساس کے دم سے وابستہ ھے ' شاید اسی لیے دنیا نے اپني تاریخ ادب میں اولین درجہ شعر کو دیا ھے -

آج ھم حیرت اور اُس حیرت سے اور جو کیفیتیں پیدا ھوتي ھیں اُن سے معمولي طور پر واقف ھیں ' لیکن سوسائٹي کي رسمیات اور قوت فکري کي عنان گیریوں سے اگر ایک لمحہ بھی رستگاري میسر ھو اور یہ خوبصورت اعیان و مظاھر جس حیرت اور جس جمالیاتي کیفیت کا ھم سے مطالبہ کر رھے ھیں وہ پوری طرح ھم پر طاري ھو سکے تو شاید اس وقت ھم اس لفظ کے حقیقي معنی سمجھہ سکیں ورنہ کیا معلوم کہ دنیاے حیرت میں جذبات کی گفتگو کیا ھے اور شاعري کی زبان کیا ؟ :—

محرم ایں ھوش جز بیھوش نیست

مرزباں را مُشتری چوں گوش نیست

کسی کا قول ہے کہ فلسفہ، جذبات کو منضبط اور شبہے کو رفع کرنا چاہتا ہے - لیکن شاعری اپنے جذبے اور حیرت کو وہ چند بڑھانا چاہتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ شاعری کی یہ کوششیں اگر مشکور ہوئیں تو خود اُس شاعری کی نوعیت کیا ہوگی بلکہ یہ کل کائنات اُس وقت کہاں سے کہاں پہونچی ہوئی ہوگی؟ عارف رومی نے اسے واضح کرنا چاہا مگر :—

فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

کہہ کہہ کر سکوت اختیار کیا، اصل یہ ہے کہ یہ عالم آب و گل، اور یہ زمان و مکان، شاعرانہ جذبات کے اس آشوب و غارتگری کو گوارا بھی نہیں کر سکتے، فطرت کی نظر قیام عالم اور اس کے توازن پر رہتی ہے وہ کھودیئے اور کھو جانے والی ذہنیت کا دامن پکڑ کر اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے جسے عالم فکر و ہوش کہتے ہیں - لیکن انسان کا فطری ذوق جستجو یہاں بھی معطل نہ رہ سکا، صرف اس کی کیفیت تبدیل ہوگئی یعنی اب اُس بہتے ہوئے دریاؤں میں جہازرانی کا سود و زیان، رنگ برنگ کے پھولوں میں فن باغبانی اور چمکتے ہوئے ستاروں میں فلکیات کے مسائل نظر آنے لگے، پہلی حالت میں اگر مجّرد کیفیات کی نامتناہیوں سے ذوق جستجو کو سکون و سرور حاصل ہوتا تھا تو دوسری حالت میں استدلال و تجربات کے ذریعہ حقیقتوں کو متعین کرنے سے - لیکن چونکہ انسان کی فطرت میں کم و بیش یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہیں اس لیے بعض ذہنوں پر اول الذکر کا اور بعض پر آخرالذکر کا غلبہ ہوتا ہے، سمجھنے کے لیے اول الذکر کو ذوقی و جذباتی اور آخرالذکر کو علمی و عقلی کہنا غالباً بے جا نہ ہو -

علم و عقل کے بارے میں ہم بداہتاً یہ دیکھتے ہیں کہ اُس میں عوام و خواص کی تخصیص ہے، یعنی عوام و خواص کے علم و عقل

ہیں باہم تفاوت ہے جس سے اہل علم و اہل عقل کی جماعت
وام سے بالکل ممتاز ہو جاتی ہے، اسی طرح ذوق و جذبہ گو عوام و
خواص میں مشترک ہے تا ہم اُن میں بھی تفاوت ہے جس سے صاحبان
وق کی جماعت بھی اہل علم کی طرح عوام سے ممتاز ہوتی ہے، اور
جس طرح ، علم و عقل میں کسب و اکتساب کو دخل ہے، اُسی
طرح جذبات و احساسات میں بھی رفعت و پاکیزگی پیدا کی جاسکتی
ہے -

جذبات و حسیات بے پایاں و غیر محدود ہیں اور جب وہ کسی
طرح لفظ و بیان ، عبارت و اشارت کا لباس اختیار کر لیتے ہیں تو سننے
والے اور پڑھنے والے کی صلاحیتوں میں بھی وہی جنبش پیدا ہوجاتی ہے
اور اُس کے تار حیات سے بھی وہی نغمے بلند ہونے لگتے ہیں جنھوں
نے اول اول کہنے والے کو بیتاب کردیا تھا - شاعر یا صاحب ذوق کا طرز
بیان عام طرز بیان سے مختلف ہوتا ہے ، اس کی کیفیت نفسی
اُسی لفظ اور اُسی طرز بیان کو منتخب کرتی ہے جو اُس کی غیر
محدود حقیقتوں کی متحمل ہو سکے - مجرد حقیقت عام اس سے
کہ لفظ و بیان میں کتنی ہی قوت کیوں نہ ہو مادی صورتوں کی
کی طرح متعین نہیں ہوسکتی - شاعر اس کے لیے وہ انداز
اختیار کرتا ہے جو جذبات و حسیات کی غیر محدود فضا تک
سننے والے کے ذہن کو پہونچا سکے ، اس لیے جذبات جن
مجرد حقائق تک لیجاتے ہیں ان کو لفظ و بیان میں
متمثل و متشکل کرنا شاعری ہے شاید اسی لیے تشبیہ و تمثیل
مجاز و استعارہ ، غلو و مبالغہ شعر کے ضروری عناصر قرار پائے -

بر خلاف اس کے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ منطقی استدلال
اور علمی تجربات کے ذریعہ حقیقتوں کو متعین کرے - تعین ا

اور صحیح تعین کے لیے ہمیشہ ایسے الفاظ اور ایسے طرز بیان کی ضرورت ہوتی ہے جو صاف و سادہ ہوں ' جن میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو اور سننے والے یا پڑھنے والے کا ذہن اُس شے سے ہٹ کر کسی دوسری طرف منتقل نہ ہو سکے ۔ اس لحاظ سے عام طور پر ذوقی امور یعنی شعر کے لیے نظم اور عقلیات کے لیے نثر موزوں سمجھی جاتی ہے لیکن اگر نظم و نثر کا اس نقطۂ خیال سے جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہم نظم و نثر کے کل دفتر کو صحیح صحیح طور پر "ذوقیات" و "علمیات" کے تحت میں نہیں لا سکتے ، ہمیں اکثر نظم کی شکل میں علمی و عقلی باتیں ملیں گی اور نثر میں ذوقیات و وجدانیات کے کرشمے نظر آئیںگے ۔ شاید ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا ، اس لیے کہ عقلی و جذباتی تو دو ذہنی حالتیں ہیں جو بنائی نہیں جاتیں بلکہ ہوتی ہیں اور ہر چند کہ وہ کم و بیش سب میں موجود ہیں مگر اُن پر وہ قدرت حاصل نہیں ہوتی جو نظم و نثر کی ہیئت ظاہری کی ترتیب پر ہوا کرتی ہے اِس لیے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تاثر کے ساتھ جذبات کو متمثل و متشکل کرنا شاعری ہے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس نظم میں جذبات ؟ کہ وہی جذبات کی برانگیختگی کا ذریعہ و سامان بھی ہیں ' نہ شامل ہوں اُسے شعر کہنا ہرگز درست نہ ہوگا ۔ کیا یہ شعر ' شعر کہا جا سکتا ہے ؟ :—

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے

عشق بے حد ہے خودی محدود ہے

یہ شعر ممکن ہے ہمارے ذہن کو کسی واقعے یا صداقت تک پہونچا تا ہو مگر اس سے ہمارے جذبات و حسیات میں کوئی تموّج و تلاطم نہیں ہوتا ' ممکن ہے یہ ایک بلند صداقت ہو لیکن

شعر نہیں ' اس سے ہمیں ایک اعلیٰ درجے کی بات معلوم ہوتی ہے مگر ہم پر کسی قسم کی کیفیت ہرگز طاری نہیں ہوتی - عشق اور بے خودی کی حکیمانہ تحلیل ' عشق اور بے خودی کی لذتوں سے بہرہ یاب نہیں بنا سکتی بلکہ صرف معقولات و معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے جو یقیناً نثر سے بھی بہ آسانی ممکن ہے - لیکن عشق و بیخودی سے متکیف ہو کر جو شعر کہا جاتا ہے اُس میں حکیمانہ نکتہ سلجھیوں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی صرف اُس تاثر کی ترجمانی کافی ہوتی ہے مثلاً :—

چشم من نگاهے کرد لعل او حدیثے گفت

هوش مست و بیخود شد بیخودی به هوش آمد

یہ کہنا مقصود نہیں کہ شعر کا ایک ذوقی چیز ہونا شاعر کو معلوم نہ تھا بلکہ عرض یہ کرنا ہے کہ شاید اِس خیال سے کہ نظم میں قدرتی طور پر ترنّم و موسیقت ہے اور وہ طبعاً لوگوں کو مرغوب ہوتی ہے اِس لیے معقولات و معلومات کو بھی کبھی کبھی نظم کر دیا جاتا ہے تا کہ زبان زد عام ہو کر کافی طور پر مفید ثابت ہو سکیں - بہر صورت اِس طریق کار میں کتنی ہی بڑی مصلحت بھلی کیوں نہ ہو ' لیکن منصفانہ تنقید اُنہیں شعر کا خطاب کسی طرح نہیں دے سکتی اِسی طرح مولانا حالی مرحوم کی بھی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کی افادیت سے قطعاً اِنکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اُنہیں شعر کہنا ، یکسر شعر کی توہین ہوگی ، لیکن اب ایک نثر ملاحظہ ہو :—

" آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی اور
خواہش اور ولولوں کی شبنم سے خارستان ہستی کا
ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا - اپنی

طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو
پایا ـ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اِس صبح
فریب کے لیے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے نہ نا اُمیدی
و ناکامی کی شام، یہ سارا شہرستان اُمید اور
نگارخانہ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل
کی کامجوئیوں کے لیے بنایا گیا ہے اور گویا گوشہ
گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لیے چشم
براہ جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی ـ
معلوم نہیں اپنی ہی گنبد غفلت اور ہنگامۂ ہوس
کی گونج تھی، یا نو گرفتاران عالم شباب کی
ہوش ربائیوں کے لیے خود ساز ہستی کا نوائے فریب ہی
یہی ہے ـ (تذکرہ ۱۹۲۲) ـ

مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر ایک خاص حیثیت رکھتی ہے
اُس کو مثال میں پیش کرنا غالباً عام طور پر صحیح نہ سمجھا
جائے مگر علامۂ شبلی ایسے زبردست ادیب کو لیجئے جس کی جامعیت
اور جس کی صحت ذوق یقیناً مُسلَّم ہے، سیرۃالنبی میں "ظہور
قدسی" کے عنوان سے لکھتے ہیں :—

"چمنستان دہر میں بارہا بہاریں آ چکی ہیں چرخ نادرۂ
کار نے کبھی کبھی بزم عالم اِس سر و سامان سے سجائی
ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہگئی ہیں" ـ

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال
دہر نے کروڑوں برس صرف کردیے ؟ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں
ازل سے چشم براہ تھے چرخ کُہن مدت ہائے دراز سے اِسی صبح
جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا کارگنان

قضا و قدر کی بزم آرائیاں ، عناصر کي جدت طرازیاں ، ماہ و خورشید کي فروغ انگیزیاں ، ابر و باد کی تر دستیاں ، عالم قدس کے انفاس پاک ، توحید ابراهیم جمال یوسف ، معجز طرازیِ موسیٰ ، جاں نوازي مسیح ، سب اِسي لیے تھے کہ یہ متاع ھاے گراں ارز شہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئینگے......توحید کا غلغلہ اُٹھا ، چمنستان سعادت میں بہار آ گئي ، آفتاب ہدایت کي شعاعیں هر طرف پھیل گئیں - اخلاق انسان کا آئینہ پرتَوِ قدس سے چمک اُٹھا -

(سیرةالنبي جلد ۱ ، صفحہ ۱۲۳) -

اگر شعریت کي تعریف وهي هے کہ کہنے والے نے جوش و جذبات سے متاثر هو کر لکھا هو اور اُس کا اثر بھي پڑھنے والے کے جوش و جذبات کو برانگیختہ کردے تو کیا یہ دونوں عبارتیں اُس کي صحیح صحیح مصداق نہیں هیں ؟ -

خود علامۂ شبلي مرحوم شعر کا نمایاں وصف "جذبات انساني کا برانگیختہ کرنا بتاتے هیں یعني اُس کو سن کر دل میں رنج یا خوشي یا جوش کا اثر پیدا هو ، اور یهي خصوصیت هے جو شاعري کو علوم و فنون سے ممتاز بناتي هے - اُن کے نزدیک شعر کا تخاطب جذبات سے هے اور علوم کا عقل سے ، علوم استدلال سے کام لیتے هیں اور شاعري محرکات سے ، اسي طرح ڈراما اور افسانے کے وہ حصے جن میں جذبات کو مشتعل کیا گیا هو شعر میں داخل هیں"* -

اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا غالباً بیجا نہ هو کہ بعضوں کے نزدیک شاعري اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں هیں ، ان کے نزدیک شاعر کا تخاطب خود اپنے نفس سے هوتا هے لیکن خطیب یا مقرر کے لیے یہ ضروري هے کہ وہ دوسروں کے احساسات

---

* شعرالعجم جلد چهارم صفحہ ۳ -

و جذبات پر نظر رکھتا ہو؟ شاعر کے لیے اگر یہ صحیح ہے کہ پہلے وہ خود متاثر ہوتا ہے اس کے بعد دوسرے اس سے متاثر ہو جاتے ہیں؟ تو ایک حقیقی واعظ و خطیب کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہو اس سے خود بھی متاثر ہو ورنہ اُس کا تمام بیان ایک نغمۂ بے آہنگ اور ایک جسد بے روح بن کر رہ جائے گا؟ امام ابو بکر شبلی نے حضرت جنید بغدادی سے فرمایا کہ *"رازے کہ ما پس پردہ میگفتم تو در بازار آشکارا کردی و بر منبر گفتی؟" "گفت کہ اے امام وقت خود میگویم و خود می شنوم کہ هل فی الدارین غیری" - یہ ہے ایک خطیب کی صحیح نفسیت جس کا اظہار خود ایک خطیب ہی کی زبان سے اس طرح ہوا ہے؟ لیکن جو خطیب یا واعظ آج کل ہمارے سامنے ہیں اگر وہ صرف دوسروں ہی کے چشم و ابرو کو دیکھتے رہتے ہیں تو اس سے ایک حقیقی خطیب کی علامتوں پر کوئی حرف نہیں آتا آج ہمارے شعرا؟ بھی اگر بزم سخن کی رونق بڑھانے اور لوگوں کی واہ وا کے لیے مذاق عوام کی پیروی کرتے ہیں اور حقیقی زندگی کے تقاضوں کے خلاف شاعری کو ردیف و قافیے کی بازیگری اور مشق و مزاولت کا ایک کرتب بنائے ہوئے ہیں؟ تو اس سے شعر و شاعر کی اصلی تعریف کسی طرح تبدیل نہیں ہو سکتی؟ اردو میں خطابت کی اعلیٰ ترین مثال موجودہ مذاق کے موافق مولوی ابوالکلام آزاد کے یہاں جس قدر ملتی ہے اتنی شاید ہی کسی اور کے یہاں ہو؟ ذیل کی سطروں کو ملاحظہ فرمایئے کس قدر خطیبانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں -

---

* وہ راز جسے میں نے چھپا کر تم کو بتایا تھا تم نے اس کو بازار میں مشہور کردیا اور منبر پر اس کا اعلان کردیا - جواب دیا کہ اے امام وقت خود ہی کہتا ہوں اور خود ہی سنتا ہوں کیا دونوں جہان میں میرے سوا کوئی اور بھی ہے؟ -

"افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند
نہیں کرتے ؟ تم نمائش کے پجاری ، شور و ھنگامے کے بلند
اور وقتی جذبات و انفجار هیجان کی مخلوق ھو ؟ تم میں
نہ امتیاز ھے نہ نظر ؟ نہ تم جانتے ھو نہ پہچانتے ھو
تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ھو اتنی ھی تیزی کے ساتھہ
بھی کر جاتے ھو ؟ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ھے
تمہاری ارادت جتنی سستی ؟ اتنا ھی تمہارا انحراف آس
ھے اور اُسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ار
پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت ھے
تمہاری توھین کا کوئی وزن ؟ نہ تمہارے پاس د
ھے نہ دل ؟ وساوس ھیں جن کو تم افکار سمجھتے
خطرات ھیں جن کو تم عزائم کہتے ھو ؟ خدا را بتلاؤ
تمہارے ساتھہ کیا کروں ؟ بہت کم روحیں ایسی نک
جن کو حقیقت کا فہم ھو ؟ بہت کم دل ایسے ملے
طلب و عشق سے معمور ھوں ؟ تمہاری بھیڑوں اور غ
میں سچی جستجو کا چہرہ اُسی طرح مفقود ھے
کہ ھمیشہ سے مفقود رھا ھے - اب تک حقیقت شن
کی کوئی گہرائی تم میں نظر نہیں آئی - تم
بلاتے ھو کہ استقبال سے بھرے ھوے ریلوے اسٹیشن
اُتارو اور ایسے پُر جوش اِنسانوں کے نعرے سناؤ ج
ھاتھوں میں فتحمند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ھو
پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے
کہ اُن کے هجوم میں دو چار آدمیوں کا خو
جائے مگر آہ ! میں تمہاری اِن بھیڑوں کو لیکر

کروں جب تمہارے دلوں میں سنّاٹا چھایا ہوا ہے اور
تمہارے اِس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب
تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے سُر جھائی ہوئی ہیں ؟
افسوس ! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو ؟
تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو ؟ میں سچ سچ
کہتا ہوں کہ تمہارے اِس پورے ملک میں ایک بے یار و
آشنا غریب‌الوطن ہوں :—

من بهر جمعیتے نالاں شدم
جُفت خوشحالاں و بد حالاں شدم
هر کسے از ظن خود شد یار من
وز دروں من نه جُست اسرار من

تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے مگر منتظر
رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں؟ لیکن
میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھہ لینے کا خوگر ہوں
اور صرف بادلوں هي کو دیکھه لینا میرے علم کے لیے کافی ہے ۔ ‘‘

ان مثالوں سے یہ بھي اندازہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ ان میں کشش و جاذبیت ہوتي ہے اس لیے قدرتي طور پر لوگوں کو خواہش ہوتي ہے کہ وہ بھي اپني تحریروں کو ایسي ہي دلکش اور جاذب نظر بنائیں - حالانکہ جذب و کشش کي علت اصلي لکھنے والے کي قلبي و ذهني کیفیت ہے ۔ اِسے لفظ و بیان کے عرض و سطح پر تلاش کرنا فضول ہے ، لیمپ کي روشني اس کي لو سے ہے ، اور بجھے ہوئے لیمپ پر فاسفورس ملنا دوسري چیز ہے - جس طرح نظم میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ شعر کي دلکشي کو دیکھه کر وہ لوگ جن کا ذهن یکسر شعریت سے خالی اور نا آشنا ہوتا ہے وہ بھي کسي کے اچھے

شعر سے الفاظ و تراکیب لے کر کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ' یا حسرت و بیکسی ' فنا و بقا' یا اور اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس ظاہری ٹیپ ٹاپ سے ان کا شعر بھی شعر ہو جائیگا حالانکہ اعلیٰ قسم کی شاعری کے لیے ایک مخصوص زندگی ایک مخصوص طرز تخیّل اور ایک مخصوص اُفتاد نظر کی ضرورت ہے جس سے شاعر کی انفرادیت و شخصیت ظہار ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح نثر میں بھی بعضوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ مشکل الفاظ ' پیچیدہ تراکیب اور شاعرانہ طرز بیان سے ان کی عبارتوں میں وزن پیدا ہو جائیگا ' عوام اور نا واقف لوگوں کا ذکر نہیں ' لیکن جو لوگ صحیح ذوق اور صحیح نظر رکھتے ہیں وہ اس طرح کی نثر کو بھی اُتنا ہی نا پسند کرتے ہیں جتنا اُس مصنوعی نظم و شعر کو -

کسی چیز یا کسی واقع کی علمی توضیح و تشریح کے معنی یہ ہیں کہ بغیر کسی جذبے کی آمیزش کے اُسے پیش کیا جائے ' لیکن اگر اس کے بیان میں کسی قسم کا شاعرانہ رنگ روغن استعمال کیا جاتا ہے تو یہ ایک قسم کی ادبی فریب کاری ہے جس سے ہر شایستہ و سنجیدہ شخص کو اجتناب کرنا چاہیے - مثلاً ایک مضمون جس میں اجنتا کے بتوں کا تذکرہ ہے ' عبارت کا یہ طرز اختیار کیا گیا ہے :—

"بودھوں کی یادگار فن کا حصۂ کثیر اجنتا کا سرمایہ ہے" جو عظمت و حکمت کے زیور سے سرتاپا مرصع ہے ' جذبات کی نمائندگی ، پاکبازی وسادگی اس صنعت رنگیں کے وہ زریں اوصاف ہیں جن کی بدولت پیکران حسن آفریں چشم نظارہ باز کو ایک ہی جلوے میں مسحور کرلیتے ہیں........صانع کی شوخی تحریر کے فریادی

نقوش کا ہر عضو بدن بخوبی نمایاں ہے ، اس سے
ان کا حسن کمر بیرور بے نقاب ہوکر اور دوبالا ہو گیا
ہے.........تلاش و تصنع کو ذرہ بھر بھی دخل نہونے
کے باعث مصور کا قلمزار اوردہ نی دلبازیوں کا شرمندہ
احسان ؟ نہیں - وغیرہ وغیرہ "-

خط کشیدہ لفظوں اور فقروں سے بہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیان کو وزنی اور رنگین بنانے کے لیے شاعری سے مستعار لئے گئے ہیں ، حالانکہ ان کا وزنی اور رنگین ہونا سرے سے غیر ضروری تھا بلکہ ان کا صاف اور سادہ ہونا ہی اُن کا اصلی حُسن تھا -

حقیقت یہ ہے کہ نظم و نثر یا بہ الفاظ دیگر شاعرانہ و علمی بیان کو باہم اُتنا ہی مختلف ہونا چاہیے جتنا ان دونوں کے اصل سر چشمے (یعنی جذبہ و عقل) مختلف ہیں ' یہ ذہن کی مستقل دو جداگانہ حالتیں ہیں اور دونوں کے حُسن بھی مختلف ' جوحُسن عقلیات ' کے نقطۂ نظر سے حسن ہے یہ ضروری نہیں کہ جذبات کے نقطۂ نظر سے بھی حُسن ہو ' ایک کی کمی کو دوسرے سے پورا کرنا ، کمی پورا کرنا نہیں ہے بلکہ اُس میں ابتذال اور بھدا پن پیدا کر دینا ہے ؟ عطر اور قورمہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں لیکن قورمے میں عطر ملا دینا اور عطر میں تھوڑا سا شوربہ ٹپکا دینا در اصل دونوں کو غارت کر دینا ہے -

میرے اس بیان کی غرض یہ ہے کہ نظم و نثر کی ہیئت ظاہری یعنی ان کی عبارتوں پر اس طرح کا عمل زیبائش نہ صرف کیا جائے لیکن لکھنے والے کے ذہن میں اگر عقل اور جذبے کا خود ہی اجتماع ہو تو اس سے ہمارے ادب میں ایک خاص قسم کی کیفیت اور خوبصورتی پیدا ہو جائیگی -

اس قسم کي نثر نه تو بقول شخصے واقعات کي کهتونی کي طرح
شک هوتی هے اور نه کیفات و جذبات کي شدت سے همیں کسی
سرے عالم میں پهونچا دیتي هے ' اس کے پڑھنے سے همیں لطف
ي آتا هے اور ایک گونه واقعات و معلومات کي اطلاع بهي هوتی هے -
ں کا ایک نمونه یہاں پیش کیا جاتا هے :—

"یهي بلاغت تهي جس نے کسي زمانے میں حیدرآباد دکن کے بسمارک کو نذیر احمد کا شیدائي بنا رکها تها ، سر سالار جنگ اول استیٹ ڈنر پر هیں ، طلائي قابوں کا دور چل رها هے - چهري کانٹوں کي دهیمي موسیقي میں دفعتاً سرکاري ڈاک کے آنے کي اطلاع هوتی هے ، ارشاد هوتا هے که نذیر احمد کي کوئي مراسلت هو تو فوراً پیش کی جائے - ایک ملت کے بعد جلیل‌القدر میزبان شام کے هاتهه میں ایک کاغذ هوتا هے برقی روشني کي جگمگاهٹ میں شایق‌الادب امیرالامرا کي نگاہ نقوش حرفي پر دوڑ رهی هے اور چهرے پر وہ کیفیت طاري هوتي هے جسے تبسم زیر لب کی هلکی لهریں کهئے ، نذیراحمد کے خوان ادب کا یه لقمهٔ تر تها جس سے شاهی میز بهی بے نیاز نه رہ سکي لیکن اب یه همارے گلے میں پهسلنے لگا هے جسے هم اگلنا چاهتے هیں مگر یه بے نمکی روایات سابقه کے لحاظ سے کچهه ٹهیک نهیں معلوم هوتی -"

(مهدي حسن افادي‌الاقتصادي)

ادب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سوسائٹی کو اس سے مسرّت حاصل ہو، جس نثر میں علم و فن کے اعتبار سے کوئی بڑا افادی پہلو نہ ہو لیکن اسے پڑھ کر اگر صاحبانِ علم و فن ایک لمحہ کے لیے غم غلط کرسکیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایک بہترین فرض پوری ہو گئی۔ اس طرح کی نثر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ لغت و قواعد پر بہت زیادہ عبور حاصل ہو بلکہ ضرورت ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں عقل کے ساتھ ایک خاص قسم کی شگفتگی اور لطافت بھی ہو۔ مثال میں یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:—

''خشک اور سنجیدہ فلسفے سے شکایت تو صرف یہ ہے کہ وہ کائنات کو اس کی شاعری سے محروم کر دینا چاہتا ہے اور اس فاتحانہ انداز سے کہ گویا اُس نے کائنات کا سارا طلسم توڑ دیا، شاعر بھی رموز حقیقت کا انکشاف چاہتا ہے لیکن اُسی حسن ادا کے ساتھ کہ حُسنِ راز جس کا مقتضی ہے مگر فلسفی ہر حسن کو نا قابل توجہ سمجھتا ہے، شاید وہ یہ نہیں جانتا کہ شاعری کی طرح فلسفہ بھی ایک دھوکا ہے، فرق صرف اِس قدر ہے کہ شاعری لطیف ترین دھوکا ہے اور فلسفہ نہایت خشک اور غیر دلچسپ۔''

(سجاد انصاری مرحوم)

اس شگفتگی میں ہلکا ہلکا طنز بھی ہے، لیکن طنز، شگفتگی اور رنگین خیالی کا باہمی امتزاج بھی ملاحظہ ہو:—

''مجھے حیرت تو مغرب کی رکاکت مذاق اور

کثافت تخیّل پر ہے ؛ انہیں انبساط و مسرّت اس تصوّر سے
نہ ہوئی کہ اُن کے اجسام خاکی کی پرورش فردوس بریں کی
اُس فضائے کی ہے جس کی دلفریبیاں آج بھی انسان کو
حریص و طامع بنائے ہوئے ہیں ؛ دنیا باوجود اپنی تمام
بہشت آفرینیوں کے اس فضا کے ایک ذرّے کی بھی
قیمت نہیں رکھتی ؛ مغربی دل و دماغ کو اگر تسکین
ہوتی ہے تو اس نتیجے سے کہ انسان حقیقۃً ہیولیٔ
ارتقائی ہے جس کی پرورش کنار فردوس میں نہیں بلکہ
آغوش میمونی میں ہوئی تھی - حقیقت انسانی
اُسے مضطرب کر رہی تھی ؛ حقیقت میمونی نے اسے
مطمئن کر دیا - اس سے بحث نہیں کہ نظریۂ ارتقا
صحیح ہے یا غلط ؛ تخیلات و توہمات کبھی صحیح یا
غلط نہیں ہوا کرتے ان کے لیے صرف لطافت و کثافت
کا امتیاز ممکن ہے -" (سجاد انصاری مرحوم)

اصل یہ ہے کہ ایک بات کے کہنے کے بیشمار طریقے ہیں ؛ یہی مختلف طریقے جن سے بیان کی حیثیت و نوعیت تبدیل ہوتی ہے لکھنے والے کی شاعری یا نثر نگاری کا درجہ متعین کرتے ہیں ؛ جب کوئی شخص کچھہ لکھنا یا بیان کرنا چاہتا ہے تو اپنی ذہنی اور نفسی کیفیتوں کے ساتھہ اُسے پیش کرتا ہے اور اس طرح اُس بات یا واقعہ کی حالت میں اپنے بیان سے کچھہ اضافہ کر دیتا ہے ؛ اس کی یہ ذہنی و نفسی کیفیت اس کی انفرادیت و شخصیت ہے اور اس اضافے کا عام طریق عمل اُس کا "طرز" کہلاتا ہے ؛ خلاصہ یہ کہ علمی و عقلی نثر جس میں کیفیت نفسی کم یا بالکل کار فرما نہ ہو وہ بیان محض اور نفس‌الامری تخیل کی زبان ہے اور شاعری کیفیات و جذبات کی ؛

نثر جس قدر کیفیات و جذبات سے قریب تر ہوتی جائے گی اسی قدر شعریت میں تبدیل ہوتی جائے گی اسی طرح نظم جس قدر نفس الامری تخیل اور بیان محض بنتی جائے گی اسی قدر شعریت سے محروم ہوتی جائے گی - مثلاً ایک شوخ و حسین نوجوان کھڑا مسکرا رہا ہے - بغیر کسی جذبے اور کیفیت کے اثر اس واقعے کو دیکھا جائے تو سب اس واقعے کو اسی سادہ طور سے بیان کر دینگے مگر جذبے کی زبان ہی کچھ اور ہے وہ کیفیت نفسی کے زور سے منظر کی حالت ہی تبدیل کیے دیتی ہے اور اسے اس طرح ایک طرفہ ہنگامہ بنا دیتی ہے :—

ہے سراپا حسن وہ رنگیں ادا جانِ بہار
حُسن پر حُسنِ تبسم صبحِ خندانِ بہار

یا بہار کے موسم میں قوت نامیہ کے فیض سے سبزہ و گل پر جوش اور لہلہاہٹ سی ہے مگر اس کا شدید تاثر واقعے اور منظر میں اس طرح روح پھونک دیتا ہے -

سبزہ و گل لہلہاتے ہیں نمو کا زور ہے
موج رنگا رنگ ہے یا جوشِ طوفانِ بہار

انفرادیت و شخصیت یا کیفیت نفسی کا شدید ہونا ہر انسان کا حصہ نہیں - عام آدمی زیادہ تر دوسری شخصیتوں کی آواز بازگشت ہوتے ہیں - اسی لیے نظم و نثر کا مخصوص طرز ایک زبردست انفرادیت و شخصیت کی علامت ہے - صاحبان طرز کے بیان سے یہ معلوم ہو گا کہ جو بات معہ تاثیر یا اپنی کیفیت نفسی کے انہوں نے پیش کی ہے اس کے لیے وہ طریقۂ بیان قطعی ناگزیر تھا فرض کہ اس طرح کا بیان اگر اوزان اور قوافی کے حدود میں ہو تو اُسے شعر منظوم کہینگے اور اگر ان پابندیوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو اُس بیان پر شعر منثور ، خطابت اور ادبی نثر وغیرہ کا اطلاق ہوگا -

شاعر کے بارے میں بعضوں کا قول ھے کہ قوم میں اس کي حیثیت مثل ایک بچے کے ھے ' بچہ جس عالم میں ھوتا ھے کون اس کا اندازہ کر سکتا ھے ؟ - وہ چاند کي شعاؤں کو گھنٹوں دیکھتا رھتا ھے اور خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ھے ، ایک زرا سي تتلي کے اُڑ جانے سے وہ گھنٹوں روتا ھے ، اور ایک معمولی سے رنگین کھلونے کو پا کر من جاتا ھے اور ھنسنے لگتا ھے ' اس طرح ھمہ تن وہ ایک کیفیت محض اور ایک جذبۂ بے اختیار ھوتا ھے ، اور اسی لیے اِتنی قوت رکھتا ھے کہ بڑے سے بڑے صاحب عقل کو مسحور کر لیتا ھے ' صاحب عقل یہ سمجھتا ھے کہ وہ بچے کو کھلا رھا ھے حالانکہ بچہ اپنی استعداد کي مخفی قوتوں سے خود اُسے کھلاتا ھے اور اپني ناز برداریوں کے لیے اُسے مجنونانہ حرکات کے لیے مجبور کر دیتا ھے ، ٹھیک اسي طرح شاعر بھي اُس مقام پر ھوتا ھے جہاں فکر و ھوش اور علم و عمل کي مخلوق کی رسائي نہیں ، اُس بلندي ، سے اس کي آواز میں یقین' جوش اور وجدان کي وہ کیفیتیں ھوتي ھیں جن سے ھم متاثر تو ھوتے ھیں مگر مجال دم زدن نہیں رکھتے' اس کي باتیں سن کر ھمارے جذبات میں ایک ھیجان و تلاطم تو پیدا ھو جاتا ھے مگر ایک برابر والے انسان کي طرح اُس سے ردو قدح نہیں کر سکتے ، شاعر ، مستعار کائنات کا قائل نہیں وہ رسمیات کے پردے کو چاک کر کے زمین و آسمان کا نظارہ کرنا چاھتا ھے -

وہ اگر مجازین و مجاذیب کی صف میں نہیں پہونچ گیا ھے - اور اپنے مذاق میں شایستگي و پاکیزگی رکھتا ھے تو وہ اپنا طریق کار بھی خود ھي بہتر جانتا ھے ، مذاق کي شایستگي و پاکیزگي میں نے اس لیے کہا کہ خارجی قواعد و ضوابط معلوم کرنے پر بھي اصلي دلیل راہ اس کي یھي چیز ھے -

برخلاف اس کے ایک نثر نگار (یعنی علمی وعقلی تحریر لکھنے والا شخص) ہماری ہی معمولی سطح پر ہماری ہی نوع کا ایک آدمی ہوتا ہے، اس کی گفتگو آپس کی گفتگو ہوتی ہے، وہ نہ ہم پر اپنے جوش ملکوتیت کا دباؤ ڈال سکتا ہے اور نہ اپنے روحانی ملہمات سے ہمیں مرعوب کر سکتا ہے اس کی دنیا وہی دنیا ہے جو لوگوں کے اور اپنے تجربات سے بنی ہوئی ہے "منظوم بکواس" نہیں بلکہ صحیح معنوں میں شعر اگر کسی اور عالم کی آواز ہے تو نثر یعنی علمی و عقلی تحریر از سرتاپا سوسائیٹی کی باہمی گفتگو اور ایک معمولی تبادلۂ خیال ہے، گفتگو کو خواہ وہ فلسفی ہی اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو گفتگو ہی رہنا چاہیے، یہ نہیں کہ وہ چیخ بن جائے یا موسیقی کا رنگ اختیار کرلے -

شعر کی مخصوص بنیادی خوبی اگر "محبت" کہی جاتی ہے تو نثر اور علمی و عقلی نثر کی عمدگی اس کے "انصاف" پر منحصر ہے، محبت اگر والہانہ و بے اختیارانہ اظہار چاہتی ہے تو انصاف کا تقاضا احتیاط اور صبر و استقلال ہے، "انصاف" کسی خاص شخص یا کسی خاص واقعے کے متعلق نہیں بلکہ اس سے مراد عام "عادت انصاف" سے ہے جو ہر تخیل اور ہر بیان سے متعلق ہو - علمی و تحقیقی بیان کے لیے نثر نگار کا ذہن غیر مطمئن مگر اسی کے ساتھ غیر عاجل بھی ہوتا ہے، وہ اپنے تخیل اور طرز بیان کے اُن تمام محاسن اور خوشنمائیوں سے بچتا ہوا چلتا ہے جو اصل موضوع سے متعلق نہیں ہوتے، اور اس طرح اُس کے تکملے کے بعد اپنی خود ایک خوشنمائی اور خوبصورتی طیار کر لیتا ہے -

ایک عمدہ علمی نثر کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں ہم لکھنے والے کی تحسین و ستائش میں مبتلا نہیں ہوتے

نہ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں کوئی خاص سوال پیدا ہوتا
، بیان کی اہمیت ، اس کی سنجیدگی اور اس کی خوبیء ترتیب
ماری توجہ کو اس درجہ مصروف رکھتی ہے کہ ہمیں ان امور کی
رصت ہی نہیں ملتی ، اس طرح کا ایک نمونۂ نثر ملاحظہ ہو :—

"یہ حروف جو ہر ملک کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں ، اُس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آوازیں آب و ہوا وغیرہ کے وجوہ سے اُن لوگوں کے گلے سے بہ آسانی نکلتی ہیں ، مگر دوسرے ممالک کے لوگ انہیں وجوہ سے اُن کو ادا نہیں کر سکتے ، یا بدقت ادا کرتے ہیں - اِنسان کا گلا آلۂ موسیقی کے اُصول پر بنا ہے اور اسی طور سے اُس میں تار بھی بندھے ہوئے ہیں ، سانس کے ہوا میں ملنے سے زبان ، تالو ، ہونٹ ، دانت اور خلاے دھن کی مدد سے اواز میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں -

اُردو ، فارسی ، عربی حروف پر اگر نظر ڈالی جائے تو گویا وہ دیکھنے میں مختلف آوازوں کی علامات ہیں - لیکن در حقیقت اِن حروف کے نام سے کوئی سادہ آواز پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ خاصے الفاظ ہیں مثلاً الف ، عین ، جیم وغیرہ وغیرہ حروف نہیں بلکہ پورے الفاظ ہیں چہ جائے کہ اُن سے سادہ آوازوں کا کچھہ بھی خیال پیدا ہوتا ہو - اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اُس زمانے کی یادگار ہیں جب کہ اِس قسم کی تحریر ایجاد نہیں ہوئی تھی بلکہ لوگ اپنے خیالات تصویر میں بنا بنا کر ظاہر کیا کرتے تھے - اول اول تو جس شے کا بیان

کرنا مقصود ہوتا تھا ، اس کی تصویر بنا دیتے تھے - مثلاً گائے یا عورت کا بتانا مقصود ہے تو گائے یا عورت کی تصویر کھینچ دیتے تھے - دوسرے دور میں یہ اصلاح ہوئی کہ شے سے اُس کا فعل ظاہر کرنے لگے مثلاً آنکھ سے نظر یا دو ٹانگوں سے رفتار مراد لینے لگے ، تیسرے دور میں یہ ہوا کہ شے سے اِس کے ممتاز خصایص یا ظاہری علامت سے اصل شے مراد لیجانے لگی مثلاً لومڑی کی تصــویر سے مکّاری ، یا تخت سے سلطنت مقصود ہوتی تھی - چوتھے دور میں ایک شے کے اظہار میں یہ ترکیب کرنے لگے کہ اُس شے کے بولنے میں جو آوازیں پیدا ہوتی تھیں اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک تصویر بناتے تھے - "

(مولوی عبدالحق بی - اے)

فرض کہ انسانی ذہن کی حقیقت تک رسائی ، جذبے اور عقل ہی کے دم سے وابستہ ہے ، کلام یعنی نظم و نثر کی عمدگی کا مفہوم یہ ہے کہ لکھنے والے کے ذہن کے سامنے جو حقیقت آئی ہے وہ اپنے لفظ و بیان سے اُس کی صحیح صحیح ہم آہنگی کر سکے ، یعنی اُس کے ذہن نے اُس حقیقت کو اگر غالب طور پر جذبے کے ذریعہ محسوس کیا ہے تو اُس کی تحریر کو نظم و شعر یا نظم و شعر سے قریب تر ہونا چاہیے ، اور اگر انکشاف حقیقت میں جذبے کا عنصر خفیف اور عقلیت کا عنصر نمایاں ہو تو اُسے اسی حیثیت کا طرز اختیار کرنا چاہیے-

اس اعتبار سے وہ تحقیق جو شدید جذبات و احساسات کے ساتھ کی جاتی ہے اُس کا مقصود وہ موزونیت ہے جسے اُس کی اصطلاح میں حُسن کہتے ہیں لیکن جس تحقیق میں غلبۂ عقل

ہو اُس کا مقصود وہ مطابقت ہے جو منطقی استدلال سے موجودات کی ماہیت میں صرف کی جاتی ہے اور جسے حکمت کی زبان علم و صداقت کے نام سے پکارتی ہے -

لیکن ذرا غائر نظر سے دیکھیے تو "موزونیت کا اظہار" خود ایک طرح کا عمل مطابقت ہے اور "مطابقت" بھی نام ہے "حسن و موزونیت" کی تشکیل و صورتگری کا ؟ اس لحاظ سے جذبے اور عقل کا طرز جستجو اور ان کی روشیں گو باہم جداگانہ ہوں مگر دونوں ایک ہی بے پایاں حقیقت کی طرف گرم عناں ہیں :—

(اقبال)—هر دو بمنزلے رواں هر دو امیر کارواں

عقل ز حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

" هندستان " بغیر واو کے صحیح ہے

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، ایم اے ، پی - ایچ - ڈی)

[" ہندستانی " کے سرورق پر " ہندستانی " (بلا واو) اور " تماہی " کا لفظ ایڈیٹوریل بورڈ کے اعزازی ممبروں نے اس خیال سے تجویز کیا تھا کہ اکیڈیمی کے اردو اور ہندی رسالوں میں جس حد تک ممکن ہو باہم یکسانیت پیدا ہو سکے۔ بعض لوگوں نے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا اور تعریض و تنقیص کا سلسلہ شروع ہو گیا -

ہمارے ادارہ کے معزز ممبر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم - اے پی - ایچ - ڈی کے اس مقالے سے معلوم ہوگا کہ " ہندستانی " (بلا واو) فارسی میں جائز ہے ' اور جب بولنے میں " ہندستانی " کی ہیئت صوتی صاف صاف بلا واو کے معلوم ہوتی ہے اور ہندی میں بھی اس کا تلفظ ایسا ہی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اردو اور ہندی میں اسے ایک طرح کیوں نہ لکھا جاوے -

" تماہی " کے بارے میں بھی ہمارے معزز کرمفرما نے ایک علحدہ مضمون مرحمت فرمانے کا وعدہ کیا ہے جسے ناظرین آیندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائینگے - مرتب]

" ہندستان " یا " ہندستانی " کے بلا واو لکھنے پر بعض صاحبوں کو اعتراض ہے - اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اردو بولنے والے عام طور پر اس لفظ کا تلفظ محض پیش کے ساتھ کرتے ہیں اور فُصحا کی زبان پر بھی " ہندستان " اور " ہندستانی " ہے ، گو کہ " ہندوستان " اور " ہندوستانی " بھی غلط نہیں - اس لیے " ہندستان " اور " ہندستانی " صحیح ہے ' اور " ہندوستان " اور " ہندُوستانی " بھی -

شاید کچھ لوگوں کو اس جواب سے اس وجہ سے تشفی نہ ہو کہ اُن کے خیال کے مطابق فارسی میں " ہندوستان " ہی ممکن ہے ، ہندیوں نے بیجا تصرّف کر کے " ہندستان " بولنا شروع

کر دیا - دیکھنا یہ ھے کہ کیا حقیقت میں بھي ایسا ھي ھے - اِس لیے فارسی کي طرف رجوع کرنا مناسب معلوم ھوتا ھے -

فارسي میں بہت سے لفظ ایسے ھیں کہ اُن میں ا ، و یا ي لکھتے بھي ھیں اور حذف بھي کردیتے ھیں - کچھہ لفظ ایسے ھیں کہ اُن میں و کے لکھنے کي ضرورت نہیں یا و لکھنا اُن لفظوں میں غلط ھے مگر کاتب اکثر اُن میں بھي و لکھہ دیا کرتے ھیں - کاتبوں کے اِس غلط طرز عمل کا یہ اثر ھے کہ محض طرز کتابت کي پیروي میں اردو میں بعض غلط لفظ رائج ھو گئے ھیں حالانکہ عوام کي زبان پر لفظ کا وہ تلفظ ھے جو فارسی کی رو سے صحیح ھے - اِس کي بہترین مثال " دکان " ھے کہ اُس میں واو لکھنا بھی غلط ھے اور بولنا بھي - اِس غلطي کي تکرار کتابت میں اتنی ھوئي کہ بہت سے لوگ " دکان " کو (جو صحیح ھے) عامیوں بلکہ جاھلوں کی بول چال سمجھنے لگے اور " دوکان " کا لفظ (جو قطعاً غلط ھے) اُن کی زبانوں پر بھی چل پڑا - شاعروں نے البتہ اپنے کلام میں " دکان " کو راہ دي * جیسے :—

وہ جو بیچتے تھے دواے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

متاخرین نے بھی " دکان " کہا :—

دکاں بلند کر کے رھا بیٹھہ جو

تو دي اُس نے بالکل ھي لُٹیا ڈبو (اسمعیل میرٹھي)

بعض لفظوں میں تلفظ کے لحاظ سے واو نہیں ھے ، صرف پیش کے ظاھر کرنے کو واو لکھتے ھیں اور اُسے " واو بیان ضمہ " کہتے ھیں یا

---

* فارسي شاعروں کے کلام میں اِس لفظ کي دو ھی صورتیں ملتي ھیں : " دکان " اور " دکّان " جن میں دوسری صورت معرب ھے اگر کہیں " درکان " لکھا ھوا ملتا ھے تو وہ کاتبوں کا تصرف ھے - ایسے مقامات پر " دکّان " پڑھنا چاھیے -

" واو مسروق " کہ لکھا جاتا ھے پڑھا نہیں جاتا ، جیسے خواجہ وغیرہ میں -

کچھہ لفظ ایسے ھیں جن کا تلفظ دونوں طرح صحیح ھے اور اِس لیے اُن کو کبھی واو کے ساتھہ لکھتے ھیں کبھی بغیر واو کے ، جیسے " اوستاد " ، " اُستاد " - " اوستام " ، " اُستام " - " اوفتاد " ، " اُفتاد " - " اومید " ، " اُمید " - " بوستان " " بُستان " - " روستم " ، " رُستم " * -

اِن لفظوں کی قدیم تر صورتیں وہ ھیں جن میں واو ھے اور وہ واو اصلی ھے- اِس لیے اھلِ لغت نے بلا واو کی صورتوں کو " مخفف " کہا ھے- صرف " بستان " کے متعلق یہ شبہہ ھوسکتا ھے کہ اُس میں سے واو تعریب کی بنا پر گرا ھے - مگر واقعہ یہ ھے کہ خود ایران ھی کی زبان میں اور بہت سے لفظوں کی طرح " بوستان " کا واو بھی گر گیا اور " بوستان " کے پہلو بہ پہلو ایک ھم معنی لفظ " بستان " قائم ھو گیا اور اُس سے مرکبات بھی بنے ، جیسے " بُستان افروز " ، " بُستان پیرا " ، " بستان زادہ " ، " بستان سرا " ، " بستان شیرین " (موسیقی کی ایک لے) - یہ مرکبات کچھہ نئے نہیں ھیں بلکہ پرانے ھیں اِس لیے خود " بستان " اُن سے بھی زیادہ پرانا ٹھہرتا ھے - " بستان کی مزید تخفیف ھوکر " بُست " بنا ، معنی وھی رھے جو " بوستان " اور " بستان " کے تھے - خود یہ مخفف در مخفف لفظ اِتنا پرانا ھے کہ " بُست " ایران کے ایک مقام کا نام بھی صدیوں سے چلا آتا ھے اور جب

* اِسی طرح بعضے لفظ ھیں کہ اُن میں ی بولتے اور لکھتے بھی ھیں اور نہیں بھی ، جیسے " میہمان " ، " مہمان " - " تیشہ " ، " تش " " نیشتر " ، " نشتر " وغیرہ -

سنہ ۳۰ ہجري میں مسلمان فاتحوں نے سیستان کي طرف رخ کیا تو من جملہ اور مقامات کے بُست کو بھي فتح کیا * -

اِس تفصیل سے ظاھر ھو گیا کہ خود " بست " ایک بہت پرانا لفظ ھے اور " بستان " لازماً اُس سے بھي پرانا - اِس لیے یہ ماننا قرین صحت ھوگا کہ جس زمانے میں عربوں کا تسلّط ایران میں ھوا اُس وقت دونوں صورتیں " بوستان " اور " بستان " فارسي زبان میں دوش بدوش استعمال ھوتي تھیں- یہ تمام قرائن اِسي بات کے ھیں کہ عربوں نے ایرانیوں سے " بستان " سُن کر اُسے جیوں کا تیوں اپني زبان میں لے لیا یا یوں کہیے کہ "بوستان" اور "بُستان" دونوں تلفظ سنے اور دوسرے کو اختیار کیا' اِس لیے کہ وہ عربي زبان کے موافق پڑتا تھا-

لفظوں کو متخفف کرنے کي طرف فارسی زبان اِس قدر مائل رھی ھے کہ عربي لفظوں اور ناموں تک میں اکثر تصرّف ھوا - چونکہ فارسي لفظوں سے شروع کا الف گر گیا تھا ' جیسے ابر سے بر اور اسوار سے سوار وغیرہ ' اِس لیے ابوبکر سے بوبکر ' ابوعلي سے بوعلي ھو گیا یہاں تک کہ ابو اسحاق سے بو اسحاق اور بو اسحاق سے بسحاق بن گیا - " بسحاق اطعمہ " کو کون نہیں جانتا -

یہي حال " ھندوستان " کا ھوا - پہلے " ھندستان " ھوا پھر "ھندسان" اِسي طرح " ھندو بار " سے "ھند بار" چنانچہ فارسي کے لغت نویسوں نے یوں لکھا ھے :-

(۱) "فرھنگ جہانگیری" (نولکشوري) ' جلد ۲ ' صفحہ ۱۹۰ :-

---

* دیکھو " فتوح البلدان" بلاذري ' مطبوعہ لائیدن سنہ ۱۸۶۶ ع - ص ۳۹۴ ' ۳۹۶ و ۳۹۷ -

"هندستان مخفف هندوستان است - اوستاد فرخی فرماید

گر ز جود تو نسیمی بگزرد بر زنگبار*

ور ز خشم تو سمومی در وزد بر هندستان

هندوان را آتشی سوزنده روید شاخ رحم

زنگیان را شوشهٔ زرین بر آید خیز ران"

(۲) "بہار عجم" (نولکشوري ' سنه ۱۹۱۲ع ' جلد ۲ ' صفحه ۴۹۷ :-

"هند - بالکسر و هند و بار و هند وزار و هندوستان دیار معروف - هندستان مخفف آن و آنرا سواد اعظم† نیز گویند و هندستان اغلب که در اصل هند استهان بود... . که در هندی اصلی بمعنی مدان و ماوا است و برین قیاس عربستان و فرنگستان و مانند آن - اُستاد فرخي :-

گر ز جود تو...... الخ -"

(۳) "برهان قاطع" :-

"هندسان با سین بے نقطه ' بر وزن هندوان ' مخفف هندستانست و هندستان مخفف هندوستان -"

---

* اِن دونوں شعروں کا متن یہاں "بہار عجم" کے مطابق دیا گیا ھے سوا لفظ "هندسان" کے - "جہانگیري" اور "بہار" دونوں میں "هندستان" ھے جو بحر میں نہیں سماتا ' اِس لیے درست نہیں - "جہانگیري" میں (جو بہت ھي غلط چھپي ھے) اِن شعروں کا متن بھي غلط ھے ' چنانچہ "زنگبار" کے بجاے "جویبار" "خشم" کی جگہ "رحم" ' "روید" کي جگہ "ازبد" ھے -

† نولکشوري چھاپے میں "عظیم" ھے جو صحیح نہیں - دیکھو "مصطلحات الشعراء" (وارستہ) محشي بخلاصۂ بہار عجم مطبوعہ سلطان المطابع ' لکھنؤ ' بہ تصحیح و توشیح مولوي جمیل احمد (۱۲۷۰ ھجري) ' ص ۴۰۰ (حاشیہ) -

"برهان قاطع" کي اِس تشریح سے "جہانگیري" اور "بہار" کي عبارتیں صاف ہو گئیں - اور اب پورے یقین کے ساتھہ کہا جا سکتا ہے کہ اُستاد فرخي کے شعر میں "ہندساں" ہي ہے، "ہندستان" نہیں - "ہندساں" شاعروں کے کلام میں زیادہ نہیں ملتا مگر اِس کا تو یقین ہو گیا کہ چوتھي صدي ہجري میں "ہندساں" زبان میں داخل ہوچکا تھا، اِس لیے "ہندستان" (جس کا یہ مخفف ہے) اُس سے بھي پہلے زبان میں رائج ہوگیا ہوگا -

شمس الدین محمد ابن قیس رازي نے فن عروض و قافیہ میں اپني لاجواب کتاب "المعجم في معاییر اشعارالعجم" ساتویں صدی ہجري کے اوائل میں لکھي* - اُس میں قافیے کي بحث میں ایک مقام پر لکھا ہے :-

"و بعضي ترکستان و ہندستان بہم جائز داشتہ اند همچنانک † در ہند بار و زنگبار گفتیم -" (ص ۲۱۱) -

جس عبارت کي طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے :-

"و بعضي ہند بار و زنگبار بہم روا داشتہ اند یعني ہر ایک اسم ولایتي است - و قیاس آنست کي ‡ روا نباشد همچنانک † لالہ زار و کشت زار -" (ص ۱۹۵) -

اِس سے پوري طرح ثابت ہوگیا کہ ایران کے متقدمین شعرا "ہندستان" (بلا واو) عام طور پر استعمال کرتے تھے -

---

* میرزا محمد ابن عبدالوهاب قزویني کی تصحیح سے سنہ ۱۹۰۹ ع میں لندن اور لائیدن سے شایع ہوئی -

† قدیم رسم خط ہے = "همچنانکہ -"

‡ قدیم رسم خط ہے = "کہ" -

اِن اقتباسوں کے بعد اِس کی ضرورت نہیں کہ شاعروں کے کلام سے شواھد پیش کیے جائیں مگر ایک دوست نے مجھے لکھا کہ فردوسي اور سعدي نے تو "ھندوستان" (واو کے ساتھ لکھا ھے) - ایک اور صاحب سعدی کی "بوستان" سے یہ مصرعہ نقل فرماتے ھیں :-

"بہ شوخي چو فیلی بہ ھندوستان"

فردوسي کا مصرعہ بھی یاد ھے :-

"کہ با پیل جادو بہ ھندوستان"

اِس کا جواب یہ ھے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ "ھندوستان" (مع واو) کا وجود ھی نہیں - فردوسی کے شاھنامے میں کئی ھزار شعر ھیں ' ایک مثنوی "یوسف زلیخا" بھی فردوسی کے نام سے مشہور ھے مگر بحر دونوں کی ایک ھی ھے - سعدی کی بوستان بھی اُسي بحر (متقارب) میں ھے - اِس بحر میں "ھندستان" سما ھي کب سکتا ھے ؟ لازماً "ھندوستان" باندھا گیا - غزلوں ' رباعیوں وغیرہ کا مضمون اِس نوعیت کا ھوتا ھے کہ اُن میں "ھندوستان" یا "ھندستان" کو ڈھونڈنا عبث ھے - اِس بات کو بھي نہ بھولنا چاھیے کہ جب کوئي شاعر ھمارے ملک کا نام لینا چاھتا ھے تو نظر انتخاب پہلے "ھند" پر پڑتي ھے کہ ھر بحر میں کھپ جاتا ھے - فارسي شاعروں کے ھاں نہیں کہیں خصوصاً قافیے کي ضرورت سے "ھندو زار" ' "ھند و بار" اور "ھند بار" نے جگہ پائي ھے - "ھندوستان" با وجود طویل ھونے کے بعض بحروں میں آجاتا ھے اور اکثر قافیہ پڑا ھے جیسے فردوسي اور سعدی کے شعروں میں ' جن کے مصرعے اوپر نقل ھو چکے باوجود اِس کے "ھندستان" بہت کثرت سے فارسي شاعروں کے کلام میں آیا ھے - اگر کل مثالیں اکٹھا کر کے شمار کي جائیں تو "ھندستان" ھی کا پلہ بھاري رھے گا -

تھوڑي سي مثاليں مختلف شاعروں کے کلام سے حاضر ھيں :—

۱ - ابو سعد ابن مسعود ابن سعد ابن سلمان لاھوري ، جس نے سنہ ۵۱۵ ھجري کے بعد وفات پائي ، پانچويں چھٹي صدي ھجري کے سربرآوردہ سخنوروں ميں تھا - آزاد بلگرامي نے "خزانۂ عامرہ" * ميں انتخاب اُس کے کلام کا ديا ھے پانچ ساڑھے پانچ صفحے سے زيادہ نہيں - اُس ميں بھي "ھندستان" تين جگہ آيا ھے اور "ھندوستان" کہيں نہيں ، گو کہ انتخاب ايسي بحروں ميں سے بھي ھے جن ميں "ھندوستان" کھپ جاتا ھے - وہ تينوں شعر يہ ھيں :—

(۱) دخترے خرد دارم و پسرے
با دو خواھر بہوم ھندستان - (خزانۂ عامرہ ، ص ۱۵)

(۲) خرام کرد ميان ديار ھندستان
گذشت رايت عالي ز گنبد دوار (خزانہ ، ص ۱۷)

(۳) بر شمال اے بہار ھندستان †
اے نجات از بلاے تا بستان (خزانہ ، ص ۲۰)

۲ - مولانا نظامي گنجوي کي مثنوي "شيرين و خسرو" ‡ کا قصہ ھندستان سے تعلق نہيں رکھتا پھر بھي اُس کا نام کہيں کہيں آ گيا ھے - بحر ايسي ھے جس ميں "ھندوستان" اور

---

* نولکشوري - دوسري اشاعت - سنہ ۱۹۰۰ع

† اِن تينوں شعروں ميں غلطي سے "ھندوستان" چھپا ھے - کتاب ميں چھاپے کي غلطياں بہت ھيں -

‡ اِس کا جو نسخہ ميرے سامنے ھے - وہ نہايت خوش خط ھے -- مطبع کا نام يا چھپنے کا سال کہيں درج نہيں - خط کي شان ايراني ھے - غالباً ايران ھي کا چھپا ھوا ھے کتابت کي غلطياں کہيں کہيں نظر پڑيں -

'' هندستان '' دونوں کي گنجائش هے مگر صرف ایک جگه '' هندوستان '' * اور ایک جگه '' هندوستاني '' † ملا وه بهي قافيه میں - بخلاف اِس کے '' هندستان '' چار جگه آیا هے : -

(۱) گرش باید بیک فتح الهي
ز هندستان فرو شوید سیاهي ‡ (ص ۱۳)

(۲) در آمد قاصدي از ره به تعجیل
ز هندستان حکایت کرد تاویل (ص ۹۸)

(۳) مرا چون کر کدن سهله چه خاري §
بیاد پیل هندستان چه آري (ص ۱۴۰)

(۴) به هندستان جنیبت مي دواندي
غلط شد ره ، ببابل باز ماندي (ص ۲۰۲)

۳ - حضرت امیر خسرو کي مثنوي '' دول راني خضر خان '' || بهي هزج میں هے جس میں لفظ کي دونوں صورتیں آ سکتي هیں - سر سري نظر سے دیکهی - '' هندوستان '' تو چار هي پانچ جگه نظر پڑا ، اُس میں سے بهي ایک جگه '' دوستان '' کا قافیه واقع هوا هے -

---

* سیاهي توتیاے چشم از آنست - که فراش ره هندوستانست -- (ص ۲۳۷)

† مجوسي ملتي هندوستاني - چو زر دشت آمده در زند خواني -- (ص ۶۲)

‡ صفحه ۱۷ پر پهر یهي شعر خفیف تغیر کے ساتهه آیا هے صرف دوسرے مصرع میں فرق هے :—

فرو شوید ز هندستان سیاهي --

§ کتاب میں '' خواری '' هے جو درست نهیں -- یهه کاتبوں کي عام غلطي هے جیسے '' برخاستن '' (اُٹهه کهڑا هونا) کے لیے اکثر '' بر خواستن '' لکهه مارتے هیں -

|| مولانا رشید احمد انصاري صاحب سالم مرحوم کي تصحیح و ترتیب سے سنه ۱۹۱۷م میں علي گڑه سے شایع هوئي -

'' هندستان '' نو جگه پایا اور کہیں قافیے میں نہیں - ملاحظه هو :--

(۱) کسی کز گنگ هندستان بود دور
ز نیل و دجله لافد ' هست معذور (متن ' ص ۴۳)

(۲) دوال رانی که هست اندر زمانه
زطاؤسان هندستان یگانه (متن ' ص ۴۴)

(۳) از آن سلطان غازی بے مدارا
که هندستان شد اسلام آشکارا (متن ' ص ۴۸)

(۴) چنان کو ز آهن شمشیر شاهي
ز دود از روی هندستان سیاهي (متن ' ص ۴۸)

(۵) از آن پس سبل جیحون را نه شد زور
که بپاید ز هندستان یکی مور (متن ' ص ۹۲)

(۶) کنون از فتح هندستان دهم شرح
کنم دیباچهٔ گرشاسپ را طرح (متن ' ص ۹۳)

(۷) قرنفل هم ز هندستانست وردي
که از نام عرب شد شهر گردي (متن ' ص ۱۳۲)

(۷) سه گونه رنگ هندستان زمین است
سیاه و سبز و گندم‌گون همین است (متن ' ص ۱۳۴)

(۹) بچشمی قلب ترکستان دریده
بسوئي ملک هندستان خریده * (متن ' ص ۲۲۲)

---

* صرف اِس جگه کاتب نے '' هندوستان '' واو کے ساتهه لکهه دیا هے جو درست نہیں -

۴ ـ اشرف مازندرانی کہتا ہے :—

داد از رانیان هندستان

....ن هندستان ("چراغ هدایت")

۵ ـ میر عبدالجلیل بلگرامی نے نواب امین الدولہ کے بھتیجے ارشاد خاں کی شادی پر ایک مثنوی کہی تھی جس کے چند شعر "خزانۂ عامرہ" میں نقل ہوئے ہیں ـ اُن میں سے ایک شعر یہ ہے :—

چو داماد آن عروس شرمگین دید

بہندستان نگارستان چنین دید ("خزانۂ عامرہ" ص ۴۰۰)

۶ ـ میر غلام علی آزاد بلگرامی کا شعر ہے :—

خطِ مشکین خالِ رخسار ترا بر سر رسید

فوج هندستان† بہ تسخیر ملکِ عنبر رسید (ایضاً ص ۱۲۲)

۷ ـ آنند رام مخلص بھی بڑے پائے کے شاعر تھے، کہتے ہیں :—

بر دلِ ما تیرہ روزان زان صفت مژگان گذشت

آنچہ از فوج دکن بر ملک هندستان گذشت (ایضاً ص ۴۲۱)

"هندوستانی" اور "هندستانی" شعر میں دونوں بہت کم دکھائی دیتے ہیں؟ اس لیے کہ "هندی"، "هندوی"، "هندوانی" "مہند" زیادہ آسانی سے شعر میں کھپتے ہیں اور "هندوانی" اور "مہند" ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں، "هندوستانی" اور "هندستانی" کی نوبت کم آتی ہے ـ شواهد کی چنداں ضرورت بھی نہیں، "هندستان" کے شواهد کافی تعداد میں دیے جا چکے

---

† کتاب میں اس جگہ غلطی سے "هندوستان" چھپا ہے جو بحر میں تنافر ڈالتا ہے ـ

هیں اُسي کي طرف جس چیز یا شخص کو منسوب کرتے ہیں اُسے
" ہندستاني " کہتے ہیں -

اِس تفصیل و توضیح کے بعد " ہندستان " اور " ہندستاني " کے
صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا' لیکن سچ یہ ہے کہ شبہے اور
اعتراض کو بڑي گنجائش ہے - ممکن ہے کے کسي کو یہ شبہہ ہو کہ واو کا
حذف شعر کے لیے مخصوص ہوگا - اِس لیے بہتر ہے کہ دفع دخل کر دیا
جائے - اہل لغت نے " ہندستان " کو " مخفف " لکھا ہے اِس کے
معنی یہہ ہیں کہ تخفیف کا عمل زبان نے کیا ہے ' محض شعر
نے نہیں - اگر واو کا لکھنا لازم ہوتا تو لغت نویس اِس امر سے ضرور
ہوشیار کر دیتے ' جیسے تو انگر کے الف کے متعلق صاحب " بہار " عجم
کہتے ہیں :--

" توانگر و در رسم خط بدون الف نوشتن خطاست و خواندن
روا " - بہار عجم - " توانگر " کے تحت میں) -

اِس سے معلوم ہوا کہ جب ایک لفظ کو دوسرے کا مخفف لکھتے
ہیں تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تلفظ اور تحریر دونوں کے لحاظ
سے لفظ کي دو صورتیں ہیں اور دونوں طرح سے بولنا اور لکھنا جائز ہے '
نظم و نثر کي قید اِس میں نہیں - دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہوتا
تو شعرا کے کلام سے سند لانا ہي غلط ہوتا -

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ' واو کے لکھنے یا حذف کرنے کے
متعلق خصوصاً کاتبوں میں بڑا اختلاف ہے - جن لفظوں میں غلطي
سے بھي کاتبوں نے واو لکھنا شروع کر دیا اُنہیں باوجود اہل لغت
کي تنبیہہ کے لوگ واو کے ساتھہ لکھتے رہے - چنانچہ کم کاتب ایسے
ملیں گے جو " خرد " " خرّم " " برخاست " وغیرہ کو " خورد "
" خورم " " برخواست " وغیرہ لکھنے پر مصر نہ ہوں - ایک بڑي

حد تک کاتب هي اِس کے ذمہ دار هیں کہ نثر میں " هندستان "
لکھا هوا بہت کم دکھائي دیتا هے ، ورنہ بولنے ایرانیوں کو بھي
" هندستان " سنا هے اور " هندستانیوں " کو بھي برابر سنتے هیں -

حمد اللہ مستوفي قزویني نے سنہ ۷۳۰ هجري میں " تاریخ گزیدہ "
لکھي جس کا ایک نہایت اچھا اور صحیح نسخہ سنہ ۸۵۷ هجري
میں لکھا گیا - یہ نسخہ خوش خط نسخ میں هے ، بڑي احتیاط
سے لکھا گیا هے اور کاتب نے صحیح اعراب بھي لگا دیے هیں -
پروفیسر براؤن نے اِس نسخے کي عکسي نقل سنہ ۱۹۱۰ ع میں لائیڈن
سے شایع کي جو آساني سے دستیاب هو سکتي هے - کل کتاب میں
بارہ جگہ " هندستان " یا " هندوستان " آیا هے جس میں سے چار
جگہ " هندستان " بغیر واو کے لکھا هے (ص ۲۲ ، ۱۱۹ ، ۳۹۷ اور
۴۹۹) اور باقي آٹھ جگہ " هندوستان " اور یہ سب نثر هی میں
هے - اِس سے سوا اِس کے اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا هے کہ اِس کتاب
کے محتاط لکھنے والے کے نزدیک بھي دونوں رسم خط یکساں تھے -

یہ تو هوئیں فارسي کي باتیں - اُردو میں هم روز بلکہ هر
وقت " هندستان " اور " هندستاني " سنتے هیں اور عام تحریری
شکل کي وجہ سے " هندوستان " اور " هندوستاني " بھي ; لیکن اگر
کسي نے لکھنے میں زبان کا لحاظ کر کے واو کو ترک کر دیا تو اُس
کي تکفیر کا فتویٰ اردو زبان اور ادب کے " امانت داروں " کي
مُہر اور دستخط سے فوراً جاري هو گیا - اِن ادبي " مفتیوں " کو
اِس کي خبر نہیں کہ موجودہ اردو ادب کے بانیوں اور زبان کے
محققوں میں بھي ایسے لوگ ملتے هیں جنھوں نے زیر بحث لفظوں
کو التزاماً بغیر واو کے لکھا هے - مولانا سید محمد حسین آزاد مرحوم
کي کتاب " سخندان فارس " بہتوں نے پڑھي هوگي - یہ فارسي زبان

اور ادب پر اُن کے لکچروں کا مجموعہ ہے - کتاب کا پہلا حصہ اِن لکچروں کا مقدمہ ہے؛ جس میں فارسي زبان کي تاريخ سے بحث کي ھے؛ دوسرے حصے میں گیارہ لکچر ھیں - دوسرے لکچر کے عنوان پر "۱۵ فروري ۱۸۷۲ ع" درج ہے اور یہي تاریخ تیسرے لکچر پر بھي ھے - چوتھے لکچر کے عنوان پر "یکم مارچ ۱۸۷۲ ع" لکھا ھے - اور کسي لکچر پر کوئي تاریخ درج نہیں - اِن تاریخوں سے معلوم ھوتا ہے کہ اِن لکچروں کا سلسلہ سنہ ۱۸۷۲ ع میں یا شاید اُس سے کچھہ پہلے شروع ھوا اور کئي برس جاري رھا - جیسا کہ کتاب کي تمہید* سے معلوم ھوتا ھے - ایران کے سفر سے واپس آکر مصنف نے لکچروں پر نظر ثاني کي اور سنہ ۱۸۸۷ ع میں کتاب چھپنے کے لیے تیار ھوگئي - مگر کتاب کے پہلے حصے کے شایع ھونے کی نوبت سنہ ۱۸۹۸ ع میں آئی - اِس اشاعت کا اھتمام آزاد مرحوم کے شاگرد مولوي سید ممتاز علي صاحب مالک مطبع رفاہ عام؛ لاھور نے اپنے "دارالاشاعت" سے کیا - دوسرا حصہ الگ نہیں شایع ھوا بلکہ پوري کتاب ایک ھي جلد میں منشی گلاب سنگھہ کے مطبع مفید عام؛ لاھور میں چھپ کر سنہ ۱۹۰۷ ع میں شایع ھوئي - مصنف اُس وقت حیات تھے - اِس مکمل کتاب کی لوح ایک ھي ہے مگر ھر حصے کے صفحوں کا شمار الگ الگ ھے - پہلے حصے کے ۱۰۶ صفحوں میں جہاں "ھندوستان" یا "ھندوستانی" کا لفظ آیا ھے واو کے ساتھہ ھے - دوسرے حصے کے دوسرے صفحے پر بھی (جو مضمون کے اعتبار سے پہلا صفحہ ھے) - پہلي ھی سطر میں "ھندوستان" کا لفظ آیا ھے وہ بھي واو کے ساتھہ ھے - لیکن اُس کے بعد سے

---

* تمہید کی تاریخ ۵ اگست سنہ ۱۸۸۷ ع ھے - (دیکھو حصہ اول صفحہ ۱)

"ہندستان" اور "ہندستانی" بغیر واو کے ہے، سوا صفحہ ۸۵ کے جہاں پھر "ہندوستان" ہے، اُس کے بعد پوری کتاب میں بغیر واو کے۔ صفحہ ۲ پر "ہندوستان" کے ہونے کا سبب غالباً یہ ہے کہ کاتب پہلے حصے میں جس طرح لکھتا چلا آتا تھا قلم سے اُسی طرح نکل گیا۔ صفحہ ۸۵ پر ظاہرا محض سہو قلم واو کا ذمہ دار تھا۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ جس اصل قلمی نسخے سے کاتب نے لکھا اُسی میں اِن دونوں جگہوں میں زیر بحث لفظوں کا املا واو کے ساتھ ہو۔ اِس صورت میں ممکن ہے کہ مصنف ہی کا سہو قلم ہو۔

اِن دو موقعوں کے سوا دوسرے حصے کی حالت یہ ہے کہ اُس کے ۳۱۵ صفحوں میں خود مصنف کی عبارت میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے "ہندستان" یا "ہندستانی" (بغیر واو کے) لکھا ہوا ہے۔ البتہ جہاں کہیں کسی دوسرے مصنف کی کوئی عبارت نقل کی گئی ہے اور اُس میں "ہندوستان" آ گیا ہے وہ التزاماً واو کے ساتھ نقل کیا گیا ہے*۔ شمار کیا تو چوالیس (۴۴) جگہ "ہندستان" اور پانچ جگہ "ہندستانی" ملا۔ یہ بات بھی خاص توجہ کے قابل ہے کہ من جملہ چوالیس کے چار جگہ فقرے کا پہلا لفظ "ہندستان" ہے اور جلی قلم سے بغیر واو کے لکھا ہوا

---

* صفحہ ۷۴ پر جو عبارت "توزک تیموری" سے نقل کی ہے اُس کی پہلی نو سطروں میں چار جگہ "ہندوستان" آیا ہے۔ صفحہ ۷۶ پر شرف الدین علی یزدی کے "ظفرنامۂ تیموری" کی عبارت کا نمونہ دیا ہے جس میں دو بار "ہندوستان" آیا ہے۔ اِن تمام اقتباسوں میں واو کو حذف نہیں کیا ہے۔ صفحہ ۲۹۴ پر فرخی کا یہ شعر نقل ہوا ہے جس میں بحر کی وجہ سے واو ضروری تھا:—

"ہندوستان آنچہ تو پار کردی – بر اہل سلاسل نہ کرد است حیدر"

یہ خاص اہتمام محض کاتب کی راے پر مبنی نہیں ہو سکتا۔

هے (ص ۷۱ ' ۸۱ ' ۹۳ ' ۹۵) - آگے چل کر صفحہ ۲۳۸ پر دسواں لکچر شروع ہوتا ہے - اور لکچروں کی طرح اِس لکچر کی سرخي بهي بہت هي جلي قلم سے لکھي هوئي هے - وہ سرخي یہ هے :—

"فارسي پر هندوستان میں آکر کیا کیا رنگ چڑھے -"

کتاب کا یہہ رنگ دیکھہ کر یقین هو گیا کہ دوسرے حصے میں واو التزاماً حذف کیا گیا هے مگر یہ سمجھہ میں نہ آیا کہ پہلے حصے میں یہ التزام کیوں نہیں کیا گیا - معاً خیال اِس طرف گیا کہ اکیلا پہلا حصہ ایک بار پہلے بھی چھپا تھا - چنانچہ "دارالاشاعت" والا نسخہ دیکھا تو اُس میں هر جگہ واو پایا - یہي احتمال هوا کہ دوسري اشاعت کے لیے جب کتابت هوئي تو پہلا حصہ کاتب نے "دارالاشاعت" والے نسخے سے نقل کیا اور دوسرا حصہ غالباً مصنف کے مسودے سے - اب قطعي شہادت کي ضرورت هوئي -

دوسري اشاعت کي لوح اور خاتمے پر کاتب کا نام تھا جس سے معلوم هوا کہ پوری کتابت کی کتابت منشی محمد اسد اللہ صاحب آسیونی نے فرمائي هے ' جو لاهور کے نامور خوش نویس هیں - مخدومي مولانا خلیل الرحمان صاحب نے مجھہ پر کرم فرما کر منشي صاحب ممدوح کو لکھا کہ دوسرے حصے میں "هندستان" اور "هندستاني" (بلا واو) اُنھوں نے محض اپنی رائے سے لکھا یا کسي نے اُن کو هدایت کي تھي کہ یوں لکھا جائے - اِس استفسار کے جواب میں جو خط منشي محمد اسداللہ صاحب نے مولانا خلیل الرحمن صاحب کو لکھا * اُس کے وہ حصے جو اِس بحث سے متعلق هیں یہ هیں :—

---

* یہ خط منشي صاحب کے هاتھہ کا لکھا هوا هے جو اُنھوں نے لاهور میں ۲۷ مئي سنہ ۱۹۳۱ ع کو تحریر کیا -

"سخندان فارس" آزاد صاحب کي زندگي ميں لکھا۔ اُنھوں نے کوئی ھدایت نہیں کي۔ صرف لکچر کے مرکز * کي بابت کہا کہ اِس طرح (لکچر) لکھو، یا جب کاپی دیکھی ھاتھہ اُٹھا کر دعا دي § اور بس۔ مضمون آزاد صاحب کے ھاتھہ کا لکھا ھوا تھا' اور بہت صاف اور خوشخط تھا' جگہ جگہ چیپیاں لگي ھوئي تھیں۔ آغا صاحب † نے کوئي ھدایت نہیں کي تھي اور نہ عبارت میں کوئي تصرف کیا' بالکل اصل کے مطابق رکھا' نہ میں نے کسي طرح کا رد و بدل کیا آزاد صاحب نے اکثر جگہ سیلے' دفیلے وغیرہ کو (سیلہ' دفیلہ) لکھا۔ اُسي طرح میں نے لکھا۔ ابتدا میں سخندان فارس' حصہ اول میر صاحب ‡ نے چھپایا اُس کے بعد آغا صاحب نے دونوں حصے یکجا چھپائے۔ میری عادت ھے کہ جس طرح کا مضمون ھو اُسي طرح لکھنے کي کوشش کرتا ھوں۔ صحت کي حالت میں ع مصنف جس طرف چاھے اور جو مناسب سمجھے بدلوائے' بدلا دیتا ھوں۔

---

* یہ ھدایت ظاھرا صرف پہلے لکچر کي سرخي کے متعلق تھي جس میں لکچر کے لفظ کے کاف کا مرکز سیدھا نہیں ھے' لیبل دار ھے۔ واقعي سیدھا مرکز اِس جگہ پر بد نما ھوتا۔ (دیکھو حصہ ۲' صفحہ ۲)۔

† آغا صاحب سے مراد ھیں آزاد مرحوم کے بیٹے آغا ابراھیم صاحب۔

‡ میر صاحب یعني سید ممتاز علی صاحب مالک دارالاشاعت لاھور۔

§ یعنی کاپیوں کي تصحیح کے وقت۔

حصۂ اول میں نے چھپے ہوئے سے نقل کیا ؟ جو میر صاحب نے
ا_پایا اور محبوب عالم کاتب مرحوم نے لکھا تھا - اور دوسرا
حصہ اصل مضمون سے نقل کیا اور جس طرح کا مضمون
میرے سامنے تھا اُسي طرح میں نے لکھا......یہ نہیں
ہو سکتا کہ اگر میں نے پہلے حصے میں بڑھایا تو دوسرے
حصے میں کیوں نہ لکھا - یہي خیال آتا ہے د جس
طرح مضمون میں تھا اُسي طرح میں نے لکھا - نہ
اِس کی کوئی ہدایت تھی نہ میں نے ار خود لکھا '
جیسا تھا ویسا لکھہ دیا - "

کاتب کتاب کي اِس تحریر کے بعد اِس میں شک کی گنجائش نہیں کہ آزاد مرحوم نے " ہندستان " اور " ہندستاني " التزاماً بغیر واو کے لکھا اور وہ اِنہیں صورتوں کو فصیح جانتے تھے - اِس قبیل کے اور لفظوں کی بھي وہي صورتیں آزاد مرحوم نے پسند کي ہیں جو عام طور پر اردو کی بول چال میں رائج ہیں چنانچہ " ہشیار " اور " ہشیاري " کو بھی بغیر واو کے لکھا ہے :-

(۱) " کیونکہ وہ [بادشاہ] پاسبان ہے - پاسبان کو ہشیار رہنا چاہیے - " (ص ۲۵ - ۱۲۴) -

(۲) " لشکر دار کے حکم سے افسر تین دفعہ آ کر دیکھہ جاتا تھا کہ پہرہ پر ہشیار ہیں یا نہیں - " (ص ۱۲۶)

(۳) " درندے جانوروں کو سامنے گھیرر لاتے - اور ایسي ہشیاري سے روکتے کہ ایک جانور بھي نکلنے نہ پاتا - " (ص ۱۲۸) -

اِن کے سوا اور بھي بہت سے لفظ اِس کتاب میں اُسی صورت میں پائے جاتے ہیں جس طرح اردو کي بول چال میں سنائي دیتے ہیں -

انگریزي دانی کے اثر سے اب اکثر لوگ "نمبر" بولتے اور لکھتے ھیں لیکن حضرت آزاد علیہ‌الرحمۃ نے اپني پراني زبان کو بگڑنے نہیں دیا - فرماتے ھیں :--

"رفتہ رفتہ ریش سفید چودھري یا لمبردار یا سردار قبیلہ کو کہنے لگے" - (ص ۱۲۹) -

فارسي جاننے والے اصرار کرتے ھیں کہ "خربزہ" اور "تربز" لکھو مگر فارسي کے اِس محقق کا قلم اردو تحریر میں یوں گُہر ریز ھوتا ھے :--

"حجروں میں انگور، خربوزے، تربوز لٹکاتے ھیں کہ قندیلیں قمقمے نظر آتے ھیں" - (صفحہ ۱۸۵) -

"عزیزان وطن ! جب تک ممالک سرد سیر میں رہ کر موسموں کي حالتیں آنکھوں سے نہ دیکھي ھوں اکثر کتابوں کے خاص خاص مقاموں کا مزا نہیں آتا -" (ص ۱۸۷)

یہ عمل ھے اُن بزرگوں کا جو جانتے تھے کہ اردو کیا ھے اور زبان کسے کہتے ھیں -

* انتقاد

(نتیجۂ فکر جناب جوش ملیح آبادی)

یہ نظم نا تمام و نا مکمل حالت میں مدت ہوئی طبع ہوچکی ہے لیکن اب مکمل و مربوط کر کے آپ کی خدمت میں روانہ کی گئی ہے -- "جوش"

رحم اے نقادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو!
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو؟
شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیسا قتل عام؟
برشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام!
کیوں اٹھا ہے جنس شاعر کے پرکھنے کے لیے؟
کیا شمیم سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لیے؟
آہ اے ناداں! تجھے آتا نہیں یہ بھی خیال
ننگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال
منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دل پذیر!
کاش اس نکتے کو سمجھے تیری طبع حرف گیر
لب کو بہر انتقاد اک لَے سے کھلنا چاہئے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیے!
شعر فہمی کے لیے ہیں جو شرائط بےخبر!
سوچ تو پورا اُترتا بھی ہے اُس معیار پر؟
جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا نونے داغ
آنچ سے جس کی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ؟

---

* جناب جوش ملیح آبادی نے یہ نظم ادبی کانفرنس کے لیے مرحمت فرمائی تھی --

دل سے اپنے پوچھ او زندانئے علمِ کتاب
حسنِ مطلق کو بھی دیکھا ہے بر افگندہ نقاب ؟
تو پتا اسرارِ ہستی کا لگاتا ہے کبھی ؟
عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی ؟
کیا وہاں بھی اُڑ کے پہونچا ہے کبھی اے نکتہ چیں
جس فضا میں کانپتا ہے شہپرِ روح الامیں ؟
خامشی کی نغمہ ریزی بزمِ بھی سر دھنتا ہے تو ؟
قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو ؟
اُن بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب ؟
خاک کو جن کے تبسم نے بنایا ہے گُلاب
طورِ معنی پر بھی او نا فہم چڑھ سکتا ہے تو ؟
کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو
یہ نہیں ، تو پھیر لے آنکھیں ، یہ جلوہ اور ہے
تیری دنیا اور ہے ، شاعر کی دنیا اور ہے
شعر کی تحلیل سے پہلے مری تقریر سُن
خود زبانِ شاعری سے شعر کی تفسیر سُن :-
دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنہیں شاعر کی ترکیبِ ادب
ڈھل کے پھر وہ گوہرِ غلطاں کا پاتی ہے لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخش تاجِ زر فشاں ،
پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں
جن کے اسرارِ درخشاں روح کی منزل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ ، موتی دل میں ہیں !

شاعری کا خانساں ہے نطق کا لوٹا ہوا
اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دل سر شار پر
ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر
رہتے ہیں بیدار دل کی محفلِ خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں
جن کے جاں پرور اثر سے دل ہیں سب پکڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے
شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال
سانس کی گرمی سے پڑ جاتا ہے اس شیشے میں بال
نُطق سے خدمت ہو کیونکر سرّ موجودات کی؟
خامشی تفسیر ہے باریک محسوسات کی
اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تونے "کائنات"!
شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ نا تمام
مشتبہ سا اک اشارہ، ایک مبہم سا کلام!
نشّے میں اک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لب گفتار کی!
بے حقیقت نَے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارضِ محدود پر سایہ سا لا محدود کا!
ظُلمتِ اجمال میں تنویر تفصیلات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرّات کی!
جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹتا رنگیں ستارے کا اندھیری رات میں!

شعر کیا؟ کچھ "سوچنا" دل میں بہ لحنِ دل نشیں
شعر کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا "یقیں"!
شعر کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال
شعر کیا؟ عشق اور حکمت کا "مقامِ اتصال"!
شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گل پر، نیند میں، شبنم کے گرنے کی "صدا"!
تر زبانی اور خاموشی کی باہم "گفتگو"
لفظ و معنیٰ میں توازن کی مسلسل "آرزو"!
نہر میں حسن قمر کی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکنا قطرے کے روزن سے عروس بحر کا!
مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں، یہ مسئلہ نازک ہے، آ سکتا نہیں
تو سمجھتا ہے جو کہنا چاہیے تھا، کہہ گیا
پوچھ یہ شاعر سے وہ کیا کہہ سکا، کیا رہ گیا؟
کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں، اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں!

تبصرے

نورالغات کي خامياں

(از حضرت نیاز فتحپوری)

اکثر و بیشتر مجھه سے دریافت کیا جاتا ہے کہ اس وقت سب سے بہتر لغت اُردو زبان کا کون ہے اور میں ہمیشه اس کا جواب یہي دیتا ہوں کہ اگر "سب سے بہتر" کا مفہوم "کمتر غلط" ہے تو بیشک کوئي رائے دیجا سکتی ہے ، لیکن اگر اس سے مقصود کسي ایسے لغات کا معلوم کرنا ہے جو واقعي سند و استناد کي اضرورت کو پورا کر سکے ' تو میرے پاس اس کا کوئي جواب نہیں -

واقعه یہ ہے کہ اُردو زبان میں یہ اتني بڑي کمي ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے بھي شرم آتي ہے - تعلیم یافته و مہذّب ممالک میں لغت نام ہے ایک ایسی کتاب استناد کا جو اصطلاحي و لغوي نزاعات کا فیصلہ کرنے والی سمجھی جاتي ہے اور اس کا فیصلہ ، "لفظ آخرین" کی حیثیت رکھتا ہے - لیکن ہمارے یہاں لغت نام ہے ایک ایسے مجموعہ کا جس میں بغیر کسي تحقیق و کاوش کے مختلف کتابوں اور لغتوں سے بہت سے الفاظ و محاورات چن لیے جائیں اور یوں ہي بلا چھان بین کہے اُن میں نقل کر دیا جائے ' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اغلاط سے پُر ہوتا ہے اور سند ہونے کي حیثیت سے گرا ہوا - اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہاں اس اہم کام کی ذمہ داري صرف ایک شخص پر نہیں ہوتی ' بلکہ پوري جماعت اس کو مرتب کرتي ہے اور جب تک ایک ایک لفظ پر کافی غور نہیں کر لیتے اور اساتذۂ وقت سے استصواب کر کے باہم تبادلۂ خیالات و بحث و نقد کے بعد

پورا اطمینان حاصل نہیں کر لیتے اُس وقت تک اس کو درج نہیں نہیں کرتے - بر خلاف اس کے یہاں اس کام کو صرف ایک شخص انجام دیتا ھے اور وہ بھي اس قدر جلدي جلدي که دوسرے کو خبر کیا ' خود اپنے آپ سے بھي مشورہ کرنے کي مہلت نہیں ملتی -

اس وقت تک اُردو میں صرف ایک لغت امیراللغات ایسا تھا جس کي ترتیب کے لیے ایک سے زاید آدمی معین ھوئے تھے ' لیکن افسوس ھے که تکمیل سے قبل ھی وہ انجمن درھم برھم ھو گئي اور یہ اھم کام انجام کو نه پہونچ سکا -

فرھنگ آصفیہ کو اُردو لغتوں میں خاص شہرت و اھمیت حاصل ھے ، لیکن اول تو وہ اب دستیاب نہیں ھوتی اور دوسرے یہ که وہ بھي انفرادي سعي کا نتیجہ ھونے کي وجہ سے اسقام و اغلاط سے معرا نہیں ھے -

حال ھي میں مولوي نورالحسن صاحب نیر کاکوروي نے نوراللغات کے نام سے ایک اُردو لغت کئي جلدوں میں شایع کیا ھے اور اِس میں کلام نہیں که اُنھوں نے اپني عمر کے اُس حصه میں جب انسان مشکل ھي سے کسی کام کرنے کا اھل رہجاتا ھے اور ایسے زمانہ میں جب که قدر شناسی کے فقدان کي بھي عام شکایت کي جاتی ھے ؟ ایسا ضخیم و بسیط لغت تیار کر کے اپني قوت عمل اور احساس فرض کا پورا ثبوت دیا ھے ؟ لیکن جس وقت ھم اُس پر ایک قابل استناد لغت ھونے کي حیثیت سے نگاہ ڈالتے ھیں ؟ تو ھمیں افسوس ھوتا ھے که یہ بھي اُن تمام نقائص سے پاک نہیں ھے جو دوسرے لغتوں میں پائے جاتے ھیں -

ھمارا مقصود اِس مضمون سے یہ نہیں ھے که ھم مؤلف نوراللغات کي محنت کي اھمیت کو کم کریں اور نه ھم ایسا

کر سکتے ھیں ، کیوں کہ جتنا اور جیسا کام اُنھوں نے کیا ھے وہ یقیناً
ھر شخص کے بس کا نہ تھا اور دوسرے سے شاید اتنا بھی ممکن
نہ ھوتا لیکن جس حد تک صحیح تنقید کا تعلق ھے ، ھم یہ
کہنے پر مجبور ھیں کہ ابھی اِس میں بہت کچھ اصلاح کی
ضرورت ھے اور اگر کبھی دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت آئے
جس کی بظاھر کوئی اُمید نہیں تو اِن اغلاط کو تو ضرور رفع
کر دیا جائے جو بہت نمایاں طور پر اس میں نظر آتی ھیں -

نوراللغات میں مختلف قسم کی غلطیاں نظر آتی ھیں کہیں
دو سرے سے معنے ھی غلط دے گئے ھیں اور کہیں توجیہہ و تمثیل
نا درست ھے ، اِس کے ساتھہ تضاد بیان بھی پایا جاتا ھے اور تطویل
بیجا بھی - ھم نے سرسری طور پر صرف الف اور ب کی ردیف
نگاہ ڈالی ھے اور اُس سے اندازہ ھو سکتا ھے کہ پوری کتاب میں
کتنی غلطیاں ھوں گی اور کس کس قسم کی - پہلے ھم نوراللغات
کی عبارت جلی قلم سے نقل کرینگے اور اِس کے بعد خفی قلم
قوسین میں اپنا اعتراض پیش کرینگے -

آر — ایک نوک دار لوھا جو کوڑے میں لگاتے ھیں -

(آر ، باریک میخ کا نام ھے جو بیلوں کے ھانکنے کی لکڑی میں لگا
جاتی ھے - کوڑے میں کبھی آر نہیں لگائی جاتی - بعض لوگ یہ غ
کرتے ھیں کہ اِس لکڑی میں چمڑے کے دو تین تسمے بھی باندھہ دیـ
ھیں اور اِس کی صورت کوڑے کی سی ھو جاتی ھے) -

آر پار — اُس سوراخ کی نسبت کہتے ھیں جو ایک طرف
دوسری طرف ھو جائے - فصحا وار پار بولتے ھیں -

(فصحا کبھی وار پار نہیں بولتے بلکہ ھمیشہ آر پار ھی استعمال
ھیں ، چنانچہ خود صاحب نوراللغات نے لفظ بھمبا کی تشریح کرتے

آر پار کا لفظ استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو نوراللغات جلد ۱، صفحہ ۲۹۴ -)

بد وضع—ناموزوں - نامناسب -

(اُردو میں یہ لفظ اوباش کے معنے میں مستعمل ہوتا ہے - نہ کہ ناموزوں و نامناسب کے معنے میں - صاحب نوراللغات نے اس معنے میں اس کو فارسي کا لغت قرار دیا ہے ' حالانکہ یہ درست نہیں -)

بدن پھوٹ جانا—بدن میں زخم پڑ جانا (مثال) چاہے اپنی اونڈي ہو چاہے غیر کي ، آپ نے مارا کیوں اور پھر اس طرح کہ لہولہان ہوگئي ؟ سارا بدن پھوٹ گیا -

(مؤلف نے یہ مثال خود وضع کي ہے جو غلط ہے - بدن پھوٹنا اس وقت کہتے ہیں جب کسي کشتہ یا گرم دوا ، یا آتشک و جذام کي وجہ سے جسم میں دانے یا زخم نمودار ہو جائیں - محض ضرب کي وجہ سے جسم کا زخمي ہو جانا بدن پھوٹنا نہیں ہے -)

برج کبوتر—ایران میں بلند خانہ دار عمارت کبوتروں کے واسطے جنگل میں بناتے ہیں — کبوتر کي ڈھابلي -

(برج کبوتر کے معنے صحیح ہیں - لیکن ڈھابلي کہہ کر غلط کر دیا کیونکہ ڈھابلي لکڑی کی بنتی ہے اور بلند عمارت سے متعلق نہیں ہوتي - خود انھوں نے ڈھابلي کے معنے بتاتے ہوئے کبوتروں کے رہنے کا دربا بیان کیے ہیں ، حالانکہ دربا اور ڈھابلي دونوں بالکل جدا چیزیں ہیں -)

برفانی پہاڑ—وہ پہاڑ جو برف سے جمے رہتے ہیں -

(یوں کہنا چاہیے کہ وہ پہاڑ جن پر برف جمي رہتي ہے -)

بڑا گھر—معني نمبر ۵ پاخانہ -

(بڑا گھر کبھي پاخانہ کے معنے میں مستعمل نہیں ہوتا - جیل خانہ کے معنے میں البتہ عوام کي زبان پر ہے -)

بڑائي کرنا—معني نمبر ۲ خود ستائي کرنا -

(خود ستائي کے معنے صرف اس وقت پیدا هوں گے جب کوئي
اشارہ پنی ذات کی طرف هو - صرف بڑائي کرنا خود ستائی نہیں هے -

بڑھنا—پھیلنا ' اُگنا ، نمو هونا -

(اول و آخر معنے صحیح هیں - اُگنے کے معنے میں اس کا استعمال
نہیں هوتا سند میں داغ کا یہ شعر پیش کیا گیا هے:-

گھٹ کے یوں خواهش دل شام و سحر بڑھتي هے
جس طرح هو کے قلم شاخ شجر بڑھتی هے

حالانکہ اس شعر میں بھي بڑھنے کے معنے اُگنے کے نہیں هیں -)

بزرگوں کا ٹھیکرا—معني نمبر ۱ موروثي مکان -

(مکان کي تخصیص صحیح نہیں - هر مزرعہ یا مسکونہ جایدا
جو بزرگوں نے چھوڑي هو از راہ انکسار بزرگوں کا ٹھیکرا کہلاتي هے)

بطن الوادي—پہاڑ کا اندرونی حصہ -

(اول تو اُسے اُردو کے لغت میں درج کرنا کوئي معني نہیں رکھتا
دوسرے یہ کہ اس کے معنے بھی غلط بتائے - بطن الوادي اُس راستہ
کو کہتے هیں جو دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا هو -)

بغل—اُس کپڑے کو بھي کہتے هیں جو انگرکھے ' اچکن ' شیرواني
وغیرہ میں مونڈھے کے نیچے لگایا جاتا هے -

(شیروانی میں بغل یا چوبغلا نہیں لگایا جاتا) -

بکھاري— بخاري - کھتی ' اناج کا گودام -

(ان تینوں کا مفہوم علیحدہ علیحدہ هے ' کھتي ، زمین میں
کنواں سا کھود کر بنائی جاتي هے ، گودام وہ جگہ جہاں بہت سا غلہ
وغیرہ تجارت کے لیے رکھا جائے اور بکھاري وہ کوٹھری هے جو گھروں میں غلہ
رکھنے کے لیے مخصوص هوتي هے -)

بکھڑ — معنی نمبر ۳ مدان - نمبر ۴ احاطہ - نمبر ۵ گائے بھینس کے رہنے کا مکان -

(یہ لفظو جاٹوں اور گوجروں کی زبان کا ھے اور وہ لوگ اس کو بکوال یا باکھل کہتے ھیں چنانچہ مشہور شاعر دلمہر جو جاٹوں کی زبان کا ماھر ھے لکھتا ھے :—

مھاری باکھل میں آئیو دلسیر

تو کو حلوا کھواؤں گاجر کا

واقعہ یہ ھے کہ اس قسم کے جنتے لفظ پچھاں سے پورب کی طرف آئے ، ان میں اختلاف لہجہ کے وجہ سے عوام بجائے لام کے ر بولنے لگے جیسا سالے کو سارے ' اولاد کی جگہ اولار - باؤلے کے بجائے باورے - متوالے کی جگہ متوارے - اسی طرح باکھل یہاں باکھر ہوگیا اور بکھل ' بکھر بن گیا - اگر صحیح لفظ باکھل درج نہیں کیا گیا تھا - تو اسے باکھر لکھنا چاھیے تھا نہ کہ بکھر (بہ ضم ھا) جو بالکل غلط ھے - چنانچہ مصنف نے (باء مع الالف) میں باکھل - باکھر اور بکھر تینوں لفظ لکھے ھیں اور معنے مویشیوں کے بارے کے لکھے ھیں - یہاں تین معنے بیان کیے ھیں ' مکان ، احاطہ ، گائے بھینس کے رھنے کا مدان - معلوم نہیں اصل لفظ کے ساتھہ یہ تمام معنے کیوں نہیں لکھے اور غلط لفظ کے ساتھہ کیوں شامل کر دیے اصل یہ ھے کہ صحیح لفظ باکھل ھے اور معمولی قوموں کے رھنے کے مکان کو کہتے ھیں ، مویشیوں کے رھنے کا باڑا مجازی معنی ھیں -)

بستر سے پیٹھہ لگ جانا — صاحب فراش ھو جانا -

(ناسخ)—لگ گئی بیماری فرقت میں یہ بستر سے پیٹھہ

اُٹھہ چلوں بالفرض میں تو ساتھہ ھی بستر چلے

(صاحب فراش ھونا صحیح نہیں - ایک شخص صاحب فراش

اس وقت کہلاتا ہے جب وہ ضعف و ناتوانی یا اشتداد مرض کی وجہ سے اُٹھ بیٹھ نہ سکے - چنانچہ خود مؤلف نے صاحب فراش ہونے کے یہی معنی لکھے ہیں - بستر سے پیٹھ لگ جانا؟ یہ معنی رکھتا ہے کہ پڑے پڑے بیمار کی پیٹھ زخمی ہو جائے؟ چنانچہ ناسخ کا جو شعر سند میں پیش کیا گیا ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں اور دوسرے مصرعہ سے بالکل صاف طور پر نمایاں ہیں کیونکہ بستر کا ساتھ چلنا اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ پیٹھ کے زخم سے چپک جائے -)

بگولا—معنی نمبر ۲ غول بیابانی -

(غول بیابانی کے معنی میں بگولا کبھی استعمال نہیں کیا گیا -)

بل کرنا—معنی نمبر ۴ قربانی کرنا -

(یہ بھی غلط ہے - یہ لفظ اصل میں بلی ہے اور اسی سے بلی‌دان کرنا بہ معنی خیرات کرنا مستعمل ہے - لہذا بل کرنا اس معنی میں درست نہیں -)

بل گئی—قربان گئی -

(بل بل جانا محاورہ ہے - لہذا بل گئی درست نہیں -)

بلائے جان—معشوق کے صدقے -

(مومن)—مُوے نہ عشق میں جبتک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

(اُردو میں بلائے جان کوئی محاورہ نہیں جو معشوق کے صدقے ہونے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور نہ مومن نے اس معنی میں یہ لفظ لکھا - شعر کے دوسرے مصرعہ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جب تک دل ہلاکت جان کا باعث نہ ہوا بلائے جان ہی رہا - اس میں صدقے اور قربان سے کوئی واسطہ ہی نہیں - معلوم نہیں صاحب

نوراللغات نے یہ مفہوم کیونکر پیدا کیا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے اس کا عام محاورہ ہونا کیونکر ثابت ہو سکتا ہے جبکہ یہاں یادہ سے زیادہ صرف مجازی معنی میں یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے -)

بلبلانا—مشتاق ہونا ' خواہشمند ہونا -

(اس لفظ کے معنی صرف بیتاب ہونے ' بیقرار ہونے ' درد سے تڑپنے کے ہیں - اشتیاق و خواہش کا اس سے کوئی تعلق نہیں -)

بلّی—تھونی - سال کے درخت کی لانبی شاخ -

(بلی ' تھونی کو ہرگز نہیں کہتے - بلی نام ہے ایک لمبی نا تراشیدہ کڑی یا ڈھلی کا - بلکہ فی الاصل بلی وہ ہے جو لمبے درخت کو جڑ سے اوپر کی شاخ تک کاٹ کر ایک لکڑی کولے کی طور پر نکال لی جائے - یہ لکڑی پاڑ وغیرہ باندھنے کے کام آتی ہے یا چھپر کے سہارے کے لیے ستون پر رکھی جاتی ہے - اس میں سال کے درخت کی قید بھی عجیب بات ہے ' جامن وغیرہ کی بھی بلی ہوتی ہے - تھونی بالکل جدا چیز ہے جو ستون کے جگہ کام آتی ہے - چنانچہ خود مؤلف نے جہاں تھونی کے معنی بیان کیے ہیں وہاں بلّی کا نام تک نہیں لیا - رہا رشک کا یہ شعر —

ٹوٹ جائے گی یہ بلی کہکشاں کی خود بخود

دیکھ لینا ایک دن گردوں کا چھپر اڑ گیا

اس میں بھی بلی کے معنی تھونی کے نہیں ہیں بلکہ اس لکڑی کے ہیں جو چھپر کے سہارے کے لیے ستون کے اوپر رکھی جاتی ہے -)

بندری—بندر کی مادہ -

(بندر کی مادہ بندریا کہلاتی ہے - لکھنؤ دہلی میں ہر جگہ بندریا بولتے ہیں - بندری غلط ہے) -

بھربھریا — معنی نمبر ۱ جو فضول باتیں کرتا ہو، ضبط نہ کر سکتا ہو، صاف دل، پیٹ کا ہلکا - معنی نمبر ۳ گپی -

(معنی نمبر ۱ درست ہیں، لیکن معنی نمبر ۳ صحیح نہیں - بھربھریا اسے کہتے ہیں جو ضبط نہ کر سکے اور دل کی بات فوراً زبان پر لے آئے، گپی بالکل دوسری چیز ہے -)

بوئی — ایک قسم کی گھاس -

(گھاس کہنا غلط ہے، کیونکہ بوئی کی بڑی بڑی جھاڑیاں ہوتی ہیں -)

بوئیاں — چھوٹے سے سکڑے منہ کی جس میں اکثر روئی کی لوئی رکھتے ہیں -

(بوئیاں نون کے ساتھ غلط ہے - ہُرمُز دھوئی لکھتے ہیں :—

تجھ کو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار

ہیں بجا کرنے سمندِ طبع کو یاں بوئیے

حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کیوں کھوئی عمر

کاشکے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوئیے

ظاہر ہے کہ اگر صحیح لفظ بوئیاں ہوتا تو اس کی جمع بوئیے نہ آتی بلکہ بوئیاں آتی - بوئیا ایک خاص وضع کی ٹوکری ہے جو گیہوں کی بالی سے بنائی جاتی ہے اور اس میں چرخہ کاتنے والیاں روئی کے گالے وغیرہ رکھتی ہیں -)

بھاڑ — وہ چولھا جس میں بھربھونجے چنے بھونتے ہیں، نمبر ۲ بھٹی، نمبر ۳ تنور -

(تینوں معنی صحیح نہیں - کیونکہ بھاڑ نہ چولھا ہے، نہ بھٹی - نہ تنور، بلکہ وہ زمین میں سرنگ کی طرح بنایا جاتا ہے، بھٹی لوہار کی ہوتی ہے اور تنور نانبائی کا اور ان سب کی ساخت

علیحدہ علیحدہ ہے - علاوہ اس کے چلے بھونکنے کي تخصیص بھي عجیب ہے -)

بھپارا—جوش کی ہوئی دوا -

(ایسا کہنا چاهیے که جوش کي ہوئي دوا کي بھاپ -)

بہدانہ—صحیح بہي‌دانه ہے یعنی بہي کا بیج - ایک قسم کا چھوٹا توت - ایک قسم کا انار -

(مؤلف کا بہدانہ کي صحت میں بہي‌دانه کہنا غلط ہے کیونکه جس کو وہ بہی سمجھے ہیں وہ خود بہ ہے اور فارسی میں اسے بہہ کہتے ہیں اِس لیے یہ کہنا که صحیح بہی‌دانه ہے درست نہیں - توت اور انار کی کسي قسم کو بہدانہ کہنا دوسري بڑي غلطي ہے - کیونکه وہ توت یا انار جس میں دانه نه ہو اسے بیدانہ کہتے ہیں نہ کہ بہدانه -)

بھربھرانا—چہرہ تمتمانا -

(جب چہرہ پر ہلکے سے ورم کي کیفیت پیدا ہوتي ہے تو کہتے ہیں چہرہ بھربھرایا ہوا ہے - تمتمانے کا تعلق چہرہ کے سرخ ہونے سے ہے نہ کہ ورم و اماس سے -)

بھرتا کر دینا—جلا دینا -

(بالکل غلط معني ہیں - بھرتا کر دینا تقریباً وہي معني رکھتا ہے جو کچومر نکالدینے کے ہیں)

بھاڑسا بُھلنا—چٹ پٹ مارا جانا -

(بھاڑ سا بُھننا - کنایتاً موت کي گرم بازاری کو کہتے ہیں جو کسی وبائی مرض یا لڑائي کے وجہ سے پیدا ہو -)

بھٹ—معني نمبر ۳ بھٹی ۲ بھاڑ - مثال - بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان :—

(بھت کو بھتّي کا مخفف کہنا صحیح نہیں - بھت مخفف ہے بھات کا ـ

بھت ، بھتیاري ، بیسوا ، تینوں ذات کُذات

آنے کی آدر کریں جات نہ پوچھیں بات

علاوہ اس کے جو مثال دی ہے وہ بھي صحیح نہیں کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ بھت پڑے ... الخ - بھت پڑنے کے معني ضایع ہونے ، برباد ہونے کے ہیں)

بھائیں بھائیں کرنا—بچھڑے کي آواز -

(ممکن ہے نواح کا کوری میں بچھڑے کي آواز کو بھائیں بھائیں کہتے ہوں - لیکن بھائیں بھائیں کرنا عام طور پر اُس ویران مدان یا سنسان مقام کی نسبت استعمال ہوتا ہے جہاں غیر معمولي وحشت و ویراني ٹپکتي ہو -)

بے صرفہ—بہت زیادہ ، بے احتیاطی سے -

(رشک)---میں پیا کرتا ہوں یونہي بادۂ عشق علی

جس طرح بے صرفہ پیجاتا ہے دیوانہ شراب

(بے صرفہ کے معنے بیکار و بے سود کے ہیں اور رشک کے شعر میں بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ دیوانہ کو شراب کي حاجت نہیں اور اگر وہ شراب پیتا ہے تو اس کو بے صرفہ هي کہیں گے -)

مرزاغالب نے بھي بے صرفہ اس معنے میں استعمال کیا ہے :—

بے صرفہ هی گزرتي ہے هو گرچہ عمر خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

اب چند وہ محاورات و لغات ملاحظہ فرمائیں جو صرف مولف نوراللغات کی اُپج کہلائے جانے کے قابل ہیں اور جنھوں نے خواہ مخواہ

کتاب کو ضخیم بنانے کے لیے بغیر کسی حوالہ و سند کے داخل محاورات کرلیا ہے - مثلاً :—

آبلے بھرنا—چھالے میں مواد کا بھر جانا

(یہ کوئی محاورہ نہیں - نہ مفہوم صحیح ہے کیونکہ چھالا جب پڑتا ہے اس میں اسی وقت سے مواد بھرا ہوا ہوتا ہے -)

آس چھوٹنا—نااُمید ہونا - مایوس ہونا -

(آس چھوڑنا مسموع ہے ، آس چھوٹنا مسموع نہیں - اس کے بجائے آس ٹوٹنا بولتے ہیں -)

بدزبان—گالی گلوچ ، گستاخ ، سخت کلامی -

(مؤلف نے اس لفظ کو فارسی کہا ہے ، حالانکہ فارسی میں کہیں اس معنی میں مستعمل نہیں ہوا - بعض گنوار ضرور اسی طرح بولتے ہیں کہ دیکھو بد زبان منہہ سے نہ نکالنا ، لیکن اس معنے میں یہ بالکل اردو ہے فارسی سے اسے کیا واسطہ -)

برا دن کرنا—بری رات کرنا - تکلیف میں بسر کرنا -

(اِس معنی میں دن اور رات دونوں جمع کے ساتھہ ؛ اِسی طرح استعمال ہوتے ہیں - برے دن کٹے - بری راتیں کٹیں -)

بساھا—بکسر اول ؛ کتا جس کے بیس ناخن اور زھریلے دانت ھوتے ھیں -

(اصل لفظ بِسہاَ ھے - ممکن ہے یہ لفظ بس (بہ معنی زھر سے) بنا ھو یا بیس سے اِس شہرت کی بنا پر کہ جس کُتے کے بیس ناخن ھوتے ھیں وہ بہت زھریلا ھوتا ھے -)

بغل میں منھہ ڈالنا — سر نیچا کرنا خجالت ظاھر کرنا -

(بالکل غلط ھے - محاورہ گریباں میں منہہ ڈالنا اور بغلیں جھانکنا ھے -)

بکری کرے گھاس سے یاري تو چرلے کہاں جائے—مثل - جو شخص اپنا رزق دوستی کي وجہ سے چھوڑ دے تو وہ کس طرح بسر کرے -

(یہ محاورہ غلط ھے - صحیح یہ ھے - گھوڑا گھاس دانے سے یاري کرے تو کھائے کیا -)

بکري اپني جان سے گئی کھانے والے کو مزہ نہ آیا -

(اِس میں بجائے بکری کے مرغی ھونا چاھیے اور بجائے مزہ کے سواد -)

بھرا بھشتي - اندھا دوزخي -

(یہ مثل صرف اِس وجہ سے ھے کہ ب کی ردیف میں اضافہ ھو جائے اُلٹي لکھي - اصل یوں ھے اندھا دوزخي بھرا بھشتی اِسي طرح کي تقدیم و تاخیر اِس محاورہ میں کي گئي ھے - بھانمتي نے کنبہ جوڑا - کہیں کي اینٹ کہیں کا روڑا - دوسرا ٹکڑا پہلے ھونا چاھیے -)

آٹے کے ساتھہ گھن نہ پس جائے -

(محاورہ گیہوں کے ساتھہ گُھن پستا ھے -)

مؤلف نے لغات کو بڑھانے میں بھي بہت بے اعتدالي سے کام لیا ھے

مثلاً آپ کي دال یہاں نہ گلے گی -

(اصل محاورہ دال گلنا ھے - اِس میں لفظ آپ کا اضافہ کر کے خواہ مخواہ الف کي ردیف میں شامل کرنا کسي طرح مناسب نہ تھا - یا آجتک پڑے ھیلنگ ھگ رھے ھیں - اس میں آجتک کا اضافہ بالکل بے محل ھے - یا آخر آدمی نے کچا دودھہ پیا ھے -

اس میں بھي آخر کا اضافہ درست نہیں - یا بڑا کفر توڑ - محاورہ کفر توڑ ہے اس میں بڑا شامل کرنے کي کیا ضرورت تھی -)

اس طرح کے سیکڑوں محاورات ہیں جو بلا ضرورت کسي لفظ کے ساتھہ ملاکر کتاب میں شامل کر دئے گئے ہیں اور بیسوں حکایتیں درج کر کے انکا ایک ایک فقرہ لے لیا اور محاورات میں شامل کردیا ہے -

بہت سے ایسے محاورات بھي نظر آتے ہیں جن کي سند میں کوئی شعر کسی کا ملا اور اُسے بے تکلف درج کردیا در آنحالیکہ خود اُن اشعار میں وہ محاورات غلط استعمال کیے گئے ہیں اور اس سے قبل اس زمانہ میں ان پر اعتراض بھي ہوئے ہیں مثلاً آبرو اُڑجانا-آبرو گرہ میں باندھنا- آج کدھر سے خورشید نکلا - بخت چلا - خانہ خرابی برپا کرنا - بڑا بول پیش آنا- بغل کا گھونسہ - وغیرہ کہ یہ تمام محاورات غلط نظم کیے گئے اور اُن کو صحیح جان کر لغت میں داخل کردیا گیا -

لغت کے ابتدا میں متروکات کي جو بحث مؤلف نے چھیڑي ہے وہ بہت کچھہ محل نظر ہے - کیونکہ جو متروکات انھوں نے شمار کرائے ہیں اُن میں نصف سے زاید اب بھي مستعمل ہیں -

---

یہ مضمون صرف ایک سرسري نظر کا نتیجہ ہے اور وہ بھي ردیف الف و با کے متعلق ورنہ پوري کتاب کي اگر چھان بین کی جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو سکتی ہے -

---

منتخبات ہندی کلام - مرتبۂ ڈاکٹر جعفر حسین ' پی ' ایچ ' ڈی - ملنے کا پتہ - دی حیدرآباد بک ڈپو ' چادر گھاٹ ' حیدرآباد دکن - ڈیمائی اکٹیو سائز ' ۲۲۵ صفحات — مجلد قیمت فی جلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار - ۲ روپیہ ۱۲ آنہ حالی -

اُردو کے ادبی حلقوں میں ہندی شعر و ادب سے دلچسپی اور مذاق پیدا کرنے کی روز بروز زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس اعتبار سے ڈاکٹر جعفر حسین صاحب نے اپنی کتاب منتخبات ہندی کلام کے ذریعہ جو مخلصانہ کوشش کی ہے وہ صرف قابل ستایش ہی نہیں بلکہ قابل تشکّر بھی ہے -

شروع میں لائق مرتب نے ایک مقدمہ تقریباً ۲۵ صفحات کا سپرد قلم کیا ہے جس میں ہندی شاعری کی خصوصیات اور مسلم شعراء کی خدمات کا ذکر ہے - اس کے بعد ہندی شاعری کے منتخبات شروع ہوتے ہیں ، جو ہر طرح کے اخلاقی ، عاشقانہ اور فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہیں - چونکہ ہندی کے الفاظ کا صحیح تلفظ اُردو کے رسم‌الخط میں مشکل ہے اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی حروف میں بھی اُنہیں واضح کر دیا گیا ہے -

انتخاب اور ہندی اشعار کے ترجمے سے لایق مرتب کے حسن مذاق کا اندازہ ہوتا ہے ' البتہ اشعار کی تشریح میں بعض مقامات پر کچھہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ شعر کی اصلی اسپیرٹ کو بیپتسمہ دلا دیا گیا اور وہ بالکل مغربی سانچے میں ڈھل کر رہگئی ہے ' اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اشعار کے مطالب

میں موجودہ خیالات و مذاق کا رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے ' حالانکہ اعلیٰ شعر و ادب کے لیے ضرورت ہے کہ اس کا مطالعہ اس کی اصلی اسپرٹ میں کیا جائے - بہر صورت کتاب بہ حیثیت مجموعی دلچسپ ہے اور نہایت سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے ، امید ہے کہ اس کے ذریعہ اُردو کا حلقۂ شعر و ادب ہندی شعراء کے اعلیٰ تخیّلات و جذبات سے لطف اندوز و مستفید ہونے کی کوشش کریگا -

اُردو شہ پارے (جلد اول) — ۳۵۶ صفحات - مرتبہ ڈاکٹر سید محی‌الدین قادری زورؔ ایم ' اے - پی - ایچ - ڈی ' ملنے کا پتہ - مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی ' اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن - قیمت درج نہیں ہے -

ڈاکٹر سید محی‌الدین قادری زورؔ ملک کے ایک ذہین اور ہونہار نوجوان ہیں اور اپنے اندر فضل و کمال کے ساتھہ ' جوش عمل اور ولولۂ کار بھی رکھتے ہیں - اب سے قبل ان کی "روح تنقید" اور "اُردو اسالیب بیان" وغیرہ کتابیں ملک میں شائع ہوکر کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں -

زمانۂ قیام یورپ میں بھی ان کے ذوق عمل نے ان کو بیکار نہیں رہنے دیا چنانچہ ادبیات اردو کے اُس نایاب ذخیرے کی مدد سے ' جو لندن ' اڈنبرا یونیورسٹی اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں ہیں ' آپ نے "اردو شہ‌پارے" کے نام سے ایک کتاب تین جلدوں میں لکھنے کا قصد فرمایا ' زیر تبصرہ کتاب ان میں کی پہلی جلد ہے جو مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے -

اس جلد میں لائق مرتب نے صرف شاہکاروں اور شہ‌پاروں کے جمع کر دینے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اُن مصنفین کے تذکروں اور ان کے

عہد و ماحول کے ذکر پر ۱۷۰ صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے - ظاہر ہے کہ ولایت کے کتبخانوں سے مصنفین و شعراء کے کارناموں کو اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کرکے شائع کر دینا کوئی بہت بڑا کام نہ تھا مگر ان کے حالات کا جمع و تلاش کرنا پھر مختلف حالات و روایات کو غور و تحقیق کے ساتھہ رد و قبول کرنا بڑی محنت و لیاقت کا کام تھا -

اس مقدمہ کے چار باب ہیں - باب اول میں اردو کے متعلق ان ابتدائی کوششوں کا ذکر ہے جو شمالی ہند میں حضرت امیر خسرو اور خواجہ مسعود سلیمان وغیرہم سے ہوئیں (یہیں اس امر کی تحقیق بھی کر دی ہے کہ اردو زبان کی بنیاد خواجہ مسعود کے زمانہ میں پڑ چکی تھی جو حضرت امیر خسرو سے پہلے گزرے تھے) یا جو گجرات میں بہاءالدین باجن؟ خوب محمد اور کام دھنی کے ذریعہ رونما ہوئیں یا جو دکن میں حضرت گنج‌العلم اور خواجہ بندہ نواز کے ہاتھوں عمل میں آئیں - مگر اس کا مواد زیادہ نہ تھا لہذا یہ باب صرف ۱۱ صفحات میں ختم ہو گیا ہے -

باب دوم میں بیجا پور کے اُن اردو کارناموں کا ذکر ہے جو شاہ برہان جانم - آتشی - مقیمی - صنعتی - رستمی - ملک - امین - سیوا - اور مومن بیجاپوری و غیرہم کے رہین منت ہیں - یہ ذکر ہے سنہ ۱۴۹۰ع (۸۹۵ ھ) سے سنہ ۱۶۸۶ع (۱۰۹۷ھ) تک کا -

یہ بیان تفصیلی ہے اور ۵۴ صفحات میں ختم ہوا ہے - شاہ برہان جانم کا ذکر پہلے پہل رسالہ اردو میں نکلا تھا -

تیسرے باب میں گول کنڈہ کے اردو کے اُن کارناموں کا بیان ہے جو فیروز - محمود - وجہی - احمد - شوقی - خیالی - غواصی - قطبی - ابن نشاطی اور نوری وغیرہم کے باعث ظاہر ہوئے - یہ ذکر سنہ ۱۵۰۸ع

(۹۱۶ھ) سے سنہ ۱۶۸۷ع (۱۰۹۸ھ) کا ہے اور ۴۵ صفحات میں ختم ہوا ہے - چوتھے باب میں وہ شاعر مذکور ہیں جو سنہ ۱۰۹۸ھ سے سنہ ۱۱۵۰ھ تک مغلوں کی فتح دکن کے بعد عالم وجود میں آئے - تقریباً ۵۰ صفحات میں اس کا ذکر ہے - اِس میں شمالی ہند کے تین شعراء (افضل - جعفر - جعفر) کا بھی ذکر کیا ہے اس کے بعد ۱۹ دکھنی شعرا اور ۲ نثر نگاروں کا تذکرہ ہے جن میں بحری ' عشرتی اور ولی ' اورنگ‌آبادی معروف و آشنا ہیں -

غرض اس ۱۷۰ صفحات کے مبسوط مقدمہ کے بعد تقریباً ۱۵۰ صفحات میں کتاب یعنی منتخبات نظم و نثر اردو ہے جس میں نظم کا حصہ ۱۲۷ صفحات پر اور نثر ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے -

فاضل مرتب چونکہ مشرقی طرز تصنیف کے ساتھہ ساتھہ مغربی طریقۂ تصنیف سے بھی باخبر ہیں اس لیے انھوں نے اس میں متعدد امور کے اضافہ سے اپنی تصنیف کو مفید ؛ سہل المطالعہ اور زمانۂ حال کی تصانیف کے موافق بنا دیا ہے - مثلاً مقدمہ کے ہر باب کے شروع میں فہرست مضامین اور فہرست شعراء دیدی ہے اور ہر باب بلکہ ہر دور میں ایک ایک تمہید ہے جو اس باب یا دور کے حالات پر مجموعی راے ہے - فہرست شعراء و مصنفین کے سنہ اور تاریخیں بھی درج ہیں - پھر اصل کتاب یعنی انتخاب کلام سے قبل دو فہرستیں ہیں ایک بلحاظ مضامین دوسری بلحاظ مصنفین -

دوسری فہرست میں پھر سنین شعرا اور مختلف نسخوں کے مآخذ کا ذکر کردیا ہے مگر ان سب سے زیادہ مفید آخر کے ضمیمے ہیں جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہر مصنف کی دیگر تصانیف کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں اور مرتب نے اُن کے حالات کن مآخذ (یا مرتب ہی کے لفظوں میں کن "علیہمات") سے

حاصل کیے ہیں- اس قسم کی فہرستوں اور ضمیموں سے کام لینا یا ان کو مرتب کرنا، ممکن ہے، بعض لوگوں کي نگاہوں میں تضیع اوقات و صفحات ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے محنت اور وقت کی بچت ہوجاتي ہے اور مہذّب ملکوں میں تو بغیر ان امور کے کوئی تصنیف مقبول اور بلند پایہ ہو ہی نہیں سکتي-

سب سے آخیر میں ایک فرہنگ بھي شامل کردی گئي ہے جس میں قدیم مصنفین کے الفاظ و لغات کا، جو اب نامانوس اور متروک ہیں، شافی حل بھي حتی‌الوسع کیا گیا ہے-

پھر اسي کے ساتھہ، شعرا و سلاطین کي سات تصویریں اور وصلی و قطعات کي چار تصویریں بھي شامل کر کے کتاب کی زینت میں اضافہ کیا گیا ہے-

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے شاہ کاروں کا یہ مجموعہ، موسوم بہ "اردو شہ پارے" عرق ریزی اور محنت کا ایک بہترین نتیجہ، اور معلومات و تحقیقات جدیدہ کا ایک اچھا ذخیرہ ہے اور بجاے خود ایک شاہکار- لیکن ہم کو بعض مقامات کے طرز بیان پر اعتراض ہے- انھوں نے بعض لوگوں کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ مشرقی تہذیب اور اردو مذاق کے موافق، اُس سے حقارت یا سوء ادب مترشّح ہوتا ہے مثلاً انھوں نے امیر خسرو کا حال یوں لکھا ہے:-

"امیر خسرو البتہ اس عہد میں تھا......اور اُس مقام پر تھا...- (چند سطروں کے بعد) جس زبان میں وہ شعر گوئي کرتا تھا-"

ممکن ہے یہ عبارت، انگریزي کا ترجمہ ہو یعني ممکن ہے فاضل مرتب نے اپنی کتاب کے کچھہ اجزا پہلے انگریزی میں

لکھے ہوں پھر ان کا ترجمہ اردو میں کردیا ہو بہر صورت تحریر کا یہ آہنگ ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔

اِس کے علاوہ لفظوں اور محاوروں کی بعض غلطیاں بھی اس میں ملتی ہیں جو نہوتیں تو بہتر تھا۔ مثلاً صفحہ ۱۳ پر بہاؤالدین باجن کے ذکر میں لکھتے ہیں "وہ نہ تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہیں نہ ہی معتبر و موثق" یہ "نہ ہی" پنجاب کی پیداوار ہے اور غیر فصیح بلکہ غیر صحیح۔ صفحہ ۲ پر ہے "شہ پاروں کے مد نظر" مد نظر کا استعمال اس طرح غلط ہے۔ خود زور صاحب نے اس کا صحیح استعمال بھی ایک آدھ جگہ کیا ہے۔ یوں لکھنا چاہئے "شہ پاروں کے متعلق یا شہ پاروں کو مد نظر رکھتے ہوئے" صفحہ ۷ پر دونوں صاحبین" صاحب کا تثلیہ (اور جمع بھی) فاعلی حالت میں غیر فصیح ہے۔ ہاشمی اور ولی کے ذکر میں ہے "پرنویس تھا" پُرگو پر قیاس کر کے ان معنوں میں الفاظ گڑھنا مناسب نہیں۔ "اسی طرح سنہری دور" بھی غلط ہے سنہرا دور ہونا چاہیے۔ لیکن یہ تمام باتیں بہت ہی خفیف اور معمولی ہیں بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اس دور کی ایک بہترین پیداوار ہے اور ہم جناب زورؔ کو ان کے اس قابل قدر کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

روح جذبات—جناب اکبر حیدری کے کلام کے مجموعہ؛ طابع و ناشر عشرت رحمانی ایڈیٹر "نیرنگ" دہلی۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ۔

یہ کتاب جناب اکبر حیدری کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب اکبر حیدری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں آپ کا کلام

اکثر ملک کے ادبی رسائل میں نکلتا رهتا هے - آپ جدید طرز کی نظمیں بہت کامیابی کے ساتھه لکھتے هیں اور لطف یه هے که اجتہاد کے ذهن میں زبان و بیان کی شگفتگی هاتھه سے جانے نہیں دیتے - روح جذبات کی بیشتر نظمیں قابل تحسین و ستائش هیں کاغذ نفیس اور طباعت وکتابت دیدہ زیب هے -

مصباح التعرف لارباب التصوف—ملنے کا پته - قاضی انتظام علی خاں ، قاضی گڑهی - کاکوری ضلع لکھنؤ—قیمت ۲ روپیه -

شاہ علی حیدر ابن حافظ شاہ علی انور قلندر کاکوروی نے کمال محنت و جانفشانی سے شیخ عبدالکریم جیلی اور مولانا جامی وغیرہ کی تصانیف سے صوفیه کی اصطلاحات ردیف وار جمع کر کے ترتیب دی هیں ، اور ساتھه کے ساتھه اُن کی توضیح و تشریح بھی کردی هے ، یه کتاب شایقین علم تصوّف کے لیے نہایت کار آمد و مفید هے -

(ا)

اداریہ

ہندستانی اکیڈیمی کی دوسری ادبی کانفرنس امسال توقع سے زیادہ کامیاب رہی ؛ اس باب میں آنریبل جسٹس سر شاہ محمد سلیمان بالقابہ چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد کی سرگرمیاں و دلچسپیاں سزاوار ستائش بھی ہیں اور قابل مبارکباد بھی -

کانفرنس کی تاریخیں ۴ ، ۵ اور ۶ اپریل سنہ ۳۱ قرار پائی تھیں ملک کے سربرآوردہ حضرات کے لیے اتفاق سے یہ زمانہ سخت مصروفیتوں کا تھا ؛ اسی زمانے میں اکیڈیمی کے ادب نواز صدر ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ سیاسی مہمات میں مصروف تھے ؛ اسی طرح پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑہ ؛ سر عبدالقادر ؛ مولوی عبدالحق بی - اے ؛ خواجہ حسن نظامی ؛ ڈاکٹر ذاکر حسین ؛ ڈاکٹر محی الدین قادری وغیرہ بھی شدید مصروفیتوں کے باعث کانفرنس میں شرکت نہ فرماسکے ؛

جنرل سکریٹری ہندستانی اکیڈیمی نے ۴ تاریخ کے اجلاس میں ان تمام حضرات کے پیامات پڑہ کر سنائے ؛ جن میں اکیڈیمی اور اس کی ادبی کانفرنس کے مقاصد سے ہمدردی و دلچسپی اور اس کی کامیابی کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا - سر تیج بہادر سپرو کی عدم موجودگی کی باعث ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان بالقابہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑہ کر سنایا (جسے ناظرین نے ہندستانی کے اپریل نمبر کےساتھہ ملاحظہ فرمایا ہوگا) سکریٹری صاحب ہندستانی اکیڈیمی نے اکیڈیمی کی کارگزاریوں کی رپورٹ پڑہ کر سنادی پھر مسٹر میکنزی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات صوبۂ متحدہ نے ایک دلچسپ

انداز میں اکیڈیمی کے کاموں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا ، اور اس کو مفید و کارآمد بنا کر اس کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرمائی -

۵ - اپریل کو کانفرنس کے شعبۂ اردو کا پہلا اجلاس زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر ، میوزهال میں منعقد هوا - حاضرین کے سامنے ذیل کے مسایل پیش تھے -

(۱) علوم و فنون کی کس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کرانا مناسب ہوگا -

(۲) عورتوں اور بچوں کے لیے مفید مطالب پر کتابیں طیار کرانے کی کیا صورت اختیار کی جائے -

مذکورہ بالا مسایل پر کافی بحث و گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ مندرجۂ ذیل تجویزیں بطور سفارش اکیڈیمی کی کونسل میں پیش کیجائیں -

۱ - فی الحال موضوعات ذیل پر جو کتابیں غیر زبانوں میں هیں ان کا ترجمہ کرایا جائے :—

(الف) سوشیا لوجی -

(ب) فنون لطیفہ (نقاشی و مصوری وغیرہ) -

(ج) سائنس کی عام کتابیں -

۲ - اکیڈیمی کی جانب سے اس کا اعلان کیا جائے کہ ایک انعام اُن تصنیفات میں سب سے بہتر تصنیف پر دیا جائے گا جو خاص طور پر عورتوں کے لیے مفید هیں -

۳ - اکیڈیمی کی جانب سے اس کا بھی اعلان کیا جائے کہ اُس تصنیف پر جو بچوں کے لیے باعتبار زبان اور مضمون مفید هو

اور مقابلے کي کتابوں میں سب سے بہتر ہو ایک انعام دیا جائے گا -

اس کے بعد عالي جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفي نے ایک مبسوط مقالہ اردو لسانیات کے عنوان سے پڑھ کر سنایا جس کو حاضرین نے کمال شوق و مسرت سے سنا - جناب صدر نے اپني تقریر میں جناب کیفي کے مقالے کي بہت تعریف فرمائی ' اس کے بعد جنرل سکریٹری ہندستاني اکیڈیمي نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا -

اِس شعبہ کا دوسرا اِجلاس ۲ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع کو دو بجے زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر میوہال میں ہوا - عالي جناب مولانا سید سلیمان ندوي نے اپنا محققانہ مضمون محمد ہاشم برہانپوری کے دیوان مراثی کے متعلق پڑھ کر سنایا - پھر نواب صدر یار جنگ نے کلیات میر حسن - مثنویات اعظم‌الدولہ سرور اور مثنوي حکیم قدرت اللہ خاں قاسم دہلوي پر ایک عالمانہ مضمون پڑھ کر حاضرین کو محظوظ فرمایا - اُس کے بعد مسٹر بي - تي ورما صاحب پروفیسر فرگیوسن کالج پونا نے ایک دلچسپ مضمون ابراھیم عادل شاہ کے متعلق پڑھا -

اِن مضامین کے علاوہ چند اور مضامین بھی تھے جو وقت کي کمي کے باعث نہیں پڑھے جا سکے - چند ضروري مسائل جو ذیل میں درج کیے جاتے ھیں حاضرین کے سامنے پیش کیے گئے -

(۱) زبان کو عام فہم اور سلیس بنانے اور اُس کو غیر مانوس الفاظ وتراکیب سے پاک رکھنے کے لیے کیا وسائل اختیار کیے جائیں -

(۲) وضع اصطلاحات علمیہ کے لیے کیا اُصول اختیار کیے جائیں -

چونکہ اکیڈیمي کی کونسل نے ماھرین کي ایک کمیٹی مسئلہ

اول پر غور کرنے کے لیے پہلے هی بنا دی تهي جس کي رپورٹ وصول نهیں هوئی تهي اِس لیے یه مسئله خارج از بحث سمجها گیا - مسئله دوم کے متعلق کافي بحث و مباحثه کے بعد یه قرار پایا که ”کونسل سے اِس امر کي سفارش کی جائے که اُن اصطلاحی لفظوں کے علاوہ جو هندي اور اردو میں رائج هیں یا جو دونوں میں مشترک (رائج) هو سکیں سائنس کی اصطلاحوں کے لیے جدید الفاظ کي اختراع سے یه بہتر هوگا که وهی اصطلاحیں بجنسه اختیار کرلي جائیں یا ”مورد“ بنا لي جائیں جو دیگر ممالک میں رائج هوں“ -

چند تجویزیں اور پیش هوئي تهیں - مگر اب وقت تنگ هو گیا تها اِس لیے جناب صدر اور حاضرین کا شکریه ادا کر کے جلسه برخاست کیا گیا -

---

جیسا پہلے بهی عرض کیا گیا هے اکیڈیمي جن سالانه لکچروں کا اهتمام کرتي هے وہ بهي کانفرنس کے موقع پر دیے جاتے هیں - امسال ڈاکٹر عبدالستار صدیقي ، ایم - اے ، پي - ایچ - ڈي صدر شعبۂ عربي و فارسي الهآباد یونیورسٹي نے ”سامي لسانیات“ پر اپنا فاضلانه خطبه پڑھا تها - اردو زبان میں یه چیز اپني نوعیت کے اعتبار سے یقیناً نئي هے - یه خطبه اکیڈیمی کي جانب سے عنقریب کتابي صورت میں شائع هوگا ، اس وقت ناظرین اس کي اهمیت اور زبردست عالمانه تحقیق و تلاش کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں گے -

---

”هندستاني“ کے سرورق پر ”سه ماهي“ کا لفظ ایڈیٹوریل بورڈ کے اعزازی ممبروں نے تجویز کیا تها ، اس پر بعض بزرگوں کو

اختلاف هوا لیکن مخالفت کي حد تک نہیں مگر بعض نے اس پر اس شد و مد سے آواز بلند کی گویا وقت کا اهم ترین مسئلہ یہي تها -

ابتدا میں همارا خیال تها که لوگ وقتی اور مقامی مصالح کي اهمیت کا لحاظ کرینگے اور رسالے کے عام مضامین سے اس خفیف امر کی تلافي هو جائے گی ، چنانچه همارا یه خیال صحیح نکلا اکثر ارباب فہم خاموش بهي هو گئے ، مگر بعض حلقوں میں اب تک اسي زور شور سے طعن و تنقیص کا سلسلہ جاری هے اس پر همارے ادارے کے معزز ممبر ڈاکٹر عبدالستار صدیقي ایم' اے- پي-ایچ-ڈي آیندہ اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ مرحمت فرمائینگے ، لیکن هم بهي آج کي صحبت میں مختصراً کچھه عرض کر دینا ضروري سمجھتے هیں :—

"تماهی" پر اصولي اعتراض یه هے که هندي اور فارسی لفظ کو ملا کر اس قسم کا تصرف ناجائز یا ناموزوں هے - لیکن لغوي حیثیت سے اُن لفظوں کے بارے میں کیا ارشاد هوگا ؟ -

(۱) تِپائي

(۲) تِراها ، تِراهی :—

(منیر)—صدقے اُترتے سراسی چوراهے پر تمام
کیوں ایک راہ تیری تِراهي میں رہ گئي

(۳) تِسالا (تین برس کا) -

(۴) چوراها (جہاں هر چار طرف کو راستہ جاتا هو) -

(بحر)—گرا هے کوئي پُتلا اُس بت کافر کے صدقے کا
که چوراهے کو اکثر پوجتے هندو نکلتے هیں

(۵) چوگلا—گل چار برگہ - چار پلکھڑي کا پھول -

(بحر)—بہار عالمِ امکاں نہایت بے حقیقت ہے

عناصر کو سمجھہ اک چوگلا ہے باغ فاني کا

(۶) چوگوشیا -

(۷) چومنزلا—چار منزل کا مکان -

(۸) سہ رخا—سہ پہل -

کیا مذکورہ لفظوں کی ساخت و صورت بالکل "تماهي" کي نہیں ہے ؟

چھہ ماهي کے لیے بعض صاحبوں کو اصرار ہے کہ صرف مُردے کي چھہ ماهی ہوتی ہے ' سند میں غالب کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے :—

رسم ہے مُردے کي چھہ ماهي ایک

خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

لیکن اس شعر میں یہ ممانعت کہاں ہے کہ چھہ ماهي کو اُس کے اصلی معنوں میں نہ استعمال کیا جائے ؟ غالب ہی کا شعر اس کے بعد کا ملاحظہ فرمایئے :—

مجھکو دیکھو کہ ہوں بقید حیات

اور چھہ ماهي ہو سال میں دو بار

یہاں چھہ ماهی ذو معني ہے ' ایک مردے کي چھہ ماهي دوسري چھٹے مہینے تنخواہ دیے جانے کي رسم -

اس لیے یہ کہنا کہ چھہ ماهی صرف مُردے کی چھہ ماهي کو کہتے ہیں ' ہمارے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا - صاحب فرهنگ آصفیہ نے بھي شش ماهي کے معنے چھہ ماهي اور نصف سال کے دئے ہیں اور مردے کی چھہ ماهي کا خفیف سا بھي اشارہ نہیں کیا -

بہر صورت ہندي اور فارسي لفظوں کو ملا کر اُن پر تصرّف کرنے کا جہاں تک اصولي تعلق تھا اس کي مثالیں دیدي گئیں، لیکن یہ کہا جاسکتا ھے کہ اس پر قیاس کر کے کوئي نیا لفظ نہیں ڈھالا جا سکتا ؟ لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ھے کہ "تماھي" کوئی نیا لفظ نہیں ھے اور نہ اس زمانے کے لوگوں کے مخترعات میں ھے -

صاحب فرھنگ آصفیہ سہ بلدي کے معنوں میں سہ ماھہ اور تماھہ دیئے ھیں (جس سے مراد ھے) وہ قسط جو تیسرے مہینے ادا کي جائے -

لغوي حیثیت سے جہاں تک "تماھي" کے جواز و عدم جواز کي بحث تھي ؟ ختم ھوگئي مگر یہ کہا جاسکتا ھے کہ لغوي حیثیت سے کسي لفظ کے صحیح و جایز ھونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ انشا و ادب میں بھي اُسے ضرور جگہ دیجائے "تماھي" اصولي حیثیت سے صحیح ھو لیکن سہ ماھي کے ھوتے ھوئے اس کا استعمال ایک غیر ضروري اجتہاد تھا۔

لیکن صورت یہ پیش آئي کہ ھندستاني اکیڈیمي کے اُردو اور ھندي کے رسالوں کے لیے ایک ایسے نام کي تلاش ھوئي جو دونوں کے لیے یکساں کام دے سکے اور جس طرح ھندستاني اکیڈیمي کا اطلاق اُردو اور ھندي دونوں شعبوں پر یکساں طور پر ھوتا ھے اسی طرح خیال ھوا کہ رسالوں کا نام بھي ایسا ھونا چاھیے جس سے لفظي تفریق میں کمی ھو اور ھندي اور اُردو میں جو خلیج حائل ھے بڑھنے نہ پائے اس خیال کے زیر اثر اردو اور ھندي ایڈیٹوریل بورڈوں نے تماھي کے لفظ

کو رسالہ کے سر ورق کے لیے قبول کر لیا ان تمام حالات کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ "تماهي" کے متعلق کسی منصف مزاج شخص کو اعتراض کی گنجائش باقی رہ سکے ۔

UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI

عثمانیہ اکیڈیمی حیدرآباد دکن کے مقاصد

۱۔ اردو اور ہندی لٹریچر کی حفاظت اور ان کی ترقی و نشو و نما کی کوشش کرنا۔

(الف) — مختلف ملکوں کی مطبوعات میں سے منظور شدہ کتابوں پر انعام دینا۔

(ب) — معاوضہ وغیرہ کے ذریعہ غیر زبان کی کتابوں کے ترجمے کرانا اور ان کو شائع کرانا۔

(ج) — یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں وظائف دے کر یا دوسرے ذرائع سے ملکی اور اردو زبانوں میں تصنیف یا ترجمہ کے کاموں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

(د) — اکیڈیمی کے محسنوں کو اعزازی فیلو منتخب کرنا۔

(ہ) — ایک کتب خانہ قائم کرنا اور اس کا انتظام رکھنا۔

(و) — مشہور ارباب علم و فضل کو علمی مقالات کے لیے مدعو کرنا۔

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ

کی مطبوعات

۱ — ازمنہ وسطیٰ میں ہندستان کی معاشرتی اور اقتصادی
حالات – از علامہ عبداللہ بن یوسف علی – ایم ۔ اے – ایل ایل –
ایم ۔ سی بی ۔ ای – مجلد ۱ روپیہ ۴ آنہ –

۲ — ایضاً غیر مجلد ۱ روپیہ –

۳ — اردو سروے رپورٹ – از مولوی سید محمد فاضل علی صاحب
ایم ۔ اے — ۱ روپیہ –

۴ — مغلوں سے پہلے عرب اور ہندستان کے تعلقات – از مولانا سید
سلیمان صاحب ندوی — ۳ روپیہ –

۵ — ناتن (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمان صاحب
ایم ۔ اے – ایم ۔ آر – اے – ایس — ۲ روپیہ ۸ آنہ –

۶ — فریب عمل (ڈراما) مترجمہ بابو جگت موہن لال صاحب رواں —
۲ روپیہ –

۷ — کبیر صاحب – مصنفہ پنڈت منوہر لال زتشی — ۲ روپیہ –

زیر طبع کتابیں

۱ — قرون وسطیٰ کا ہندستانی تمدن – از رائے بہادر مہا مہوپادھیائے
پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا –

۲ — ہندی شاعری – از ڈاکٹر اعظم کریوی –

۳ — ترقی زراعت – از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب
ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت –

۴ — عالم حیوانی – از بابو برجیش بہادر صاحب بی اے – ایل ایل بی
ایڈوکیٹ –

باہتمام رام چندر پرساد ورما – کایستھ پاٹھ شالہ پریس – الہ آباد

UNIVE